

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# مقدمہ

علوم قرآن اور علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات

ذی  
محسن تقی عثمانی

استاذ حدیث دارالعلوم کراچی  
(فرزند حضرت مولانا محمد تقی عثمانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے عوام بچوں میں غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، اور جلد اول کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا، دوسرے ایڈیشن کی طلبات کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر عمل طور سے نظر ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا، اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اول کے شروع میں علم ستراں اور اصول تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہو سکیں، لیکن متواتر اصرار اور صنعت کی بناء پر موصوف کے لئے بذات خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیل حکم اور تحصیل سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہو گیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پوری کتاب کو معارف القرآن کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے اصرار پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر معارف القرآن کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے، یہ تلخیص معارف القرآن جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علی مباحث احقر کی اس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو انشاء اللہ عفریت مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگی، لہذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں وہ اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْہِ تَوَكَّلْتُ وَالِیْہِ اُنِیْبُ۔

احقر  
محمد تقی عثمانی  
۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

دارالعلوم کورنگی  
کراچی ۷۵

لے، المودثر یہ کتاب، علوم القرآن کے ۴۴ سے شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ یَهْدِیْ سَبِیْلَہُمْ عَلٰی عِبَادِہٖ الْاَلْوَنِ اَصْطَفٰہُ

## وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چنانکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا کہ اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

**وحی کی ضرورت** ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض مقرر کئے ہیں، اس کی خدمت میں لگا رہا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو علم کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیسا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے کاموں کو پسند اور کون کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ناممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، ہنہ اور ہاتھ پاؤں وغیرہ عقل اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص اثر کا ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں ان کا علم نری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم



نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا اُنھوں سے چُھو کر بہتر نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان لے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض چنانکہ جو اس غم سے کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں خواہش جواب دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہو اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے باہر میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے، اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہو نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے معتمد فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہو اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو وحی کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب ہتیا کر تا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی، اُبی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کس چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہوا، اور ان کے ادراک کے لئے بُری عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے دجوری کا قائل نہ ہو اس سے توحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے فائدہ ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کاظم پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے دجی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقت جو ذکر و سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور محکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ اس انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فراموشی ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلنے وقت سفر کا

مقصد بتا دے اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے ؟ اور سفر کے دوران اس کی ٹروٹی کیا ہوگی ؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوند قدس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے ؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا عجیب العقول نظام پیدا کیا ہو کہ اپنے بندوں تک پیغام رسائی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں ؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو انصاف سے نہیں جھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام فراز فرمایا ہے، لہذا رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ”وحی“ محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقل ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے۔

حضور پر نور ولیؑ کی طرف سے  
 دینی و رسالت کا یہ مقدمہ مسلسل ہرگز دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم  
 پر ختم ہو گیا، اب کسی انسان پر نہ دینی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت کہ  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے دینی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضور  
 عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ  
 پر دینی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہیں تو مجھے گھنٹی کی کسی آواز سنائی  
 دیتی ہے، اور دینی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ صحت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے  
 تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کہیں فرشتہ میرے سامنے ایک دروازے  
 میں آجاتا ہے۔ (صحیح بخاری ۲/۱۶۱)

اس حدیث میں آپ نے جو کئی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے خوشبہ دی ہے شیخ محی الدین ابن عربی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو دھج کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹی نہیں دھڑکے گھنٹی جب مسلسل جیتی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلام الہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سُنانی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح اور آک تو بغیر شاہد کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام فہموں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے (فیض الباری ۱/۱۹۰:۲)

جب اس طریقے سے آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے

دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے کانوں سے گنگنا، جھڑک، اور زخیر ہو کر کچھورک شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے پکپکاتے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے (الاتقان ۴۶/۱)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جا فوراً سر اٹھاتے تو سر اٹھاتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، کراسی حالت میں وحی نازل ہوئی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زید کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی (زاد المعاد ۱۹/۱)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیاں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی (توسیب مسند احمد کتاب السيرة النبوية ۲۰/۲۱۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لاتے ہیں، بہر کیف جب حضرت جبرئیل انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزول وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی (الاتقان ۳۶/۱)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کر کے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجنادین پر پہلے دو واقعات کو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنہ ۱۲ھ میں رونما ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری ۱۹/۱)

چوتھی صورت بلواسست اور بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے جھکلائی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (الاتقان ۴۶/۱)

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سناٹے بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرماتے تھے، اسے اصطلاح میں "نفس فی الزور" کہتے ہیں (ایضاً)

## تایخ نزول قرآن

قرآن کریم دراصل حکام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **بَنَّا قُرْآنَکَ فِی ثَلَاثِ مِائَةِ سَنَةٍ** (۲۱-۲۲: ۸۵) (بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں پہلے پہلوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کابور آسمان دنیا کے بیت عزت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیت عزت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبارت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ٹھونکا ہوا کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزول فترت کی یہ دو صورتیں خود فترت قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائی، بیہقی، اور حاکم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ فترت قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمان دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (الاتقان ۴۱/۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمان دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابو شامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور طالع کو یہ بات بتائی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہو جاوے زمین کی ہدایت کے لئے آسانی جملنے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ آنارنے سے یہ بھی جتنا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور دوسرے بیت عزت میں (مناہل العرفان ۳۶/۱) واللہ اعلم۔ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوہ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات رمضان کی کوئی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض لوگوں سے رمضان کی سترھویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے (تفسیر ابن جریر ۱/۱) سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت

وہ سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء تدریجی تھواریں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کی فطرت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ غار حرا میں کئی کئی راتیں گزارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ ایک دن لے قارئین کے لئے یہ بات یقیناً سمجھوت اور فریب کا باعث ہوگی کہ اس آیت میں وہ تمام آیات قرآنیہ (جو حوالہ کے طور پر بھی گئی ہیں) کا سورۃ لمبار آیات نمبر ۱۰۵ ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ ۸۵-۸۶ آیات نمبر ۲۱-۲۲-۲۳



اسی غامض آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ (قرآن میں پڑھو) حضورؐ نے لہرایا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے بکڑا اور مجھے اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ (قرآن میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) فرشتے نے مجھے پھر بکڑا اور دوبارہ لہرایا کہ میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ (قرآن میں پڑھا ہوا نہیں ہوں) اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ بکڑا اور بھیج کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

”اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (۱۰۶: ۱-۵)

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجھڑوں سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔ ۱۱۔ الحمد۔

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا، آپ کو کوسل دوزمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۃ مائدہ کی آیات آپ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

جاری ہو گیا۔

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورۃ کے ساتھ مکی اور مدنی آیات مکی اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے مفسرین کی اصطلاح میں ”مکی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی، اور ”مدنی آیت“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ آپ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اُترئی لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل ہوئیں، ہوتیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں مکی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات مکی، عرقات یا سفر معراج کے دوران نازل ہوئیں وہ بھی مکی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں، سفر ہجرت کے دوران مدینہ کے رستہ میں نازل ہوئیں ان کو بھی مکی کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ مدینہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مصنافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی اِنَّ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اَتَا مَنْتِ اِلٰی اَہْلَہَا (۵۸:۱۲)، مدنی ہے حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی (البرہان ۱۸۸/۱، وصال العرفان ۱۸۸/۱)

بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری کسی یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۃ  
مائدہ پوری مکتی ہے، اور سورۃ آل عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت  
مکتی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا  
ہے، مثلاً سورۃ اعراف مکتی ہے، لیکن اس میں وَسَمِعَهُمْ عَنِ الْعَرَبِ اَلَّذِي كَانَ مِنْ حَاضِرَةٍ  
الْبَحْرِ سے لے کر وَ اِذَا اخَذَ رَبُّكَ مِنْ نَفْتٍ اٰوَمَ الْاَمَكِ کی آیات مدنی ہیں (۱۱۳: ۷) اسی طرح سورۃ حج مدنی  
ہے لیکن اس میں چار آیتیں یعنی وَمَا كُنَّا مِنْ دَوْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا قُمْتُنِي سے لے کر  
عَدَا بَيْنَهُمْ يَعْقِبُكَ مَكِّيٌّ ہیں۔ (۵۵-۵۲: ۲۲)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا معنی یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثریتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اُسے معنی قرار دیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔  
(مشابہ العرفان ۱۹۳)

کئی دہائی آیتوں کی خصوصیات | علماء تفسیر نے کئی اور دینی سورتوں کا استقرار کر کے انکی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت محکمہ یا مدنی، ان میں سے بعض خصوصیات قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں :-

۱۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ سطر (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ سکتی ہے، یہ لفظ بندہ سورتوں میں ۲۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔

۱۲) ہر وہ سورت جس میں رضی مسک کے مطابق کوئی سجدے کی آیت آئی ہو، مکی ہے۔

۱۳) سورۃ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ کو طائیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکی ہے۔

۱۴) ہر وہ سورت جس میں جادو کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

۱۵) ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خللات بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر وہ بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مکی سورتوں میں عموماً **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** (اے لوگو! کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مکی سورتوں میں **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (اے ایمان والو! کے الفاظ سے۔

۲۔ مکی آیتیں اور سورہیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں اور مدنی آیات و سورتوں میں اور متصل ہیں۔  
 ۳۔ قاعدہ اقصان وغیرہ سے ماخوذ ہے، اور ریاس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورۃ جہنم کی ہے۔ لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین و مابین سے مروی ہے تو خود جہنم جس کا تعلق سے مشتق ہوگی۔ تنبیہ غامی

۲۔ مکی سورہ میں زیادہ تر توجہ دے سالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آسمان و زمین کی تخلیق و کونکر، صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی تلقین اور پچھلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خانوانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہوا اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔

۵۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلس زیادہ ہیں، اور ذخیرۃ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بطن پرستوں سے تھا، اور مکی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بطن پرستوں کی مدخل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ بحوق و مجوق اسلام کے سامنے تلے آ رہے تھے، علمی سطح پر بطن پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول

پہلے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور تدریجاً نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً بیس سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبریل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جُز کے بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے پہلا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ **قَدْ اُودِی الصَّخْرَ (نساء: ۹۵)** ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے (دوسری طوط پوری سورۃ النعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے) (ابن کثیر ۲/۱۲۲)

قرآن کریم کو کیا رنگ نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے :-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا تَوَلَّوْنَا عَلَىٰ أَعْقَابِنَا وَنَحْنُ الْمُدْخَرُونَ  
لِنُثَبِّتَ بِهِ لُؤْلُؤًا مِّمَّا نَمُوتُ بِهِ وَفِيهِ أَلَمٌ لَّكَ لَا يُؤْمِنُ

جَنَّكَ بِالْحَقِّ وَأَخْسَنَ تَفْسِيرًا (العنقان: ٢٢ و ٢٣)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دھوکہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح رہم نے قرآن کو تدویر کیا؟ (اے) تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور اس کی عمدہ تفسیر پیش کر دیں گے۔“

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آتی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا مفسر آن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے ان پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہو جاتی، اور یہ امکان نہ  
نہایت کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تعویذ قلب کا سبب بنتا تھا۔

(۲) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بعیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقیقت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی (تفسیر کبیر ۶/۳۲۱)

**شان نزول** | قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انجودازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کے وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جیسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہیے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں ”سبب نزول“ یا ”شان نزول“ کہلاتا ہے، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَتَّبِعُوا النَّاسَ فِي شَيْءٍ يَدْعُونَ إِلَى الْكُفْرِ بِمَا جَاءَكُمْ بِالْحَقِّ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُوا بِالْآيَةِ وَالْوَعْدِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَكَبِّرُونَ

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایسا نہ بنے آئیں، اور بلاشبہ ایک مؤمن کینیز ایک مشرک کے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو ۱۱



یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غوثی کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مرثد طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثد کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثد نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ سلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مرثد طیبہ تشریف لاکر حضرت مرثد نے آپ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی، واسباب النزول (لواحدی، ص ۳۸)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ”شان نزول“ یا ”سبب نزول“ ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں ”شان نزول“ نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اُن کا شان نزول معلوم نہ ہو۔

## قرآن کریم کے سات حرف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امت محمدیہ (علیہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بوزغفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آگئے، اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو سات حرفوں پر پڑھے پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی، (بخاری، مناقب العرفان، ۱۲۲/۱)

سات حرف سے مراد سات نوعیتیں ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أَنْزِلَ عَلَيَّ سَبْعَةَ أَحْوَثٍ فَأَخْرَجْتُ مِنْ كُلِّ أَحْوَةٍ حَرْفًا**

(صحیح بخاری، مع القسطلانی، ۲۵۲/۴)

”یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ابی علی کے مختلف اقوال ہیں، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلافات کل سات نوعیتوں پر مشتمل ہیں، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

- (۱) اسماء کا اختلاف: جس میں افراد، مشنہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَتَّتْ کَلِمَتٌ رَتَبَتْ ہے اور دوسری قراءت میں تَمَتَّتْ کَلِمَتٌ رَتَبَتْ۔
- (۲) افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں رَتَبَتْ تَابِعِي يَنْتَ أَشْقَارُ قَابِے اور دوسری میں رَتَبَتْ تَابِعِي يَنْتَ أَشْقَارُ قَابِے۔
- (۳) وجود و اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یا زیر بر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يَفْضَأُ كَاتِبٌ كِي جَلَّ لَا يَفْضَأُ كَاتِبٌ اور دَوَّالْعَرَبِيَّ الْمَجِيئِيْنَ جَلَّ دَوَّالْعَرَبِيَّ الْمَجِيئِيْنَ۔
- (۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو مثلاً ایک قراءت میں تَجَرَّيْ مِيْن تَجَرَّيْ تَا كَا تَهْمُ اور دوسری میں تَجَرَّيْ تَعْتَمُ تَا كَا تَهْمُ۔
- (۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ النَّوْمِ بِالْحَرْجِ اور وَجَاءَتْ سَكْرَةُ النَّوْمِ بِالْحَرْجِ۔
- (۶) بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً تَنَزَّلَتْ هَا اور تَنَزَّلَتْ هَا، يَزْتَجِيئُ اور يَزْتَجِيئُ، اور يَزْتَجِيئُ اور يَزْتَجِيئُ۔
- (۷) اہول کا اختلاف: جس میں تغنی، ترقین، الماد، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، لیکن اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے مثلاً مؤنثی کو ایک قراءت میں مؤنثی کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال: اختلاف قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی ہیں

لہٰذا ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلہ کی مطبوعاتی حقیقت کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”علوم القرآن“ احقر کی مفصل کتاب ۱۲

اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے ان سنا اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا ذکر کیا کرتے تھے جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ ذکر فرمایا، اس ذکر کو عوضۃ اخیرہ کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی شراہیں مسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک قارئین کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوت قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عبدالخلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر لفظ اور زیر و بریں نہیں ڈالے، تاکہ اہل مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو شراہیں رسم الخط میں نہ سما سکیں ان کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، اہل ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقیل علم بن گیا، اور سینکڑوں علماء، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

**قراءت میں قبولیت کا معیار** دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات

تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءت" کی بنیاد چڑھی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اہمیت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

۱) مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قراءت میں مشہور ہو جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جاسکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان شراہتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام، امام ابو حاتم مجتہانی، قاضی بخاری اور امام ابو جعفر طبرانی نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر ابن مجاہد (متوفی ۲۴۱ھ) نے ایک کتاب لکھی جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہد نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشأ یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعۃ احراء" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے ہی سات قراءتیں مراد ہیں، جنہیں ابن مجاہد نے جمع کیا ہے، حالانکہ صحیح بتایا جاسکتا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، درنہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابل قبول اور ان سات حرود میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

**سات شراہ** بہر حال، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

(۱) نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے مشرالیہ تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہ راست حضرت ابی بن کعب، عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالون (متوفی ۲۳۳ھ) اور ابو سعید درہم (متوفی ۲۴۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۲) عبد اللہ بن کثیر الداری (متوفی ۲۴۱ھ) آپ نے صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، عبد اللہ بن زبیر، شراہ ابوالاب انصاری کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بڑی اور قنبل زیادہ مشہور ہیں۔

(۳) ابو عمرو زبان بن العلاء (متوفی ۲۵۵ھ) آپ نے حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر کے



واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرات بقرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قرات کے راویوں میں ابو عمر الدردیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) اور ابو شیبہؒ (متوفی ۱۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں،

(۴) عبداللہ المحضیؒ جو ابن عامرؒ کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۸۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؒ اور حضرت وانکم بن اسفحؒ کی روایت کی تھی، اور قرات کا فن حضرت مینو بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرات کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قرات کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۵) حمزہ بن حبیب الزیاتیؒ مولیٰ عمر بن ربیع النخعیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) آپ سلیمانؒ عیسیٰ کے شاگرد ہیں، وہ بھی بن وناج کے وہ زربن مجیش کے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؒ (متوفی ۱۸۸ھ) اور خلف بن خالدؒ (متوفی ۱۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۶) عامر بن ابی العز والاسدیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) آپ زربن مجیش کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؒ اور ابو عبدالرحمنؒ صلی کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرات کے راویوں میں شعبہ بن عیاضؒ (متوفی ۱۸۸ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی ۱۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں، انھیں عوامی تلاوت ابھی حفص بن سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۷) ابو الحسن علی بن حمزہ الکسانیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) ان کے راویوں میں ابو الحارث مروزیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) اور ابو عمر الدردیؒ (جو ابو عمرو کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، نوخر الذکر تینوں حضرات کی قراتیں زیادہ ترک و مذہب میں رائج ہوئیں۔

دس اور چودہ قراتیں

لیکن جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قراتیں تواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہوئے گی صحیح قراتیں ان سات ہی میں مختصر ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن ہزاعؒ) نے سات کے بجائے دس قراتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ قرات عشرہ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قراتوں میں مندرجہ بالا سات قرات کے علاوہ ان تین حضرات کی قراتیں بھی شامل کی گئیں:-

- (۱) ابو جعفر زید بن العقیقؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جن کی قرات مدنیہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔
- (۲) یعقوب بن اسحق حضرمیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) آپ کی قرات زیادہ تر بقرہ میں مشہور ہوئی۔
- (۳) خلف بن ہشامؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جو حمزہ کی قرات کے بھی راوی ہیں، آپ کی قرات کوثر میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراتیں سچ کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرات کی قراتوں کا اضافہ کیا:-

- (۱) حسن بصریؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جن کی قرات کا مرکز بقرہ تھا۔
  - (۲) محمد بن عبدالرحمن ابن محضؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جن کا مرکز تکمیرہ میں تھا۔
  - (۳) یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جو بقرہ کے باشندے تھے۔
  - (۴) ابو الفرج شنبوژیؒ (متوفی ۱۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔
- بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوژیؒ کے بجائے حضرت سلیمانؒ عیسیٰ کا نام شامل کیا ہے، ان میں سے پہلے دس قراتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں (مثلاً ابن العرفانؒ جو ابو العزیز المقرئ لابن الجریؒ)۔

## تایخ حفاظت قرآن

عبداللہ رسالت میں قرآن کریم جو تکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عبداللہؐ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے

چنانچہ ابتداء سے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اس کے الفاظ کو اسی وقت دہرائے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورہ قیامت کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرائے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظ پیدا فرما دے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپؐ اسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اذہر آپؐ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور اذہر وہ آپؐ کو یاد ہو جائیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ انجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید تیس سال کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ دو دور کیا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۶ ج ۱)

پھر آپؐ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ

ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی ہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں مشران کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوائے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے ڈہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے جوگے فرمادیتے تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور سجدہ نبویؐ میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازیں کا اتنا شور مچنے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کر دو، تاکہ کوئی غلط پیش نہ آئے (مشاہل القرآن ۱/۲۳۲)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہو گئی جسے قرآن کریم اور حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمر بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت معاذ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن اسحاقؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دہائیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچیں۔

**کتابت قرآن** قرآن کریم کو حفظ کرنے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھنے کا بھی خاص ہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسم اطہر پر پسینہ

سلہ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب۔

کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھسکتے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ نکھواتے رہتے، اور میں نکھاتا جاتا، پہلا ٹکڑا جب میں نکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بعد جسے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہر حال، جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرمادیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے (مجمع الزوائد ۱۵۹/۱ بحوالہ طبرانی)

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں خلفائے راشدین، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاذ بن جعفرؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ۱۸۹/۹ اور زاد المعاد ۲۰۱)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے (فتح الباری ۱۸۹/۹) اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (ایضاً ۱۸۹/۹)

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہؓ کو رقم بھی اپنی یادداشت کے لئے آیات قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں (تاریخ اسلام، حضرت ابو بکرؓ کے عہد) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے

**مجمع قرآن** کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر یا وہ پھل

پر نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوتی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم



کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ کارنامہ جن حرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یتامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے بیٹھ کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یتامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کر دینے کا کام شروع کر دیں، میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نو جوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے ہائے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہذا تم قرآن کریم کی آیات کو تلاش کر کے انھیں جمع کر دو۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھولنے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کچھ روکی شاخوں، پتھری کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں پر قرآن کریم کو جمع کیا (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن)۔

**جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریق کار**  
اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ نیچے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن

سے علاوہ بھی سیکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، اُن کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا۔  
بزرگ قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحفوں میں

روح نہیں کی جب تک اس کے متوازی ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں کھواتی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ دنیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات بھی ہوئی ہو جو ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی بھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

(۱) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔  
(۲) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے (فتح الباری ۱/۹)۔  
بحوالہ ابن ابی داؤد۔

(۳) کوئی بھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ (اتقان ۱/۶)۔

(۴) اس کے بعد ان بھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے (البرہان فی علوم القرآن للزکشی ۲/۲۳۸)۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار زمین میں رہا تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورۃ براءہ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ فَخُذُوا حِذْرًا فَهُوَ بَرٌ ذُو آلَاءٍ بَهِيمٍ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی اور کا جس پر قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کھواتی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس بھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، کسی اور

کے پاس نہیں (البرہان ۱/۲۳۴ و ۲۳۵)

### ۱۱) اُم کی خصوصیات

بہر کیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا (تفان ۱/۶۰) لیکن ہر ضرورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "اُم" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (القان، حوالہ بالا)۔  
(۲) اس نسخہ میں سورتوں کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے (منابہل ج ۱/۲۲۶، دتائج القرآن لکھنؤ، ص ۲۸)

(۳) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔  
(۴) اس نسخہ کو کھولنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام اُمت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکرؓ کے کھولے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انھیں اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؓ نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر اُمت کا اجماع معتقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہیے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (فتح الباری ۹/۱۶)

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن  
جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے پھیل کر روم اور ایران کے دور دراز ملاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہرگز علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے، جسکی بدولت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوتی تھی، اور آپ بھی بڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انھوں نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی

پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر سرائوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری اُمت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلادیتے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیلئے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوئی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح اختلاف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملنے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کر کے ان سے شورہ کیا اور فرمایا کہ: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں





تمام انفرادی نسخے بذرا آتش فرادیتے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے مگر رسم الخط مسلمہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری امت نے بہ نظر احسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-  
 "عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ ہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا،" (فتح الباری ۱۵/۹)

**تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات**  
 حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیروں پر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

**نقطہ**  
 اہل عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، اور پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں نیز نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں ہستیاں بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطہ ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا (ابن ابی ریحان ۴۵۰/۲) بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا (صحیح الاصحاح ۱۵۹/۳) اور بعض نے کہا ہے کہ کوثر کے گورنر زیاد بن ابی سلیان نے ان سے یہ کام کر لیا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ اے اس کی تلقین کے لئے احقری مفضل کتاب علوم القرآن، ملاحظہ فرمائیے۔

عجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انھما دیا (تفسیر القرطبی ۱/۱۶۱) **حرکات**  
 نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیروں پر پیش) بھی نہیں تھیں اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا (شرطی ۶۲/۱)

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل رائج ہیں، بلکہ زبر کے لئے حروف کے اوپر ایک نقطہ (ـ) زبر کے لئے حروف کے نیچے ایک نقطہ (ـ) اور پیش کیلئے حروف کے سامنے ایک نقطہ (ـ) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ـ ـ) یا (ـ ـ) مقرر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں (صحیح الاصحاح ۱۶۱/۳) اس کے بعد عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیروں پر پیش کی موجودہ صورتیں معسر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

**احزاب یا منزلیں**  
 صحابہؓ اور تابعینؓ کا معمول تھا کہ وہ ہر صفحے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار معسّر کی ہوئی تھی جیسے "جزب" یا "منزل" کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو مکمل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان ۲۵۰/۱)

**اجزاء یا پارے**  
 آجکل قرآن کریم تین اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تین پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہو، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، بعض کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تین پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کرتے وقت انھیں تین مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زکریاؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تین پارے مشہور طریقے آئے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے (ابن ابی ریحان ۲۵۰/۱) و مناب العرفان ۴۰۲/۱) لہذا ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔



## اِخْلاص اور اعشار

قرآن اولیٰ کے تشریحی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد دس حاشیہ پر لفظ "مخس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اِخْلاص" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا۔ مباحث احقران (۳۰۳/۱) علامتہ میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہو کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجب حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا۔ البرہان (۲۵۱/۱) لیکن یہ دونوں اقوال اس درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں "اعشار" کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۲۴۹/۲)

## رکوع

"اِخْلاص" اور "اعشار" کی علامتیں تو بعد میں متروک ہو گئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (حاشیہ پر حررت) بنا دی گئی، احقر کو جو جو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں تشریح کریم ختم ہو سکتا ہے (فتاویٰ عالمگیریہ، فصل التراویح ۹۴/۱)

## رموز اوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (دسانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموز اوقاف" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی دان انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ دسانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد عہ

فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ بیان کی گئی ہے، لیکن جب قرآن کریم کے رموز غیر خود کسی کی تورکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اسمائے میں خط میں لکھا کہ ان کی کتنی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۶ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کتب کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم  
۱۲/۱۲/۱۳۱۲

بن طہور سجادی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے، والنشر فی القراءات العشر (۲۲۵/۱) ان رموز کی تفصیل یہ ہے: ط: یہ "وقف مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج: یہ "وقف جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔  
ن: یہ "وقف مجوز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص: یہ "وقف مخصص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ جو تک طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دو سر مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے (المخ العکثر، ص ۶۳)۔

مر: یہ وقف لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقف واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے (النشر ۲۳۱/۱)

لا: یہ "لا یقف" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ ٹھہرو، لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ ٹوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں (النشر، ص ۲۳۳ ج ۱)۔

ان رموز کے باغے میں تو یقینی طور پر ثابت ہو کہ یہ علامہ سجادی کے وضع کئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:۔

مح: یہ "مأنف" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً: لَئِكَ مَتَّعْتُمْ فِي النَّارِ وَمَتَّعْتُمْ فِي النَّارِ۔

مگر زَمَّ أَخْرَجَ شَطَاً، الخ اس میں اگر التَّوْبَةُ پر وقف کر لیا تو لَا تَجْنِلْ پر وقف درست نہیں، اور اگر لَا تَجْنِلْ پر وقف کر لے تو التَّوْبَةُ پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف کریں تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دی

۱۔ ۰ حرم دائرہ یہ علامت آیت ہے۔ ناشر

اما ابو الفضل رازی نے فرمائی ہے (النشر ص ۲۳۴ ج ۱ والاعتقان ص ۸۸ ج ۱)

سکتہ ہے: یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ وقفہ: اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔ ق؛ یہ "قَبْلَ الْوَقْفِ" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

وقف: یہ لفظ "وقف" ہے جس کے معنی ہیں "بٹھ جاؤ" اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلی: یہ "الْوَصْلُ اَوَّلُ" کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ "ملا کر پڑھنا بہتر ہے"۔  
صل: یہ "مَنْ يُوَصِّلُ" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ بٹھرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف التبی صلی اللہ علیہ وسلم: یہ ان مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

**قرآن کریم کی طباعت** جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیبر برگ کے مقام پر ۱۳۲۷ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں مسیحی پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۳۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۴۷ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو تیسرے طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکودی ص ۸۶، علوم القرآن، ڈاکٹر محمد صبحی صالح، لوزن و ترجمان نظام احمد حریری ص ۱۳۱

## علم تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علم تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں "تفسیر" کے لفظی معنی ہیں "بکھولنا" اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَاسْمَعْ لَنَا الْقَوْلَ الْبَاطِلَ الَّذِي كُنَّا لَمْ يَكُنْ لَنَا مَانِعٌ لِّاِيَّتِهِمْ (۲۴:۱۶)

"اور ہم نے قرآن آپ پر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف آئاری تھیں ہیں"۔

پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَعَلَّمَ مِّنَ اللّٰهِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ نَزَّلَتْ فِيهِمْ رُسُلًا مِّنْ اَلْقُرْآنِ فَاَتَمَّ مِّنْ اَلْقُرْآنِ مَنَاسِكَتَهُمْ (۱۶۴:۲)

"بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور

انہیں اللہ کی کتاب اور دانا کی باتوں کی تعلیم دے"۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں جو مل اوقات کہیں کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل اشار اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابہ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپ سے رجوع کرنے اور انہیں تسلی بخش جواب مل جاتا، لیکن آپ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ امت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور طرہ و گراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریک کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینان و صحابہ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔



**تفسیر قرآن کے مآخذ** علم تفسیر کو اس اہمیت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کسی کسی شقیں اٹھائیں؟ اور یہ جہد کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں، لیکن یہاں مختصر یہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہزار ہاں میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ بحثیں الگ ہیں۔

### ۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات جس اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہو، مثلاً سورہ فاتحہ کی دعائیں یہ جملہ موجود ہے کہ "فَإِنَّكَ لَآتِيَنَّ الْغَنَمَ فَغَنَمٌ" یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی: "فَإِنَّكَ لَآتِيَنَّ الْغَنَمَ فَغَنَمٌ عَلَيْهِمُ مِنَ النَّبِیِّتِ وَالصِّیِّتِ الْفَقِیْرِ وَالصَّالِحِیْنَ" (۱۹: ۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔ چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

### ۲۔ حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہو، اس لئے مفسرین کرام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے بزرگ مسیحی زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم

لے اس سب سے علم القرآن پر محقق مفضل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔

کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہے، اور حقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا اپنی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

### ۳۔ صحابہ کے اقوال

صحابہ کرام نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہو سکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا جن آیتوں کی تفسیر ان یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر صحابہ کرام کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں، اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر میں مدد توں ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں

### ۴۔ تابعین کے اقوال

صحابہ کے بعد تابعین کا مآخذ آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام کے بعض ہر، اس لئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعین کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاقتناع ۱۴۹/۲) لیکن ان کی اہمیت انکار نہیں کیا جاسکتا۔

### ۵۔ لغت عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی لسان نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ و تابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں عاکہ کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

### ۶۔ تدریس اور استنباط

تفسیر کا آخری مآخذ "تدریس اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحیرہ

نہایت گہری جس کی کوئی حد نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرے اسے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تدریج کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ باتوں سے متصادم نہ ہوں، لہذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، اجتہاد و تابعین کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن ائمہ کے محقق علماء نے انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی (ارتقان ۲/۱۸۷)

**اسرائیلیات کا حکم** اسرائیلیات ان روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں و عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات نکھ دیتے تھے جو انھیں سند کے ساتھ پہنچی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے ان کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام اور تابعین پہلے اہل کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انھیں قرآن کریم میں پچھلی آیتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انھوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے اپنے پڑنے والے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں حافظ ابن کثیر نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی عین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہو، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیل روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّاطِیْنِ كَفَرُوْا (۴۱:۲۲) راد سلیمان کا کافر نہیں ہوتا، بلکہ شیطاں نے کفر کیا، اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اور یاکی بوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ قورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انھیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

### تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے خود صرف اور بلاغت اور ادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

انفوس ہر کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف بولی بڑھائیے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان بڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں راستے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی مشہور کتبہ رکھنے والے لوگ جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف میں بولے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پڑانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے دپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں بچتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت ہلک گمراہی کی طرف لجا تا ہے، دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی دان انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر ماسٹر کے زیر تربیت رہ کر



ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حامل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کرے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَقَدْ يَسْرُنَا الْغُرُورَ إِنَّ لِلَّذِي كُنَّا (۱۰۵۴)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے

آسان کر دیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات و قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائنداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکور بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلَّذِي کر (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں، جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور چنگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبد الرحمن سلمیٰؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے یہیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور علمی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ :-

تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا

”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا اور افاقان (۱۰۶/۲)“

ہمارے مولانا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۃ بقرہ یاد کرنے میں پورے ۱۸ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا (افاقان ۱۰۶/۲، نوع ۷۷) خود کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعرا و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور لڑول دمی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود عالم قرآن بننے کے لئے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو زہد قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شہد پیدا کر کے یا صرف ترجمہ دیکھ کر مغیرہ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک غلطی ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ :-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَغْيٌ فَلْيَتَّبِعْهُ مَقْعِدُهُ فِي النَّارِ

جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے

(ابوداؤد، از افاقان ۱۰۹/۲)

اور :- مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَاصْأَبَ فَقَدْ أَخْطَأَ

جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح

بات بھی کہے تب بھی اس نے غلطی کی (ابوداؤد نسائی، از افاقان ۱۰۹/۲)

## مشہور تفسیریں

ہم در سالٹ کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں بھی لکھی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی ایسی خدمت نہیں کی گئی، جنہیں قرآن کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم ان اہم تفسیروں کا

مختصر تعارف کرنا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مأخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہے، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف ان تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

**تفسیر ابن جریر** | اس تفسیر کا اصل نام جامع السببان ہے، اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۲۰ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبری اپنے دور کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھتے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (الدرایہ والنہایہ ص ۱۲۵ ج ۱۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے حلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تین جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات جمع ہو گئی ہیں، اس لئے ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انھیں دستیاب ہو سکیں ان سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس صحیح شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انھوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

**تفسیر ابن کثیر** | یہ حافظ عطاء الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۴۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، ان کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ کہ مصنف روایتوں پر محض ثناء تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

**تفسیر القرطبی** | اس کا پورا نام "المجامع لاحکام القرآن" ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی (متوفی ۵۸۰ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ میں امام مالک کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرہ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب، بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

**تفسیر کبیر** | یہ امام فخر الدین رازی (متوفی ۸۰۵ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام مفاتیح الغیب ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے، امام رازی متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقل اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دشمنی انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیات قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے، اغلب یہ کہ امام رازی نے سورۃ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کر سکے، چنانچہ سورۃ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل النحوی الدمشقی (متوفی ۸۰۵ھ) یکیش بخم الدین احمد بن محمد العتصمی (متوفی ۸۰۵ھ) نے مکمل فرمایا (كشف الظنون ۲/۲۷۷)۔

امام رازی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہو گئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان کی تفسیر پر تبصرہ کیا ہے کہ فیہ کل شیء الا الغیب (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا یہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انھوں نے جہور اہل حق کی راہ سے ہٹ کر آیات قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

**تفسیر البحر المحیط** | یہ علامہ ابو حنیفہ غناطی اندلسی (متوفی ۸۵۰ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علم خود بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں خود بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلافات اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

**احکام القرآن للبخاری** | یہ امام ابو بکر جصاص رازی (متوفی ۲۵۵ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ حنفی میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے، اور انھوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف ان آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

**تفسیر الدر المنثور** | یہ علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور" ہے، اس میں علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین علامہ حافظ ابن جریر، امام بخاری، ابن مردودہ، ابن حبان، اور ابن ماجہ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے۔



علامہ سیوطی نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انہوں نے ردایا کچھ ایسی روایات کو ذکر کرنے کے بجائے صرف اس معنی کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ وقت ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو بجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح و مستقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں، اور سند کی تحقیق کے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا، علامہ سیوطی بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقید و حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

**تفسیر مظہری** | یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب بانی پتی رضوی مدظلہ العالی کی تصنیف ہے، اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان بھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

**روح المعانی** | اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و سبغ المثنیٰ" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۰ھ) کی تصنیف ہے، اور تین جلدوں پر مشتمل ہے، انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے، لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہنیت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علی گوشہ نشین ذریعہ روایات حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

## مختصر سرگزشت مصنف

ابن ابی نضر محمد شیعہ ہیں مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس لکھنؤ کے باشندے ہیں جن کا  
کوتن تھانی نے اس کا مولود دینی مرکز مولانا سید نور محمد بنو بادشاہ اور انجیلہ والہ خرم کی آغوش میں پرورش  
کامیاب و صحیح اسلوب پر عطا فرمایا اور عام دینی ہونے کے ساتھ دارالعلوم دہلی ہند کے مہر تھے، اور ان کی  
دہلی ہند کے ایمان و ملتائے دینی کی مصیبتوں سے فریضہ باب ہونے کے واقعہ کی بیشمار شہرہ آفاق آنکھوں کی  
بزرگوں کا راز نہ نہر و شہادہ کی زندگی پہنچنے سے وفات تک دارالعلوم دہلی ہند میں ہی بڑی ہوئی، وہیں  
تعلیم حاصل کی، وہیں مدرسہ برکات ساری میں تعلیم کی خدمت گذاری کی۔

اس کی ابتدا جامعہ شریعت والہ خرم کی تھی جس سے دارالعلوم کے اساتذہ قرآن حافظ مولانا محمد حسین صاحب  
اور حافظ احمد اراٹھی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوئے اور انھوں نے دارالعلوم کی خدمت میں رو کر  
لیکھنؤ فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی کوئی کی تعلیم حاصل کی، پھر مستطعم میں دارالعلوم دہلی ہند میں  
اور غلط کر مستطعم تک درس لگایا، کائنات صاحب کی ماہرین اساتذہ کی خدمت میں رو کر پورے لکھنؤ میں  
تعلیم کیا گیا، کئی کئی سال تک اس میں مشغول رہا، پھر یہاں سے مستطعم تیار ہوئی، ایک شیخ العربیہ اجماع شریعت  
حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ احمد قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئی وہ بھی کئی سال لکھنؤ  
کی غیر رسمی حاضری قیام رہی، ان کے جہان سے وہاں شریعت لائے کے بعد ان کے دستِ حق پرست پر  
بسیست طریقت نصیب ہوئی، دارالعلوم عربیہ کی یاد کا تعلیم حضرت ابی سے حاصل کی، حافظ عبد  
جانب العلوم حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب شریعت، علمات ابی حضرت مولانا معصوم  
میرزا امین صاحب، عالم دین حضرت مولانا سید احمد حسین صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا  
غفر اللہ صاحب مائیک، بیٹا اللہ علیہ الفتح حضرت مولانا محمد آغا علی صاحب تہذیب علم اجماع،  
اور امام علوم معقول و منقول حضرت علامہ مولانا عبدالحیہ صاحب حضرت مولانا محمد رسولی صاحب  
انہوں سے کئی سطوح کی تحریروں کے وقت اختراک و درگیریوں کے واسطے اس اراٹھی سے رشتہ  
فرمایا، پھر تھانی ان دونوں بزرگوں کا سایہ تا آخر باقیات قائم رکھیں، اور ابی علم کون سے  
لیصل باب ہونے کا راز سے زیادہ موقع عطا فرمائیں۔

۱۔ مولانا صاحب نے علامہ کی جگہ شاعرہ انوار کی نظر لگائی، ان کا شمار دہلی اور دہلی بزرگ بھی نہ تھے  
ہو چکے ہیں، ان تھانی کی کورجی رشتہ میں بزرگ عطا فرمائیں، اور دہلی عالیہ نصیب فرمائیں، ۲۰ مفر

اساتذہ اور اکابر دارالعلوم کی نقل و حرکت و حمایت اول ہی سے اس کا کاروبار بند ہو گیا،  
۱۳۲۰ھ میں اس وقت تک تو ان کی بقیت چھتائی تھی، قاضی اور میرزا بادشاہ اور مولانا دہلی و جہان شریعت کی  
کئی سالوں میں اکابر دارالعلوم نے اس کو کچھ سبب پر بھانے کے لئے دیکھے، اس طرح مستطعم میں بھی  
تعلیم کا مشورہ سال تھا، مستطعم سے باقاعدہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر لگایا گیا، اور اہل مال  
مسئلہ مختلف علوم و فنون کی تفریط اور اہل مال کے دوس کی خدمت انجام دی، مستطعم میں بھی  
صدر مائیک کی حیثیت سے دارالعلوم کا منصب قبول کیا گیا، اس کے ساتھ کچھ کتب میں حدیث و تفسیر کی  
بھی تدریس دی، مولانا اکثر مستطعم میں بھی تحریک پاکستان کی جدوجہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے  
دارالعلوم دہلی ہند سے مستعفی ہو گیا۔

دارالعلوم کی چھٹی سالانہ خدمت دوس و فنون کے ساتھ خاص خاص موضوعات پر تھیں  
اس بھی مسلسل جاری رہی، ان تمام مشاغل اور جدوجہد میں دارالعلوم کی محنت سے اپنے حوصلے کے مطابق  
قرآن و حدیث سے کچھ نہایت پرکھتی تھی، حضرت مولانا محمد علی اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ  
اساتذہ علی تھانی قدس سرہ کی خدمت میں حاضری کا شرف و خطاب علی کے زمانے میں بھی فرمادیا تھا  
مستطعم سے چھ برس بعد کے ساتھ مسلسل حاضری کا شرف حاصل ہوا، تقریباً بیس سال  
حضرت اقدس کی وفات تک مستطعم تک جا کر رہا، حضرت قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے جلالِ علم  
فنون کی کامل بہار عطا فرمائی تھی، اور ان میں سے خصوصاً فقہ اور تصوف آپ کے مخصوص فن تھے  
ای دونوں علوم میں آپ کی تصانیف، آیات القرآن، التلخیص اور اشعار و دیگر رسائل تصنیف  
اس میں کافی شائدیں، حضرت قدس سرہ نے اپنی آخری عمر میں ضرورت محسوس فرمائی کہ ان کے  
پرکھنے ایسی کتاب بھی جانچ میں حاضری کے مسائل کی تدریس میں ضرورت محسوس فرمائی کہ ثابت ہو سکی  
واجب کیا جائے، اس کام کو مولانا کر کے خیال سے چند اصحاب میں تقسیم فرمایا، اس کا ایک  
حضرت احمد کے بھی سپرد ہوا، جس کا کچھ حضرت احمد قدس سرہ کی حیات ہی میں آپ کی زیر نگرانی  
کھا گیا، ابی حضرت کی وفات کے بعد مولانا تعالیٰ نے فرمایا، اور دو جلد میں شائع ہو چکا  
ہو جو مفسر قرآن ہیں۔

اس سلسلے کی حضرت کی حرکت سے محمد اشرف قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعاون اور  
پیروکاری، اس کے بعد رضا و فقر سے زندگی میں ایک نئے انقلاب کا روادہ کھلا، مشائخ اراٹھی  
مستطعم میں پاکستان کی تحریک قوی ہو کر پورے ملک میں پھیل، حضرت قدس سرہ کے سابقہ امام  
اور موجودہ اکابر کے ارشاد میں اس تحریک میں حضرت ایسا، اور دوسرے سال کے شب و دن اس جدوجہد میں  
کئے، تدریس سے علاوہ تک اور مشورہ پر کچھ کچھ لکھنے کے دوسرے کچھ بھی تحریک پاکستان

















سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

پر مکی صورت ہر جس میں ساٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورہ فاتحہ کے فضائل

اس سورہ فاتحہ کو قرآن کریم میں سورتِ رحمتِ کاملہ ہی اور اول کو سورتِ رائے اور بصیرت کہتے ہیں۔ اسی سے شروع ہوتا ہے، انکو اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت ہے۔ کل طرح پر نازل ہوئی کہیں سورتِ سورہ اقصاء، و حائل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں لیکن سورتِ رحمت پہلے نازل ہوئی تھی۔ یہ ہیں حضرت موحی سے سورہ فاتحہ کا نازل ہوا لیکن نزول میں سب سے پہلی سورتِ سورہ انفلق کی جو اس کا مقابلہ غالباً کر کریم ہی سورتِ اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اسی سورت کا نام ہی فاتحہ رکھا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جو سورت ایک حیثیت سے پڑھنے کے قرآن کا متن اور دوسرا قرآن اس کی شرح ہے، انوار اس وجہ سے کہ پڑھنے کے قرآن کے مضافاً یہاں اور صحیح میں، ہر فرس، اور ان دونوں چیزوں کے پہلے ہی اس سورت میں بیان کر دیے گئے ہیں، تصدیق توحید، تعالیٰ اور روح الہیہ، ان میں اس کا تفصیل بیان ہے، اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کے نام تمام فرقان و انکار، ان کتاب اور قرآن حکیم میں ایک ہی قسم میں آئے ہیں، اور یہ فرقان ہے۔

اس وجہ سے کہ اس صورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت یا مطالعہ شروع کرے لیکر خاص جہادیت کی گنجی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام بھائی خدایات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر

یہ وہ خاص طلب جن اور امامِ راست کی پیروی کے لیے ہے اور دیکھو اور امامِ حقانی سے جو دعا بھی کرے کہ سزا  
مستقیم کی جاوے عطا ہو اور شروع سویت میں اس بات کی حسد و شکا کا بیان ہے جس کی اگر امام میں  
یہ درخواست جاوے نہیں کرے، اور اسی درخواست کا جواب بھی پراقرن ہے، جو ائمہ اربعہ کتب سے  
شروع ہوتا ہے مگر انہی کے برخلاف حقانی سے امامِ راست طلب کی شخص کے جواب میں تو کتب اربعہ  
سزا کا اشارہ کر دیا کہ جو سزا ملے جو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

درویش کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر تو ثابت ہے، حال ہی میں انجیل اور تورات میں اور خود قرآن میں بھی کوئی ردِ مسمیٰ صورت اس کی مثل ہے۔ وہ راوی ازندی عن ابی ہریرۃؓ و قال سمعنا من جبرائیلؑ کہ کل صبح علی مناسطہ من علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ ہر پڑائی کی شفاء ہے۔ وہ راوی ہی عن ابی ہریرۃؓ (مسند صحیح بخاری)۔

سورۃ النور کا یک نام حدیث میں سورۃ شفاء کہو، یا ہے (قرطبی) اور صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فشر ان کریم کی سب سورۃوں میں عظیم ترین الحمد للہ رب العالمین ہے۔ (قرطبی)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شرائع کرائوں انڈ کے نام سے جو بڑے پیرانے بیانیے محمد اے ہیں

ابوہدقہ قرظی کی ایک پینٹنگ

اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ کربم اہل ایمان قرظی میں سورۃ کا چارونکروں اور ساتویں آیتوں کے درمیان سورۃ کو تہ کے شرف میں بسم اللہ کی جگہ پر لکھا گیا ہے۔ اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ کربم اہل سورۃ کا آغاز سورۃ کو تو لکھا جائے یا اس کے بعد سورۃ کا آغاز سورۃ کے شروع میں ہوگا۔ بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو سورۃ کے شروع میں دو سو قرظی کے درمیان فصل لکھا جاتا ہے ہر قرظی کے نیچے لکھا ہوا ہے۔

کتابتِ قرآن سے پہلے یہ حکم کہ اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو جتنی کے نام سے شروع کرتے تھے، جو سب سے پہلے شروع کرنے والے کو حکم دے کر شروع کرنے کو کہتے تھے، اس پر جاہلیت کو نشانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت ”ہر چیز میں ہم نے کوئی شے اس میں دستور آئی، کو اس کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا اور اُن پر نصیحت ہو چکی۔“

علاحدہ پہلی آیت نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری جگہ آسمانی کتابیں بھی ہیں اور آیت سے شروع کرنے کو بھی













[illegible]

ایجاد و ترویج و تفسیر و تکرار  
 ہرگز بجز سرگشت و سوسائے نادر  
 قریب مکی نے اسانی کا فرشتہ اور اس کے مقصد حیات کو اس ہیئت میں واضح و سترایا  
 محمدؐ نے ہم را در آستانہ گداز گداز گداز گداز  
 نہیں بنایا کہ اس کا روبرو میری حادہ کرے

تقریباً دو گز سے حلیم ہے اگر بیت اللہین ایک حبیبیت سے پہلے چلے آجھنہ بدو کی دلیل  
ہو کہ بیت اللہ کی خاست کی حریت و پرورش کی ذمہ دار حضرت ایک ذات اقدس تعالیٰ کی ہے و خصوصاً  
کی حقیقتی میں کون کی ہمارے کہنے سے اس سے پہلے آجھنہ بدو کی ذات اقدس میں حضرت  
کے ساتھ ایسی ہے کہ سب پہلے کون جو عبد ہادی تعالیٰ کا بیان میں فرما رہا تھا  
دوسری آیت میں حضرت رحمت کا ذکر بقا صفت و تحقن سے کیا گیا ہے یا رسول  
میں نے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی را حضرت خداوندی کی دست و کثرت اور کمال کا بیان ہے اس صفت  
کے ذکر کے میں شاید حضرت اشعار ہر کہ تمام کائنات و مخلوقات کی حریت و پرورش کی  
ذمہ داری حق تعالیٰ نے اپنے ذریعہ کو ہے وہ کسی اپنی ضرورت ادا و زبردستی سے نہیں بلکہ  
سب کچھ اس کی صفت رحمت کا تقاضا ہے اگر ہر کی کائنات نہ ہو کہ اس کا کچھ نقصان نہیں اور  
جو ہمارے قوس پر کمر ہا نہیں ہے

دلهنباہری چو کہہ خاکست نبود ، ۴ مدحی کردہ شد بر تو ز صحت افزود

—

[illegible]

پہلی آیت کا جواب یہ ہے کہ وہی جزاء اس کو کام ہے جس کو گرفتہ کیلک و اعلان کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ لفظ "وہی جزاء" سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ دنیا کیسے بد اعمال کی جزاء و سزا کی جہتیں، بلکہ ایک دلراہ عملی نفع دہا کر کے دے گا۔ یہ سزا کا اصل واصل کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں کسی کو خوش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کسی کو کچھ و مصیبت میں مبتلا اگر یہ نہیں سنا اور یا سنا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقرب و مفضل ہے۔ جو عین دنیا کے دوزخ و نیرن کا گناہ گار ہے کسی کو کہا فرض دہا کر کے فی مصروفِ محنت و کھسارے کوئی عقلمند اس کو مصیبت مند نہیں کہتا۔ دوزخ و عذاب کی مشقت کے اندر وہ اپنے آپ کو گرفتار مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنے سینے کا کامیاب کارنامہ کہتا ہے، یاد رکھو کہ یہاں اس کو اس مشقت سے سبک دینا کرنا چاہیے تو وہ اسے اپنا حق و ترس نہیں خیال کرتا ہے۔ یہ کہہ دو اس میں دوزخ محنت کے ہیں پر وہ اس راحت کو کہہ رہا ہے جو اس کو نواز دہا کر کے ملنے والی ہے۔

میں نے جتنی کوشش کی وہاں بھی اعلیٰ علم و سلام اور ان کے ہندو اہل خانہ میں ایک ترقی یافتہ "عیدیت" کے اعلیٰ مہستہ کے ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بے شکوکات و سرور نظر کے ہیں۔

نقص و عیب، دشمن کو ضرر و خاک پہنچانے  
سرور و سلامت کو ترغیب دینا

انفرض دینا کی جہش و عشرت حق و صداقت کی اور دروغ و وصیت بدعمل کی بعض علامتیں ہیں۔  
ایں کوئی بھی کسی عمل کی جڑ یا ملاک جیسا کہ مذہب یا دنیا میں ظاہر کر دیا جائے۔ وہ اس کا بار بار دہ  
نہیں دہرا۔ بعض مشہور کرنے کے لئے ایک ٹیڑھ بن جائے۔ اس کے متعلق مفسر اور دانشور ہے۔



وَلَقَدْ عَلَّمْتُمُ الْقُرْآنَ ابْنًا لِّكَ  
ذُو الْقُرْبَىٰ ابْنًا لِّكَ  
فَلَمَّا عَلَّمْتُمُوهُ خَرَجَ  
أُورُورُ مَرِيٍّ مَكْرًا شَدِيدًا

تو میں نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

عَلَّمَ ابْنًا لِّكَ ابْنًا لِّكَ  
فَلَمَّا عَلَّمْتُمُوهُ خَرَجَ  
أُورُورُ مَرِيٍّ مَكْرًا شَدِيدًا  
بِئْسَ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ

میں نے ابھی ابھی تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ

اور وہ بھی تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ

اور وہ بھی تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

فَقَرَأَ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ  
فَقَرَأَ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ  
فَقَرَأَ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ  
فَقَرَأَ الشَّيْطَانُ عَلَيْهِ

پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ  
وَمَا تَقْصِيهِمْ فِي الْآخِرَةِ

اور وہ بھی تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا  
پھر اس نے تم کو قرآن کی تعلیم کی تھی ایک بچے کو جو تم سے بہت قریب تھا

























نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارق عادات کے اظہار سے جو مقصد کردہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا کہ اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عنایت و ضرورت کا بھی اعتراض ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الہی اور طاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا جس طرح کوئی شخص بلب اور پتکے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کرنے تو ردشنی اور خواست محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استقامت اور ہمت اور کمال کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نہ سبب و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو اختیار سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور نص واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں اذیاد و تقریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبین والمعاد

صراط مستقیم کی ہدایت دنیاوی اور دینی تغیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس میں میں کلیہ کامیابی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو وہ صراط مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراط مستقیم پر ہوتی ہے، جو انسان کو جنت کی طرف لیجاتے اس طرح دنیا کے سامنے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراط مستقیم ہی ہے جس کام میں وہ آلات و ذرائع خستہ یا کئے گئے جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عاۃً لازمی ہو تو کامیابی عاۃً لازمی ہوتی ہے، چنانچہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراط مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ دین کو ہر وقت عز و جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ اتحسار اور نیست کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعين۔

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

واللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبین والمعاد

بسم اللہ تعالیٰ

## سورۃ الفرقان

ان اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ الفرقان ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہ میں اس کا ذکر موات ہے، جس روایت میں سورۃ بقراءہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں، دین کثیر تعداد آیات دو سو تھی یا سی ہی اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسویں (ابن کثیر)

زمانہ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکرّمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ الفرقان قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آئین نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ ربیعہ یعنی سود کے متعلق ہر آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں بھیج کر کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت **وَاتَّقُوا** **يَوْمَئِذٍ يَخْلَعُ فِي ذُلٍّ** (۱۸:۲) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سند ہجری میں ۱۰ ہجری کو قرآن کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، و قرطبی، اور اس کے اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

مضامین سورۃ الفرقان | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورۃ الفرقان کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔

قرطبی نے حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جادو گر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی جادو نہ چلے گا، قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی



اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ بقرہ منام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے، اسام اور ذرۃ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت انبی فرشتے اس کے جکو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اثر و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی) حضرت علیؓ بن مسوٰد نے فرمایا کہ: سورۃ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھے تو اس رات کو جہنم، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، بچہ و غیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو فاقہ ہو جائے گا، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۃ بقرہ کی تین آیتیں۔

### احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بقرہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، ابن عربیؒ منبر مانتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار اتر اور ایک ہزار تہی اور ایک ہزار حقیقتیں، ایک ہزار قبر اور قضا ہیں (قرطبی) و ابن کثیرؒ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۃ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین یہ ہیں: اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا سچی عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب ہے اور درحقیقت پورا مسترآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہے قرآن ہی میں ملے گا۔ اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورۃ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذلک الکتاب سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ میں صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول: توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، جہتلات، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جہیز نیاات بیان ہوئی ہیں۔

## سُورَةُ الْبَقَرَةِ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۙ آيَاتُهَا ۲۸۶ ۙ رُكُوعَاتُهَا ۲۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الْم ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۙ فِيْهِ ۙ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دبی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ

ان کو اس میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝ اُوْلٰئِكَ عَلٰى هُدًى

کہ کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ تَّرْهِيْمٍ ۚ ۝ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

### خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں رہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ



کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی اہم اس میں مشبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے مشبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے، راہ ہٹانے والی بے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں یہی ہوئی چیزوں پر یعنی جو چیزیں ان کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسولؐ کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو قائم رکھنا یہ کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یعنی نیک کاموں میں، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں، مطلب یہ کہ ان کا ایمان ستر آں پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور مشروط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھ کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل ستر مائی تمہیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، وہ گیا عمل سورہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، ان پر عمل جائز نہیں، اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہے)۔

**حَلِّ لُغَاتٍ** ذٰلِكَ كَيْفَ يَضْرِبُكَ طَرَفُ اِشَارَةِ كَيْفَ لَمْ يَسْتَأْذِنْ لَمْ يَشْكُ وَشِبْہِ هٰذَا مَعْنٰی ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّبِعُونَ جن میں صفت تقویٰ ہو تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، عَقِبَ نقلی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی نظر اور دوسرے حواس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، یَقِیْنُ اِثْمًا سے بنا ہے، جن کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، وَرَبِّ قُلُوبِنَا رِزْقٌ سے بنا ہے، جس کے معنی مہار و رزی اور گزارنے کا سامان دینا، یُفْقَهُونَ اِنْفَاقٌ سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اِخْرَاجَ نَفْسٍ میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرت کہا جاتا ہے، اس بگ عالم دنیا کے مقابلے میں عالم آخرت بولا گیا، یُذِیْقُوْنَ اِنْفَاقٌ سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، یُفْقَهُونَ اِنْفَاقٌ سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فَلَاحٌ کے معنی پوری کامیابی۔

## معارف و مسائل

حروف مقطعه جو بہت سی سورتوں **اَللّٰہُمَّ** بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروف سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے **اَللّٰہُمَّ** **اَللّٰہُمَّ** **اَللّٰہُمَّ** وغیرہ ان کو

اصطلاح میں حروف مقطعه کہا جاتا ہے انہیں ہر حرف جدا جدا اسکن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم، حروف مقطعه جو اراکل سورتوں میں آتے ہیں، ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسما، اقبیہ کے رموز ہیں، مگر جوہر صحابہ و تابعین اور علماء امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک داز کے دیا گیا ہو، جن کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کو جستیار فرمایا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

فہرشی، سفیان ثوری اور ایک جماعت قدس نے فرمایا ہے کہ ہر سال کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز اور اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطعه ستر آں میں حق تعالیٰ کا داز ہے، اس لئے یہ ان مشاہدات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اذلی تو ان پر ایمان لانا پھر ان کا پڑھنا ہمارے لئے قرابہ کلیم ہو، دوسرے ان کے پڑھنے کے معنی فائدہ و برکات ہیں، اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر یقیناً وہ ہمیں پہنچتے ہیں۔

پھر فرمایا:-

آنحضرت صہ بن اکرم، فاروقی اعظم، عثمان غنی، علی رضی اللہ عنہم، مسودہ وغیرہ جوہر صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی حدیث و تھاکہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، جن میں ان پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور جن طرح آئے ہیں ان کی تلاوت کرنا چاہیے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں:-

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تشبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہو، اس لئے اس کو بھی فائدہ کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِیْهِ لَقَدْ اٰتٰنَاكَ حُسْنُ طَرَفِ اِشَارَةِ كَيْفَ لَمْ يَسْتَأْذِنْ لَمْ يَشْكُ وَشِبْہِ اُوْیْیٰی سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْبٌ کے معنی شک و شبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارہ بعید کا نہیں تھا کیونکہ اسی ستر آں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارہ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جس صراط مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا ستر آں اس درخواست کا جواب بصورت قبولیت اور صراط مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا، سن لی اور قرآن





















ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی روشنی روشنی سے جب فتنے فساد واقع ہوتے گئے اور کسی غیر خواہنے فحاشی کی کراہی کا بروقی موجب فساد ہو کر رہا ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بھائے مفسد کے مسلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی چال اور غبارت کا بیان ہے، کہ اپنے عیب ہی کو بہتر سمجھتے ہیں، آگے دوسری چال کا بیان ہے کہ دوسروں کے بہتر کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لاتے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاؤں گے جیسا ایمان لے آؤ؟ میں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ جنگ بھی میں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر عسریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ مام طور پر تو وہ اپنے گھر کو چھپاتے بھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب غلو میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں ورنہ ہم تو تمھارے ہم مشرب ہیں، آگے ان کے استہزاء کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہا ہے ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء ہی ہو کہ ان کو بہت دی جا رہی ہے جب وہ خوب سفر میں کامل ہو جاویں اور مجرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ان کے استہزاء کے مقابل میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلے میں گمراہی لے لی) ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرد اگر دی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہوا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں، تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھ ہی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آ جانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

دالوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں ہمیں کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گمراہ (بہرے میں گھوٹے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، رک ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہیں، یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خوب دل کھول کر کھنڈ پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اس گردہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ متبطلان بدل جاتا تھا، یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور برق برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں مل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کرکٹ کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لے ہوئے ہو کافروں کو، برق کی یہ حالت ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بنائے اس نے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفان باد و باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے) ۴

## معارف مسائل

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں رابطہ آیات قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بتائیں آیتوں میں اس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا اعانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں کفر میں تھے، ان لوگوں کا نام مشرکین میں منافقین رکھا گیا کہ مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں لیکن ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے اللہ پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ۴

اس میں ان کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے





اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مستلزم تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے بچنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، ان کے اس عمل کو مسترآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیزیں یعنی ایمان سے کر دی اور نکلیں چیزیں کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بناء پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیسری آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

۱) کیا کفر و نفاق جہد نبوی کے ساتھ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچانتا اور اس کو منافق خصوص تھا یا اب بھی موجود ہے؟ مسترآر دینا و طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کسی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے سچانے کی پہلی صورت قربانی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قلعی عقائد کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی ہے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام مسترآن کی اصطلاح میں ملحد ہے، **الَّذِينَ يُبَدِّلُونَ دِينَهُمْ** آیتاً تیناً، اور حدیث میں اُس کو زندقہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر و میل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماء اہل سنت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مومن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالک سے عمدہ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

۲) ایمان و کفر کی حقیقت آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا و **مَآ هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں پسند بائیں غور طلب ہیں۔

اڈول یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہو، اور جو چہیزان کے عقیدہ میں نہیں تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان باہموم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے! بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پر تو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلانی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و اوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس مسن کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہوں، اُن سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معزول ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور جھوٹ ہوا۔

۳) کفر و ایمان کا ضابطہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اور سورہ بقرہ کی تیسری آیت میں چکا **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَعْمٰتُ اٰمَنُ النَّاسُ** جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص مسترآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح







ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفید ہونے کا انکار اور اصلاح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر ففاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے احسان کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی پھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کو بھٹکا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ دوزخ سے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت نہ بنے گی اس کا تماشا آج کئی آنکھوں پر شخص ہر جگہ اور ہر وارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ٹری پڑ رہا ہے، تعلیم و تعلم کے ادوار کا حال گلاؤں گلاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب و تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اور پولیس کے خرچ سے قائم ہیں دفتری انتظامات کی بھول بھالیاں ہیں، مگر جرائم اور فتنے فساد و زبرد زبرد ہوتے ہی جاتے ہیں، دہر اس کے سرا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کو بھٹکا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسان کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جبرائیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیم و دیانت پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جبرائیم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار کی باگ کردہ جوائنٹ کے اسلحہ کے لئے نئے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ ہی سامنے آتا رہتا ہے کہ یہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں ردائی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گردوں کا علاج پہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ ہر رنگ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ لغزب اصلاحی اسکیم بھی سن کر رکھ لیتے ہیں، اور خاص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر [نَمَاتُخُنْ مُصْلِحِيْنَ] کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سب جاننے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ** (۲۲: ۱۲)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہو اور مصلح کون؟ جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و اصلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیت اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

**يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ**

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

**تَعَلَّمُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ**

تمہیں تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بھونکا اور آسمان کو

**بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا**

چھت اور آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے نکالے کھائے

**لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝**

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

## خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں جب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے ہو جتنے ہوا یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابل میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے۔



## معارف و مسائل

**رابطہ آیات** | سورۃ البقرہ کی دوسری آیت میں اُس دعا و درخواست کا جواب تھا جو سورۃ فاتحہ میں آئی ہے۔ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَسُوْا لَكُمْ مِنْ دِيْنِكُمْ طِبَاقًا** یعنی اے ایمان والے! اپنے دین کے لیے دو تہہ پہن لو۔ اس کے بعد شرعی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہ بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مومنین متغین کا ذکر ہوا، جنہوں نے ہدایات قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا۔ بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیسرے آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں قرآنی ہدایات کے مخالفت تھے۔ مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اس طرح سورۃ البقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر عمل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی عمر دہی اور قومی تقسیم نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہو، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات کو ماننے والے ایک قوم اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورۃ مجادلہ میں **حزب اللہ** اور **حزب الشیطان** کا نام دیا گیا۔

غرض سورۃ البقرہ کی ابتدائی تین آیتوں میں شرعی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کر کے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے، کہ اس میں خود کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔

پہلی آیت میں **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ** سے خطاب شروع ہوا، لفظ **النَّاس** عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا **اَعْبُدُوْا رَبَّكُمُ** عبادت کے معنی میں اپنی پوری طاقت و کسب و کار منسوب کرنا، اور خوف و محبت کے پیش نظر تائید و تائید سے دُور رہنا و مرجع البیان

ص ۳، ج ۱، اور لفظ **رَبِّ** کے معنی پر دروغ گار کے ہیں، جس کی باری تشریح پہلے گذر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ "عبادت کرو اپنے رب کی"۔

یہاں پر لفظ **رَبِّ** کی جگہ لفظ **"اَللّٰہ"** یا **"اسما جنتی"** میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ **رَبِّ** کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہو کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، جامع و بصیر، عقل و ادراک والا مہر انسان بنارے، اور اس کی بقا و ارتقاء کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کر چکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے پر اسے ہرگز تامل نہیں ہو گا، کہ یہ شان ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ تربیاتی انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بُت نے کئے ہیں اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جب کہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقا میں اُسی ذات و لذت کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت دوائی کر سکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کر رہی تو وہ بھی درحقیقت اُسی ذات کی تربیت ہو گی، جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ **رَبِّ** لاکر یہ واضح کر دیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری تہی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کیلئے اس جملہ کا معنی و مطلب جدا ہو، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہونے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہونے کہ لفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو، گناہگار مسلمانوں کے لئے یہ ہونے کہ گناہ سے باز آؤ اور کامل طاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہونے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو (روح البیان)۔

اس کے بعد **رَبِّ** کی چند صفات خاصہ کا ذکر کر کے اس مضمون کی مزید توضیح منبرادی گئی، ارشاد ہوتا ہے **اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ** میں **ذَاتَ الْيَمِيْنِ** تعین تھا، اور دروغ گار وہ ہے جس نے تعین پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں، اس میں **رَبِّ** کی وہ صفت بتلائی گئی جو اللہ جل شانہ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جاسکے، کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطن ماور کی تارکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل، پاک و صاف انسان بنا دینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُسی ذات حق کے کس کا کام ہو سکتا





کے کھٹے یا پھلے پھولنے میں بجز دلی مرنے کے اور کیا عقل ہے! ان باتوں سے جتنے والے بچکی اور اس سے کھٹے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اس سے وہ پھل پھولتا ہے، لیکن ان کا شکار کا پید کیا ہو انہیں اس میں کسی کا شکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے بات کو قدر ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب مقام میں پہنچا دے۔

آپ کے بچہ دیا کہ درخت کی پیدا نشی اور اس کے پھل پھولنے میں انکی سے آخر تک انسان کی محنت اور نوچر کا اس کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتے، انکی درخت کے راستے سے دور بے شمارے یا اس کو مٹا دینے سے پہلے، انکی درخت کی پیدا نشی، اس کا بڑھنا اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پھول کر اس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مصلحت کو نشتر و تان کچھ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

أَلَمْ تَرَ أَنَّا جَعَلْنَاهُ نُحْلُومًا ۚ مَا نَمْنَحُ  
 قُوتًا يَكْفِيكَ ۚ تَمُوتُ أَوْ نَحْيِيكَ ۚ وَهُوَ رَاحِمٌ ۚ  
 ﴿۱۰۰﴾ ہاں کہنے والے ہیں؟

قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو کھاتے والے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدا نشی اور پھول و پھل کے منظم سلسلہ میں انسانی مسہمت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح مصلحتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول میل کھٹنے اور ان سے انسان کی غذا تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف جانتے مانگ ہے، اور حقیقت میں سب کا دار صرف حق تعالیٰ کی قدرت کا علم اور حکمت ہے، بشر کا نتیجہ ہیں۔

خود یہ بیکر اس آیت میں تعالیٰ کی ایسی چابقت کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی نہیں، اس کے سبب ان دونوں آیتوں سے معلوم ہو گیا کہ انسان کو عدم سے وجود کا دار اور ہر اس کی فائدہ و ترہی کے سامان زمین اور آسمان، آرائش اور میل پھول کے ذریعہ پیدا کرنا تو حق میں مشائخ کے اور کسی کا کام نہیں، اور ہر ایک کو جو کچھ دے دے انسان کو اس پر شکیں کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور سچ میں صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی نکل نہیں کہ انسان کے وجود و دار اس کے بقا و ترقی کے سوائے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور ناقابل انسان کے اور کسی کی مشقوں پر کھڑا کرے اور دوسری چیزوں کی بسندگی میں مشغول ہو جائے، اور ان کو نہ اس کا تعلق انسان کو نہ ان پر فراڈ ہے۔

نعمت و مافردہ خصایا مبینہ  
 انعمت از تو میں انیسویں کی محبت

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سرمداس سے بنا چھوڑا کہ اس کی کائنات اس کی خدمت کرے، اور صرف رب کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ کرے، اس کا یہ رنگ جو جانتے ہے

بجز ماہر، باطل، و علمین کو چشم کو نیست  
 روز میں و راتیں جز و کرمی، با نیست

لیکن چنانچہ انسان نے وہی حرافت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بظلمہ پاؤں سے ایک نیکی کی ٹاسی کے بجائے ستر کردہ روئی نماز کی ٹاسی کرنا چھی ہے

ایک در پھول کے ہم جو کئے کا کھر کی نظام  
 ہم نے آواز ہی کو نہ سربا انہم

اس فرد کی غلطی سے خاتمہ والے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

فَلْيَعْبُدُوا إِلَٰهَهُمْ مُّخْلِصِينَ لَهُ دِينَهُمْ ۚ فَمَا لِكُلِّ فِتْنَةٍ أَنَّهُ لَا يَفْقَهُ شَيْئًا ۚ وَمَا لَكُم مِّنْ عِلْمٍ بِمَا يُغْنِي عَنْهُمْ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ وَلَٰكِنَّ الْغُلُوبَ ۚ  
 ﴿۱۰۱﴾ ہر جیسے وہ اپنی جہت چمے ہے، جان یا کرمی کو نیست سے محبت کرنے والا، مصلحتی حریف اور ہر دہا کے سامنے سامان مبتلا کر کے ایک قتل سے سینہ و میل، حساس اور عاقل انسان بنائے والا، مٹا دینے میں اس کے لئے زمین اور دوسری ضروریات کے لئے آسان بنائے والا، آسمان سے پانی پر سامان والا، پانی سے میل اور میل سے نرا صفا کرنے والا، ہر حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق و سزا کوئی ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا بہرہ ور کر سکا، شہر یا جاتے، اگر وہ دوسری ضروریات یا جاتے، اس میں اس سے بڑھ کر کوئی نکل اور جو حق تعالیٰ نے فعلی دنیا کو سخی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر تکلف سے دل نکالا جانتے اور اسی پر کھڑا کر دیا جانتے ہے

آنہی مجبوری کو نہ گمانند  
 کو نہ نظر انداز کو نہ نظر اسند

خاصہ یہ کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی مگاہوں کے اور تمام انبیاء کے سب سے حاصل تصدیق و یقین صرف ایک خدا کی عبادت و بندگی میں کام لینا جو کچھ اور وہ اللہ تعالیٰ نے نکل ہے، ہر اس کے تمام اعمال و احوال اور اس تعلق و مداخلت پر گہرا اثر رکھتا ہے، کیونکہ جو شخص یہ یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام عالم میں مشیت اور تمام چیزوں پر قہار صرف ایک ذات ہے، انیسویں کی مشیت اور اودا کے کے ذمہ کوئی اور حرکت کر سکتا ہے، ذکوئی کسی نوعی یا انتقامی پہنچا سکتا ہے، تو اس کی چوٹی توجہ ہر مصیبت و راحت اور بزرگی و ذراعی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی

جس کے ذریعہ وہ اس سبب ظاہر کی حیثیت کو پہچانے گا کہ یہ سلسلہ اسباب و عاقبت ایک پڑا ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کا فرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پٹے چنے والے ماتیائیں اروپ اگر اس حیثیت کو نہیں تو انہیں معلوم ہوتا کہ برق اور بھاپ آگے بھی کوئی حیثیت ہے، اور حقیقی طور اور طاقت برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اسی ذات حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے برق اور بھاپ پیدا کیے، اس کو کچھ نہ ملے بصیرت چاہئے، اور جس نے اس حیثیت کو نہیں سمجھا، وہ دنیا میں کتنا ہی دانشمند، فلسفہ کو کتنا سرگرم اس کی مثال اس دنیا کی بے قوت کی ہے کہ جس نے دیکھے یا نہیں پہچانے اور دیکھا گاڑ کے ہاتھ میں دھندلیاں مشرق اور مغرب میں، سبز کے دکھانے سے رمل بننے لگتی ہے اور شرب جھڑی دکھانے سے وہی تھر جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ ان جھڑیوں کی کوڑھ کرت نہ لگے، گئے اور کہے کہ جھڑیوں میں طاقت کی ایک چیز کہانی بڑی بڑی ہوتا، ہائی کی طرح جو محل گاڑی کی چلانا اور روکنا ان کا کام ہے، جس طرح دنیا میں یہ بات پرست ہے کہ اس چال کی جو بڑی نہیں، جھڑیوں میں طاقت ہے اور کام و حیثیت ڈھانچے رکھے، وہ کہہ دے، یہی کہ چلنا ہے، اور وہ کہے، بلکہ اس کا بھی نہیں سمجھنے کے عمل پر بند کیا ہے، اور جس نے ذرا غور کر لیا تو اسے و لغز آ جائے کہ یہ قدرت اس کا چلنا نہ ڈھانچنا، اور اس کا کام ہے، ظاہر کے عمل پر بند کیا، بلکہ اصل طاقت اس انیمیم کی ہے جو ان کے ساتھ پیدا ہو رہی ہے، اسی طرح ایک مرد خدا انسان کی سب جھڑیوں پر ہٹتا ہے کہ قدرت کو نہ ملے بھی نہیں پاتا، فکر انفرک سنسنی میں رہا رہے، ذرا غور کرے اور اسے کام نہ تو معلوم ہو گا، انیمیم اور آگ و پانی بھی کچھ نہیں، طاقت و قوت ہر بات اسی قوت کی ہے جس سے آگ اور پانی پیدا کیے ہیں اور اس کی طبیعت و امر کے باعث یہ سب چیزیں اپنی ذریعہ کی اوگر رہی ہیں۔

ناگ و بارو آب و آتش بندہ اند

اسم و قودہ و باحق فائدہ اند

میں اس کی حالت اور قوت کو نہ سمجھتا تھا، اس جملہ میں خدا تعالیٰ اختیار فرمایا ہے جو جنت کا بہترین سبب ہیں، دجا و پنی امید کے سن میں آتا ہے، اور اسے مارتے پر لڑا جائے کہ وہ جہاں کسی نعل کا دور باقی نہیں رہا ہو، وہ کہ جس کے نتیجہ میں جنت اور جنت کا حصول اور وہ آئینہ کے طاق میں ہے، مگر اس میں شے کو امید و دعا کے عزائم سے بیان کرنے کی سخت ہے، بتلا گئے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں طاقت و جنت کی جہت نہیں بن سکتا، بلکہ فعلی جہت آدمی اس کا اصل سبب ہو، ایمان و عمل کی توین پر اس فعلی خداوندی کی علامت ہے، جنت نہیں۔

مشرکہ و عبیدی دنیا میں اس دہان اعتدال و حیدر اسلام کا سبب پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ان سکون و سلطان کا شام ہے، ایک نظر پر نہیں بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے، انسان کی تمام شکلات کامل اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ، اور ہر قسم و شکل میں اس کا جگہ ہے، جو کہ مشرق و حیدر کا ماحول ہے کہ عناصر کے کون و فساد اور اس کے ساتھ تحولات و حشرات ایک ہی کی حیثیت کے حامل اور اس کی جھلک کے مظاہر ہیں۔

ہر نفسیر جو طیب کی آواز

ہر عقدہ میں ہیں ہزاروں ناز

اور وہ ہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب و دماغ پر چھا جائے اور اس کا حال میں جانتے تو وہ دنیا میں اس کے لئے جنت ہیں جانتے، گئے، اس لئے جہان کے اسناد و ہر شاہ کی بنیادیں ہیں منہدم ہو جائیں گی، جو کہ اس کے سامنے یہ سبیل ہو گا کہ

ازدادان خلعت و دشمن دو دست

گردل چرو و در لعر مشرب اوست

اس عقیدہ کا ایک ساری دنیا سے بنیاد ہے، خوف و خطر سے بالا قرندگی گزارنا ہے، ان کا عالم یہ کہ اسے

مردہ پر پڑنے رزی زوش

امید و ہر کسین ناشد و کس

کلام اللہ اور جو کہ توبہ کا ہے اس کا بھی منہدم ہے، مگر یہ بلا ہے کہ توبہ کا بعض بنیادیں اور اس کے لئے اپنی نہیں، بلکہ ہے اس کے اس کا بہترین اور یقین کے ساتھ جتنا ضروری ہو، کیونکہ جو خدا و احد و پندہ بود و احد گفتن

کلام اللہ ان کے پٹے چنے والے قوت آج دنیا میں کر ٹول ہیں، اور اسے ہی کر کسی زمانے میں سامنے نہیں ہوئے، لیکن عام طور پر یہ صرف ذاتی نیت خرج ہے، جو خدا کا گناہ ان میں دہائیں در دق کا بھی حال ہو گا، جو پہلے بزرگوں کا حکام نہ کر لی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کے صوب کر تھی، لیکن اس قوت کی حدود کی کمی ہے، ان پر خدایا تو کتنی جہت، ذکوئی بڑی سے بڑی دولت و طاقت ان کے قلوب کو خلعت و حق اپنی طوق جتنا کھنکھی، ایک پیچہ کر دیا، جو کہ ساری دنیا کو لگا کر کہتا تھا کہ ہم پر دیکھ نہیں جانتے تھے، کیونکہ وہی خلق کائنات و دنیا کے ہر شے کا پانی جو خودی کی ذہن میں دنیا پر چھانکے ان کی طاقت و قوت اسی توفیق و حیدر میں مغرور، اللہ تعالیٰ ہیں، اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔



## رسالت محمدیؐ کا اثبات

بذریعہ اعجازِ شکرانہ

وَلَا تَكُنْمُ فِي سَرِيْبٍ مِّمَّنْ سَأَلَ تَعَالَى عَنِّي مَا قَالُوا يَسْؤِرُ يَتِيْنٌ

اور اگر تم شک میں ہو اس حکایت سے جو انصارِ ایمان نے اپنے بندے پر فرمے کہ اے ایک صورت

يُنِيْلُهُمْ وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵﴾

اس میں سے اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو

فَاِنْ كُنْتُمْ تَقْعَلُوْا لَنْ تَقْعَلُوْا فَاَقْوَمُ الشَّاكِرِيْنَ وَكُوْدُهَا الشَّاكِرِيْنَ وَ

پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور اگر نہ کر سکو گے تو بہر حال اس آگ سے جس کا اپنے میں آدمی اور

الْحِجَابُ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِيُخْفِيَ بِيْنَكَ

پہرہ میں تیار کر دینی ہے کہ اس قدر سے واسطے

## خلاصہ تفسیر

اگرچہ وہ کچھ لیجان میں جو اس کتاب کی سب سے جو ہم نے نقل فرمائی ہو اپنے بندے خاص پر ہوا چھ پر ہوا کہ ایک عدد دیکھا اور اس کا نام نہ ہو دیکھ کر ہم بھی عربی زبان جاننا چاہتا ہوں اور اس کی نظم و نثر کے مشابہت پر بھی غور کیا اور علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی اور جب اس کے بارے میں شکرانہ کیا گیا کہ وہ اس کی بھی مشق نہ بنا سکو تو بشرطِ انصاف یہ حال ثابت ہو جائے گا کہ یہ مجھ سے بھی زیادہ شکر اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں اور بلاؤ اپنے حاضرین کو کہ جو خدا سے لگے اور ایک چیز ذکر کر کے ہیں اگر تم سچے ہو پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور قیامت تک ایسی نہ کر سکو گے تو پھر خدا کے پیغمبر و مددگار جس کا انبیا کرمی اور پیغمبر ہیں تیار کر دینی چاہئے کہ اس قدر سے واسطے

## معارف و مسائل

یہ سورۃ بعشرہ کے نبیوں اور پیغمبروں کی ہے ان میں سے پہلی دو آیتوں میں قریب حدیثِ شکرانہ اور دونوں آیتوں میں رسالت کے احوال و مشرطنہ کی تصریح ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ہے اور

محمدیؐ کا اثبات ہے اور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حاجت تو فرمائی ہے کہ آیا ہے اس کے دو عدد ہیں ہونیدہ اور رسالت پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند خصوصیات کا ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی اور دونوں میں اللہ تعالیٰ کا بلاؤ چھ پر ہوا کر کے حضرت علیؑ علیہ السلام کی رسالت ثابت فرمائی گئی ہے اور طریق اثبات دونوں کا ایک ہی ہے کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام ذکر کر دیے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا، مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا آسمان سے اپنی انوار پانی سے پہلے پھول پیدا کرنا۔

اور حضرت امام احمد رضاؒ نے فرمایا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو زمین و آسمان میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام بھی کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں کر سکتا اور دونوں کی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثال و نظیر نہیں ہے جس طرح زمین و آسمان کی بنیاد پر ہائی برساتے اور اس سے پہلے پہل بھلے بھلے سے انسانی طاقت کا عاجز ہو کر اس کی دلیل جن کی یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں ایسی طرح کلام بھی کہیں انگریز پیش کرنے سے پہلے خود جن کا عاجز ہو رہا تھا اس کی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جس مخلوق کا نہیں اس آیت میں فرمائی ہے کہ یہی دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں بلکہ یہی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو نہیں سکتے ایسا کلام ہم پیش کر کے یہی قدرت پر ہونا چاہئے اور کلام تو کیا تم اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی تفسیر دشمن بنا کر دیکھا اور اللہ سے بچنا ہے یہ عز آسانی دی ہوئی ہے کہ تمنا کوئی آدمی نہ بنا سکے تو تمہیں سخت سزا ہے سامنے جان سے لے کر تاج اور دو گنا جہنم کو اور ایک زمین اعلیٰ کا فرض کر کے اس شکرانہ کی چھٹی سی صورت کی مثال بناؤ۔

پھر اس میں نہیں کیا دوسری آیت میں اللہ کی تعریف و ثناء کی مجال نہیں کہ اس میں ایک صورت بنا سکو پھر وہاں سے فرمایا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا جہنم کو کس کرتے ہو اور یہ صفت اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے فوق اور بلند ہو وہ جس کی قدرت کا سبب یہ عادی ہے وہ پھر اس پر ایمان نہ لائے انھوں نے نہیں اپنا ٹکڑا کرنا ہے اس سے بچ۔

حاصل یہ کہ دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسول کریمؐ علیہ السلام کا اعلیٰ معجزہ بہت لاکر آپ کی رسالت اور حقانیت ثابت کیا گیا ہے اور دونوں اعلیٰ علیہ وسلم کے معجزات کو بظاہر اور جہ سے بڑے حیرت انگیز ہیں لیکن ان سب میں سے اس جگہ آپ کے علمی حیرت انگیز قرآن کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ یہ کلام کا سبب یہ معجزہ قرآن ہے اور اس معجزہ کو انبیاء علیہم السلام









نبیوں کو یہ افسانہ کلام نہیں بلکہ افسانہ کلام ہے جس کے کام یہ افسانہ کلام کی نگار انسان کہا سادی  
حکون کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صحت انتہائی نہیں کہ جب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں  
سنبے اس کے پیش کیے ہوئے کلام افراط کیا، اور جن میں سے منبیت مزاج تھے انھوں نے اس  
افراط کا اظہار کیا، پھر ان میں سے کچھ لوگ سلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی آباؤ اجداد کی پابندی کا  
نئی حد منافات کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے بازو اور افراط کے محروم رہے، مگر افراط  
کی پہلی ان واقعات پر مشابہ ہے، میں میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں جس سے افسانہ  
ہو سکے کہ پھر وہ نے اس کلام کے بے غلط نہ لکھیں گے کہ اس کلام کی مثال پر جس  
کرنے کا میں رسوائی کے خیال سے چھوڑا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا کرتے  
بابر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہوئے لکھا، اور کلام صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا کرتے ہوئے لکھا،  
افراط خوب سے چھانٹے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام میں سے کفر فلتان ہو گیا کہ  
اور غالب خیال ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے، اس کے اندھا دلی نہ ہو سچے کفر فلتان سے لکھا مجلس  
افراط کیا اس اجلاس میں خوب سے بڑے بڑے سردار موجود تھے، ان میں ولید بن مغیرہ بھی سب  
بڑے اور عقل میں ممتاز کچھ جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو چٹکل پریش کی کتاب افراط لکھنے  
لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پرچیں گے تو ہم کہیں! نہیں! آپ  
کوئی ایسی بات کہیں کہ ہم سب وہی بات کہہ دیں، یاد ہو کہ خود ہوائے بیاد میں اشتکاف  
ہو جائے، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کو کیا کہنا چاہئے!

لوگوں نے کہا کہ ہوائے خیال میں سب سے کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ماضی و حال میں  
آپ کا کلام بے گناہ نہ ہو، ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا بزرگ نہ کہنا کہ لوگ جب ان کے پاس  
جائیں گے، اور ان سے ملاقات و گفتگو کریں گے، ان کو ایک فصیح و بلیغ ماضی و حال انسان چاہیں گے تو کہیں  
نبیوں ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے، پھر کہ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو کہیں کہ وہ ایک شاعر  
ہیں اور دینے اس سے بھی سخت کیا، اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام نہیں کہے وہ تو شاعر شاعری کے ماہر  
ہیں، انھیں نبیوں ہو جائے گا کہ شاعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سب لوگ صمیم ہو گئے  
بھیمیں گے، پھر کہ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کہنا نہ سزا دیں جو فیاضین و جنت سے شکر  
فیض کی خبریں دے رہے ہیں، اور نہ کہا کہ یہ غلط ہے، بلکہ کہ جب لوگ ان کا کلام نہیں کہے تو پھر چل جائیگا  
کہ یہ کلام کہیں کا نہیں ہے، وہ پھر کہیں نہیں ہی پڑا، ہمیں گے، اس کے بعد قرآن کے بڑے ہی پڑ  
ہیں شیروں کا تاثرات تھے ان کو ان افراط میں بیان کیا،

نہاں کی قسم احم کوئی شرع شاعری اور شاعر جو ہے میرے برابر واقع نہیں،  
نہاں کی قسم اس کلام میں غلط حالات ہے اور ایک خاص روایت ہے، اچھا کسی شاعر  
افراط و تفریط کے کلام میں نہیں پاتا۔

پھر ان کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ کی پہلی کتاب کی پہلی جگہ کیا کہی؟ اور ان کے اپنے میں لوگوں  
سے کیا کہیں! اور دینے کا میں خود کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا، پھر میرے سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ  
کہتا ہوں تو حق ان کو سنا کر ہوگا کہ اپنے جادو سے آپ بیٹے اور میں ہی کی تفریق ڈال دیتے ہیں۔  
قوم اس پر مطمئن اور مطمئن ہو گئی، اور اس سے یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چارہ کہیں ہو کہ ان کی  
وفا تھا! اور ان خوب کے لوگ آئے قرآن شستا اور میرے مسلمان ہو گئے، اور افراط خوب  
میں اسلام قبول کیا اور خاصا نصیب کر لیا!

اس طرح ایک قریبی سردار لغز بنی حادث نے ایک اور پہلی قوم کو خطاب کر کے کہا،  
تکے قوم قریش! آج تم ایک معصیت میں گرفتار ہو کر اس سے پہلے کہ میں اس معصیت سے  
سابقہ نہیں پڑا، خدا کی وصل علیہ وسلم، تمہاری قوم کے ایک لڑکا ہی تھے، اور تم سب ان کے ساتھ  
واحد صلی اللہ علیہ وسلم، اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سنا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے  
اب جب کہ ان کی سر پر سفید بال آئے گئے، اور انھوں نے ایک بے مثال کلام اللہ کی رحمت سے چلنے کیا تو  
خدا ان کو جادو کر دینے گئے، نہاں کی قسم! جادو کر دینے، ہم نے جادو کر دیا اور جادو کر دیا، ان کے ساتھ  
تھے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ افراط و تفریط میں!

اور یہی حق ان کو ان کی کہنے گئے، نہاں کی قسم! وہ ان ہی نبی نہیں، ہم نے بیت کا بنوں کو کیا اور  
ان کے کلام سے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی نہاں نہیں۔

اور یہی حق ان کو شاعر کہنے گئے، نہاں کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شاعر شاعری کے تہم  
خون کو سیکھا، ہم نے اور جڑے بڑے شاعر کے کلام ہیں! وہ ہیں، ان کے کلام سے اسی کو کوئی نہاں  
نبیوں، پھر یہی حق ان کو بنوں جانتے ہو، نہاں کی قسم! وہ بنوں بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنوں کو کیا  
بھلا، ان کی جو اس تل سے، ان کے خفاں اور خفا کلام تھے ہیں، وہاں پر کچھ نہیں مانے میری قوم تم  
انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں طرز کردہ، ہر سر پر نگاہ سے کی چیز نہیں! ان خاصا نصیب کر لیا،  
حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی! نہیں! ایک مرتبہ منظر تھا، اس نے دیکھا کہ  
مجھے بتا کہ میں ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے، میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ  
اس کے اپنے میں کیا بات دے سکتے ہیں! بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی ان کا بنوں کہتا  
کوئی جادو کر کہتا ہے، میرا بھائی! نہیں! خود جادو شاعر اور کلمات و فیرو سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے

کہا کہ ہاں تک میں نے خود کیا اور کسی سے سبب نہیں ملا، میں اس کا کلام نہ شریعت نہ کہا نہ بکرم نہ زنا نہ کلمات میں بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

اور فرمایا میں نے اس کلمات منکر میں نے کلمہ کا سفر کیا، اور سید جہرام میں اگرچہ میرا تھیں وہ زمین نے اس طرح کنارے کر سوائے قرآن سے کہانی کے پانی کے حیرت پیش میں کیا نہیں گیا، اس تمام وہ جس نے مجھے یہ کہہ کر حلیفیت معلوم ہوئی تو ان کی شفقت محسوس کیا، درخصائص ص ۱۱۲ ج ۱۱

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے قرآن اور اس کے قصدا اور امانہ کے کلام بہت سے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور ہنر کے مقالات بہت سے ہیں، مجدد مصلیٰ علیہ وسلم کے کلام کی مثال میں آج تک کہیں نہیں ملتی، مگر سب میں بڑا بات مانو، اور آپ کا اتباع کرو، چنانچہ کلمہ کلمہ کے سال میں ان کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار کوئی منکر ہو کر مسلمان ہو گئے، درخصائص ص ۱۱۲ ج ۱۱

اسلام اور حضرت مصلیٰ علیہ وسلم کے سبب طے دہش اور قبیل اور ارضیں میں شریف و طہر ہو کر لوگوں سے چھپر کر ان سے شکر کرتے، اور اس کے عجیب و غریب سبب سے دل میں دلچسپی اور توجہ سے متاثر ہوئے تھے، مگر جب قرآن کے لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو اپنا بے نظیر بنائے تو اس کو قبول نہیں کرتے، اور اب وہی کہا جا رہا ہے تھا کہ میں معلوم ہے کہ یہی عہد ممانت میں بنائے

تعبیر میں ہمیشہ سے وقایت اور صافراہہ مقابلہ پلٹا، درحقیقت اس کا کلام میں آگے بڑھتا ہوا ہے، یہ بھی اس کا راز ہے، یہ اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر پیشیت کے ناک میں قواب وہ کہتے کہ ہم ہم ایک ہی چیز ہوا ہے، تو اس سے وہی آئے ہے اب یہ اس میں کیسے ان کا قیام نہ کر رہی، میں بھی

اس کا استمرار نہ کر رہا تھا، درخصائص،

ملاحظہ کلام یہ کہ اگر قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہہ دے وہ اپنے دماغی اور عقلی کے سبب سے کیا بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے بھر کا حقیقی طور پر اعتراف میں کیا ہے، مگر یہی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا وہ بے بلکہ ساری وہ نیاس کا کل

لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قرآن اور سید جہرام کے مقابلہ میں جان و مال اور اولاد اور سب کچھ قرآن کرنے کے لئے تو وہ نیا ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے، وسط اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے مال و اموال و احوال کے باوجود صنعت و مہارت سے و جہوش کے اس زمانے تھے، جب انھوں نے قرآن کریم سن کر یہ سمجھا کہ وہ حقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں دیکھتے تو محسن و حامل اور کائنات میں کے طور پر کوئی کلام نہیں کرنا چاہئے، مگر عاقلانہ طور پر وہ یہی جانتے

تھے کہ ہم نے کوئی سپر تنبیہ بھی کر دی تو جسے وہ سب کے قصدا و امانہ اس مقام میں نہیں قبول کر رہے تھے، اور خواہ خراہ رسولی ہو، اس نے اپنی قوم نے سکوت میں چھپا کر دیا، اور عزرائیل و عزرائیل کے انھوں نے عاف طور پر امتداد و تسلیم بھی کیا، چنانچہ کو دفاعی پہلے بیان ہو چکے ہیں، اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ کہ وہ سب کے سربراہ اسعد بن زرارہ نے آنحضرت مصلیٰ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے سامنے اعتراض کیا کہ

ہم نے جو دعویٰ محمد مصلیٰ علیہ وسلم کی کائنات کر کے اپنے لئے مانا تو فرشتا اور ملکات خراب کیے ہیں، میں نے اس کا ساتھ کیا ہو کہ وہ جاسوسہ اللہ کے رسول ہیں، چاہے کچھ نہ ہو، یہی در کلام وہ مانے ہیں کہ کلام میں یہ سب

درخصائص ص ۱۱۲ ج ۱۱

نبی علیہ وسلم کا ایک شخص مصلیٰ علیہ وسلم میں نبیہ رسولی اور مصلیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ قرآن سننا، اور چند سوالات کے لئے اس کا جواب، حضرت مصلیٰ علیہ وسلم نے مفاد پایا تو یہی وقت مسلمان ہو گئے، اور عمر بن قثم میں واپس آئے، تو لوگوں سے کہا،

میں نے قرآن و قرآن کے قصدا و امانہ کے کلام میں نے سب سے بڑا خیر کے کلمات سنے کا خیر ہوا ہے، مجیز کے مقالات سنا دیا، مگر مصلیٰ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا، جب میری بات اور ماہر کا اتباع کرو، انھیں کی عزت،

کتھیں یہ ان کی قوم کے ایک بڑا آدمی تھا، مگر اس نے قرآن حضرت مصلیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ کر سکتا، درخصائص ص ۱۱۲ ج ۱۱

یہاں فرما دیا، مصلیٰ علیہ وسلم نے انھیں ہی لوگوں سے متعلق نہیں چاہتے، کہ معاملات سے یہ سب کو بھر جانہ دیتے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہرگز رسولی اور مصلیٰ علیہ وسلم کی مخالفت میں تھے ہوئے تھے قرآن کے متعلق ان کا بھی جی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اقبال اور گرا

پر نہ کرتے تھے۔

اور سید بنی نے قصداً انھیں کوئی نہیں بولا، بلکہ یہی نقل کیا ہے کہ ایک عربی اور قبیل اور اپنی اور انھیں میں شریعت راست کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ جبکہ رسولی اور مصلیٰ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک صحابہ، ملوہ، مٹلا، ایک کی دوسرے کو خبر دے، اور انھیں ملوہ و مٹلا

ہمیں چھپر کر قرآن سننے گئے، تو اس میں اپنا اپنے کو ہونے کا ساری راست گذر گئی، جب تک ہر گئی تو سب





دوست اور ولی کہتے ہیں تو انھیں اللہ کے پاس جانے سے محنت ہونا چاہئے، ورنہ راست کی طرف سے کہہ دیکھاں اور پھر لادنا فرمایا،

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ فَتًا ۝۲۵

موت کی فتنہ کاری کے لئے مشکل نہ دے گا، خداوند تعالیٰ لوگوں کے لئے جو قرآن کو پیش کرنے والے تھے، فتنہ کرنے کے ارشاد کی وجہ سے ان کو فتنائے موت میں غفلت و بے پروائی کی وجہ سے خود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا ہر موقع فراہم کیا، فتنہ کرنے والے کو کمالیہوں کی شکل میں مسلمان کرتے۔

مگر یہودیوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی فتنہ کرنے کو چاہتا تھا ان کے دل جاننے تھے کہ قرآن پہلے اس کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی، مگر موت کی فتنہ کاری اس وقت کریں گے تو فوراً وہ لوگ بھی اس لئے قرآن کے اس کیلئے ہوتے پہلے کے بارگاہ کی پیروی کی بدست نہ ہوں گی کہ ایک مرتبہ زبان سے فتنائے موت کا اظہار کر دے۔

اور خاص کیفیت جو جو فتنہ کرنے سے پہلے ہر خاص و عام اور غریب و غنی کا فتنہ پر سا تو یہی وجہ فارغ ہوئی ہے، یہی حضرت جبریل علیہ السلام کو اس واسطے لائے سے پہلے پیش آیا کہ انسانی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تا وقت قرب میں سورۃ الفجر پڑھنے سے روکنا، جب آپ آخری آیات پڑھتے تو جبریل کہتے ہیں کہ یہ لوگ گویا ڈھلے لگا دار یہ سبک پہ چلا رہے تھے کہ میرے دل میں اس سب سے بڑا اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں

أَمَّا حُجْرٌ ۖ وَسُورَةٌ ۚ  
أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُ ۚ  
يَوْمَ الْفُتُورِ ۚ إِنَّ تِلْكَ لَآيَاتُ يَوْمٍ  
أَمَّا عَذَابٌ مُّهِينٌ ۚ  
أَمَّا حُجْرٌ ۖ وَسُورَةٌ ۚ

اے ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سنتے سے کوئی آگاہ نہیں، بلکہ یہ تازہ یاد رہتا چلا آگیا ہے اس کا شوق اور پڑھتا ہے، اونٹنی کوئی بستر سے بڑا اور بڑا کتاب کے پہلے اس کو درد چڑھا جائے تو انسان کی طبیعت آگاہ ہوتی ہے، پھر پڑھنے کو ہی چاہتا ہے کہ دیکھنے سے صرف قرآن کا فائدہ ہو کہ جتنا کوئی اس کو بار بار پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و دلچسپی بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلام الہی ہونے کی ایک علامت ہے۔

نویس وجہ اے کہ قرآن نے اعلان کیا کہ اس کی حفاظت کا زور خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے

وہ قیامت تک پڑھیں اور ان کی تفسیر و ترمیم کے بانی رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب قرآن نازل ہوا ہے تو چودہ سو برس کے قریب ہوئے کو آئے ہیں ہر قرن ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا فتنہ قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک نیریز ہر کہ خطی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد و عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ طبعی بنے، بڑا عالم اگر کہیں ایک نیریز ہر کہ خطی کر جائے تو خدا فرماتے ہیں وہیں خطی پڑھیں گے، دنیا کا کوئی مذہب سب مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا ہر سو حصہ بھی پڑھیں گے، بہت سے شاہد کی کتابوں میں قرآن ہے، چھپتا بھی نہیں بڑھتا، یہ کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن ہر زمانے میں معنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، لاکھ تالیفات شہادے کے ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے مگر ان اور کافروں کے بہت کم رہے، اور دنیا کی نشر و اشاعت بھی جتنے مسلمانوں کو حاصل ہے وہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی مستند حصہ نصیب نہ تھا، گمان ہوا کہ اگر اس کو دیکھیں تو کس قسم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اتنی شائع نہیں ہوتی نہ قرآن مشائخ ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابوں اور محفوظی پر موقوف نہیں رکھا، بلکہ جہاں جہاں وہ موجود ہو جائے گا امکان ہو، بلکہ اپنے ہی ہندوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگرچہ ساری دنیا کے فتنہ آں (معاذ اللہ) تازہ کر دینے جائیں تو اللہ کی یہ کتاب ہر کسی اس طرح محفوظ رہی، چند حافظ نظر کر رہے ہیں تو چند نگینوں میں پھر ساری کی ساری کتب جانتے ہیں، یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن کی کا فائدہ اور اس کے کلام الہی ہونے کا ثبوت ہے، کہ جس طرح اللہ کی کتاب ہمیشہ اپنی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تعزیر نہیں چل سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دوسرے اور تعزیرات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ سینہ آتی رہے گا، قرآن کی یہ بیحد نگینوں چودہ سو برس تک شہادہ میں آچکے ہیں، اور قیامت انشاء اللہ تعالیٰ کوئی رہے گی اس کے لئے جو کہ اللہ تعالیٰ نے کلام الہی ہونے کی ہر گامی کو شکست شہید کرنا ہی مقصود ہے۔

اور علوم و معارف میں جن کا فائدہ آج تک کسی کتاب کے لیے دئے اور امکان کو دوسری وجہ اے کہ اتنے مختصر علم اور دوسرے علوم میں اتنے علم و فہم جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی راقی ضروریات کے حامی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق ہر وقت اور ہر بہتر نظام پیش کرے، فہم و برائی زندگی کے لئے کرشماتی اور دوسری زندگی کے تمام لوازم و غنائات و حاجات اور دوسرے اسباب و مآلک کے ہر پہلو پر مادی نظام پیش کرے۔





أَنزَلْنَاهُ فِي الْقُرْآنِ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ

فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ مَلِكٌ مُّسْتَعِذٌ مُّغِيبٌ

نیک طرفہ و قرآن کے کھیلنے والے معجزات میں اس کو کام بھی ہونے پر شاہد ہیں اور دوسری طرف اس کے معنائیں و معجزات اور حقائق و معارف پر نظر ڈالنے تو وہ اس سے زیادہ عجیب و غریب ہوتے والی چیز ہے۔

تو دل مشرقی کے ابتدائی دور کے چند سال تو اس حالت میں گزرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھیلنے پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلط طور پر لوگوں کو اصول قرآنی کی طرف دھت دیتے تھے، جو میرے تلامذہ اصول اور حقائق کے تشریح پر کچھ غائب و غیبت بھی مشرق کی جاتی تھے۔ مگر مشرق کریم کے بزرگ قانون کی حقیقت کا کوئی امکان نہ تھا۔

بہت مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے انفرادی کامزاد کہا جاتا ہے۔ جس میں مشرقی نظام کی کھلی تعلیم اور تفریق کی کوشش اور قرآنی تعلیم کا کام کیا جاسکتا تھا۔

لیکن اُن دس سال میں یہی آپ کا پہلا اسلام پر نفاذِ اہلین قرصوں کا کام تھا کہ ابتدائی چھ سال دشمنوں کے فرخ اور منافقین اور دہم و دھوکہ کی سازشوں سے بچ کر وقت بھی کر کے تعلیمی کام اور اس نظام کو جاری و نہایت کے نظاموں سے مختلف ہے۔ اصل طور پر ناگزیر کے مسلمانوں کے خلاف سب بڑے بڑے معرکے اٹھیں چھ سال کے اندر پیش آئے۔ غزوہ بدر، احد، احزاب و غیرہ سب اسی مدت کے اندر ہوئے۔ ہجرت کے چھ سال دس سال کے لئے حدیث کا صلح نامہ لکھا گیا۔ صرف ایک سال اس معاہدہ پر قرطبہ عرب قائم رہا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا۔ اور دیکھ چکے وہ چار کا سلسلہ شروع ہوا تو چار۔

ظاہر سبب میں صرف یہ ایک وہ سال ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے ملے۔ تو قرآن کی دعوت کو کام کر سکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کر سکیں، اسی عرصہ میں کھینچے بڑے بڑے سلاطین و زبائو غلط لکھے، قرآن کی دعوت ان کو پورے ہوئی، قرآنی نظام کو کام کرنے کے لئے سہی فرمائی اور یہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر کا ایک سال اس آج کی حد تک پہنچا ہے۔ وہ ہے جس جن میں تاریخ حکم کا جہاد بھی پیش آیا اور حکم کو راجع ہوا۔

اب اس چار سال کی قلیل مدت کو دیکھتے اور مشرقی کے اس غزوہ راثر پر نظر ڈالیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً چوبیس ہجریہ العرب پر ان کی حکومت تھی ایک طرف مصر و مدینہ و دوسری طرف عراق تک، تیسری طرف مدینہ تک پہنچ چکی تھی۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کریں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آج سے اس کو کسی نظر انداز کیا جاتا ہے کہ آپ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے بھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی مجبور کیا ہے کہ سادہ دنیا آپ کے خلاف علی بادشہ کریمین جب یہود و نصاریٰ سب کے سب مل کر آپ کو اور مشرق و مروجین سے ملنے پر تلے ہوئے تھے، بالکل ساڈا کر فضا ان اپنے تو کسی ایک نے نظام ملے قانون اور نئے اصول کی پہلے تو وہیں در تریب ہر اس کی تعلیم کو نہیں ہر اس کی تعلیم کے لئے ایک ایسا ساز و سامان، اور ملک ہر اس کی امن و سکون پہلے کرنے کے لئے کتنی محنت، کتنا سرمایہ دیکھنے کوئی اور کاروں اور کاروں آ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صابرا کر ام کو حاصل تھے، اگرچہ کہ نظاموں کو سامنے رکھ کر سب لگے تھے تو ایک اندھ کی سی آنکھیں کھلی جائیں گی کہ یہ نئے ذوق و ترقی و معاشی تہذیب و تمدن کا جس طرح کا جھرس نہیں ہو سکتا۔

ایک مشرقی آل کے پورے دو اور آل کی تعداد ایک کتابیان ایک تہا بہت طویل بحث کا علم امت نے اس پر سیدوں سے قبل کر میں ہر زمان میں مقلد نے ان میں تصنیف فرمائی ہیں۔ سب پہلے جبری حدیث جبری میں مانتا ہے نظر القرآن کے نام سے متخیل کتاب بھی ہے جو چھ صدی کے اوائل میں ابو حنیفہ و واسلی نے بنام اعجازِ ان کتاب تصنیف کیا جبری صدی میں ابن تیمیہ نے ایک مختصر رسالہ بنام اعجاز القرآن لکھا، قاضی ابوبکر باقلانی نے پانچویں صدی کے اوائل میں اعجاز القرآن کے نام سے ایک فہرست دوسرا کتاب بھی مختصر بنام الدین میں ملتی ہے، اُن کے بعد اور خصوصاً اہل کربلا میں امام ابراہیم نے تفسیر جعفریہ بنام الدین میں شرح و بیس کے ساتھ اس مضمون کی تفسیر بھی لکھی، آخری دور میں جعفریہ نامی روضہ نے اعجاز القرآن کے نام سے اور دیگر بے شمار رضا عصری نے اسی ائمہ کے نام سے متخیل جامع اور مصنف لکھے اور وہ بان میں اساتذہ کرام نے اسلام حضرت مولانا امجد علی خاں نے ایک رسالہ بنام اعجاز القرآن تصنیف فرمایا۔

یہ بھی مشرقی جمہور کی خصوصیات میں سے ہے کہ ایک ایک مسئلہ پر کھنڈن و کھنڈن کے علاوہ مستقبل و حال میں بھی جن میں کہیں کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ عرض کرنا ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس نگار بیان نہیں ہو سکتا لیکن بتانا یہاں ہے کہ وہ ایک صنعت مزاج انسان کو اس پر مجبور کر دیتے کہ کتنے کافی ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام انسانی مجبور تسلیم کر لے۔

## چند شبہات اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب قرآن کے مقابلے میں بہت کم اور مفادات نگاہ سے کمزور و سطحی ہے۔

یہی گمراہی اسی انصاف سے کام لیا جائے تو اس امکان کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ کمزور یا بائیس ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں مشرکان کے سامنے والے کمزور و کمزور ہو کر رہے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو کر زوال پذیر شراعت جتنے مشرکین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے سامنے دایوں کو کھڑے کر دینا اس کا کافی ثبوت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان مشرکان کو تائب بنانے والے تھے۔ اُن کو جیلینج و تپتے، پیر و پیر و لاکھ تپتے، اور انھیں انھیں اسلام میں کے مقابلے میں جانا مال اور دوسرے کچھ مشرکان کے سامنے لائے گا وہ نہیں ہیں، اگر انھوں نے مشرکان کو پہنچے قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کرنے سے پہنچ کر دیکھیں کہ انھوں نے سادہ دنیا میں شائع ہوئی، اور وہ زمانہ میں مشرکین قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی دھوکہ دینے والے نہیں تھے۔

اسلام کے قرآن اول میں صرف ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآن آسمانی ہے کہ یہ پسند ہے حیاتی کے لئے مفید ہے۔ کلمات گہرے کیا خاکہ ہے قرآن آسانی کی شکل ہے، مگر دنیا جتنی ہو کر ان کلمات کا کیا اثر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے، وہ کلمات ایسے شریفانہ غیر مذہب تھے کہ کسی مذہب سے ان میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا، اور یہ حال ہے کہ جو وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوئے چلے آئے ہیں، اگر کسی کو دیکھیں کہ کوئی اچھا کام مشرکان کے مقابلے میں نہیں کیا جوتا، تو کوئی بد دھرمی کو دنیا کی آجائے کہ جس کو یہ صلا دیئے، اور وہ مشرکین قرآن اس کو ہرگز پرانی دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلے پر عزم و ہمت سے قرآن کے سامنے پہنچے کہ جواب میں انھوں نے طبع و کلام کی باتیں کہیں جن کو مشرکان میں نقل کر کے جواب دیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں ہو کر ان کلام مقابلے میں کر کے اس کے قرآنی کلمات سے کہہ کر ان کو جواب دیا، ایک دوسری نظم کہ وہ نہیں دیکھا کہ کیا کرتا تھا اور یہ کلمات و تفصیل پر مباحثہ تھا، جس کی کسی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا، صاحب کے کہہ جانے کے بعد وہاں سے یہ نہیں دیکھا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی حقائق ان سے نہ سمجھتے تھے مشرکان نے ان کا یہ اعتراض نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سے کہنے کے لئے نسبت کرتے ہیں وہ خود کو دیکھیں، اور ان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ مشرکان کوئی کتاب بھیجے کہ سورۃ قلم کی آیت غیر ۱۰۰ دیکھیں،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

## آیت قرآنی و قرآنی حقائق

سورۃ لقمان: ۱۷-۲۴

یہ لوگوں نے قرآن کی قدرتی کے جواب میں یہ کہا کہ:

وَلَقَدْ اَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ۱۷

لیکن کوئی ان سے یہ کہے کہ یہاں انھیں نہیں قرآن کے مقابلے کے لئے سارا قرآن ہی چاہئے کہ انھوں نے قرآن کیا، جہاں وہ ان کی مشرکان کی دسی داری انھیں اس کا مشعل کلام سمجھنے دیکھنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس قسمی کے بعد ہم نے اس کی شکل کلام میں شریفانہ سہ سہ کر دیا!

خلاصہ یہ کہ مشرکان کے اس دھوکے کے بعد انھیں نے کچھ مشرکین دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ مشرک قرآن کے مقابلے میں یہ ہے، انھیں یہ بھی کہہ کر دیا کہ یہ مشرک قرآن کے مقابلے میں یہ ہے، اس نے قرآن کا یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہاں اللہ عزوجل نے،

بعض معانی پر کہ یہ دعویٰ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول از نزہت چند روز کے لئے حکام شریفین نے مجھے، اور اس میں نیز اس کے ملاقات کو تو یہ روایات کام کام مقام اس سے آگے چلے حکم کیے، مگر کوئی ان سے یہ کہے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے مانے علم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز و اعجاز تفسیر، نظام فطری، نظام مکتب کیسے بکھلے۔

آجکل کے بعض مشرکین نے کہا کہ قرآن کلام کی شکل نہ مانا جاساں کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کا کلام ہے، ہر دیکھ کر کہ ایک اعلیٰ درجہ کا بلاغت کوئی نظر انھیں لگے کہ وہ دیکھ کر آدمی اس کی تعریف دلا سکیں۔

مشرقی شریف کی کلاسیک تفسیر کے بعد کہ وہ علم و ہر بے مثل دیکھ کر کہیں کہا جاتا ہے کہ تو کیا وہ نہیں سمجھتے ہیں!

لیکن اگر زراعت و کتب قرآن میں معلوم ہو گا کہ مشرقی اور فقیہ کے پاس سامانی تعلیم تالیف کے بعد وہ دوسرے دیکھتے تھے کہ بعض انھوں نے تعلیم حاصل کی، رسول و رسول ہیں چہ ہے وہاں راقون جاگے، قرآن انھیں کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ارادت لگے، سامانہ سال کی عقول اور داغ صوفیوں کے جہد میں اگر انھیں فطرتی یا تجربی یا انتہائی یا کوئی اور کوئی زبان میں اور مشرقی خاص میں اور ملحق انگریزی میں، اگر تو ان میں کوئی دیکھ کر انھیں سمجھتے ہیں یہ دیکھ کر یہ کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تنبیہ کی بات نہیں۔

معموم کی تعریف تو یہ کہ وہ اسباب مشاغل کے قوسہ کے بغیر وجود میں آئے کہ کیا ان

آپ کو قرآن کی کلاسیک تفسیر میں  
آپ کی طرف نسبت کرنے میں بھی ہے  
قرآن کا کلام قرآن ہی ہے۔

آپ کو یہاں سے قرآن کے مقابلے میں

لیکن کوئی ان سے یہ کہے کہ یہاں انھیں نہیں قرآن کے مقابلے کے لئے سارا قرآن ہی چاہئے کہ انھوں نے قرآن کیا، جہاں وہ ان کی مشرکان کی دسی داری انھیں اس کا مشعل کلام سمجھنے دیکھنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس قسمی کے بعد ہم نے اس کی شکل کلام میں شریفانہ سہ سہ کر دیا!

خلاصہ یہ کہ مشرکان کے اس دھوکے کے بعد انھیں نے کچھ مشرکین دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ مشرک قرآن کے مقابلے میں یہ ہے، انھیں یہ بھی کہہ کر دیا کہ یہ مشرک قرآن کے مقابلے میں یہ ہے، اس نے قرآن کا یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہاں اللہ عزوجل نے،

بعض معانی پر کہ یہ دعویٰ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول از نزہت چند روز کے لئے حکام شریفین نے مجھے، اور اس میں نیز اس کے ملاقات کو تو یہ روایات کام کام مقام اس سے آگے چلے حکم کیے، مگر کوئی ان سے یہ کہے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے مانے علم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز و اعجاز تفسیر، نظام فطری، نظام مکتب کیسے بکھلے۔

آجکل کے بعض مشرکین نے کہا کہ قرآن کلام کی شکل نہ مانا جاساں کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کا کلام ہے، ہر دیکھ کر کہ ایک اعلیٰ درجہ کا بلاغت کوئی نظر انھیں لگے کہ وہ دیکھ کر آدمی اس کی تعریف دلا سکیں۔

مشرقی شریف کی کلاسیک تفسیر کے بعد کہ وہ علم و ہر بے مثل دیکھ کر کہیں کہا جاتا ہے کہ تو کیا وہ نہیں سمجھتے ہیں!

لیکن اگر زراعت و کتب قرآن میں معلوم ہو گا کہ مشرقی اور فقیہ کے پاس سامانی تعلیم تالیف کے بعد وہ دوسرے دیکھتے تھے کہ بعض انھوں نے تعلیم حاصل کی، رسول و رسول ہیں چہ ہے وہاں راقون جاگے، قرآن انھیں کہیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ارادت لگے، سامانہ سال کی عقول اور داغ صوفیوں کے جہد میں اگر انھیں فطرتی یا تجربی یا انتہائی یا کوئی اور کوئی زبان میں اور مشرقی خاص میں اور ملحق انگریزی میں، اگر تو ان میں کوئی دیکھ کر انھیں سمجھتے ہیں یہ دیکھ کر یہ کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تنبیہ کی بات نہیں۔

معموم کی تعریف تو یہ کہ وہ اسباب مشاغل کے قوسہ کے بغیر وجود میں آئے کہ کیا ان

لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و محبت، وسیع مطالعہ، مدقوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے مستاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں صدی اور لاکھوں فیضی اس پر مشربان ہو جائے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہو کر اس کو بھی آپ ہی کے فیض تعلیم کا اثر مستراریں، اس کے علاوہ سحدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بمثل دے کر نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر مشرآن کی صرف نصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و احتیاط اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انعتلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقبل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی ہے اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مستاد علی بان نے اپنی کتاب تذکرہ عرب میں صوفیائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

”اس پیغمبر اسلام اس نبی انہی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم کو اپنا راجہ جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی انہی کی تہنیک اندر سے لاکھوں ہندوؤں خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مشرودہ دل جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

”جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی ناز و غری نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں محسوس ہوتا ہے، متحیر و متادبی ہو اور آخر میں ہمہے تعلیم کر کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان اعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عظیم مالی شان اور تہذیب و تہذیب اور جاہ و اس کے مضامین سخن کی غایت رنوت تک پہنچ جاتے ہیں۔

غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا زور اثر دکھاتی رہے گی، (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلولی نے ۱۹۹۵ء میں مسٹر کونٹ ہنری کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فریچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

”عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر آتا ہو جو بالکل احمق تھا، تمام مشرق نے استرا کر لیا ہے کہ نور انسانی لفظاً و معنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پر رازسی نے عربی خطاب کو مطمئن کر دیا، ان کو خدا کا معترف بنا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے چلے جعفر بن ابی طالب نے جبرائیل کے بادشاہ کے دربار میں پیشے تو اس کی آنکھوں سے میاخذہ آنسو جاری ہو گئے، اور ہشت چلا اٹھا کہ یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶، ص ۵۹۹ میں ہے:

”قرآن کے مختلف حصوں کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، ہدائی اور صداقت کی یاد دلاتی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، رت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز و مشرور دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گین اپنی مشہور تصنیف رسلطنت روما کا اخطاطہ و زوال، کی جلد ۱ باب میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی نسبت ہر ممالک تک سے لے کر دور یاے گنگا تک نے ان دیا ہے کہ یہ پارہائے شکی روح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیریات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہو، جن کو حیات انسانی کی تربیت تسمیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر مادی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سامنے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی“



اس جگہ پر بھی روپ کے اقبال و اعتراضات کا امتیاع سب کا نہیں کہ اس کی سطح پر نفس نورد کے طور پر چند اقبال نقل کئے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قطار فصاحت و بلاغت و خیال و افراغ و مقاصد کے اور با عقلماء علوم و معارف کے قرآن کے لئے تقریر کے مشعل کا اصرار صرف مسلمانوں نے نہیں ہر مذہب کے متعدد مروجہ علمبرداروں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال، اے کائنات! دیا خدا اور کوئی دلا سکا تو آج بھی ہر انسان ہر بریں علم و سیاست کو چیلنج کرے کہہ سکا کہ آج بھی قرآن ہی دنیا کا ناچ ہے ایک واقعہ ایسا تو ایک بڑے سے بڑا عالم محمد فیلسوف کو کھڑا اور ساری دنیا کے عقائد و فرائض، اور عبادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے اور اس کی قوم بھی اپنی جاتی جی جی متاثر ہو، یہ عقل و عصر میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور اعلیٰ تعلیم کو بھی اسی حد پر پہنچائے کہ اس کی کے معبود و دشمن کائناتوں میں ملنا نا ممکن ہے۔

دنیا کی پہلی تاریخ میں ان گراس کی کوئی نظیر نہیں تو کچ تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز کار کا زمانہ ہے آج کوئی کر کے دکھائے، ان کیلا کوئی ذکر کرے تو ہمیں قوم کو جگہ دنیا کی ستاروں میں کر کے اس کی مثال سہا کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْعُدُوا عَنْ صَلَاتِكُمْ هَذِهِ السَّاعَةَ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

أَيْدِيَهُ إِلَى الْحَطَمِ نَزَلَ ۝

”اگر ہم اس کی مثال لے سکیں اور ہرگز نہ لے سکیں تو پھر اس جملہ کی آگے بڑھیں تو اس کا پتہ نہیں آئی

اور پھر یہ 7 مسکروں کے لئے تیار کی گئیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

دو خوش خبری دے آئی لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ آگے واسطے رابطہ ہیں کہ

مِنْهُ لِيُخَوِّفَ لَكُمْ بُعْدَ اللَّهِ وَالرَّسُولِ لِيَرَوُا أَنَّ اللَّهَ فَاعٍ

[illegible]

اسی میں ان کے بچے بھرے جب بچے کا ان کو وہاں کا کوئی پس بھالے کو تو نہیں ہے ۔

هَذَا الَّذِي رُسِرْنَا مِنْ قَبْلُ وَأَتَوَيْنَاهُ مُتَسَاهِلِينَ وَلَهُمْ فِيهَا

تو دیکھو ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے چھٹا اور دیگر جا نہیں ہے اُن کو پہل ایک صورت کے ارد گرد کچلے وہاں

١٠٠

خُلاَصَةُ تَقْسِيْمِ

اور خوش خبری سنا دیجئے آپجی اہی وگوں کو جو ایمان لانے اور کام کئے اچھے اس بات کی

کو بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ جتنی ہوں گی اللہ کے نفعی گہری حساب کسی لینے جاؤں گے وہ

لوگ اپنی بہشتوں میں سے کسی بھلن کی غذا کو ہر بار میں ہی کہیں گے کہ یہ تو دبی ہے جو ہم کو ملا تھا اس کے

ہوئے اور میں نے کہا جس اُن کو وہ فوج پارکا جہاں جلتا جلتا اور ان کے واسطے ان جہتوں میں بیٹیاں

ہر ایک صاف پاک کی ہوگی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو رہیں گے اور ان کے

میں نے جلتا پھول ملنا لطف کے واسطے دیکھا کہ دروزن مرتبہ پھولوں کی مسرت اکبر ہوگی، جس سے

وہ سمجھیں گے کہ یہ بسلی ہی قسم کا پھل ہے مگر کھانے میں مزہ دیرا ہو گا جس سے حفاظت و برکت ہو گا۔

اسی سے پہلے آیت ہے: ﴿وَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى﴾ (اور میں نے تم کو آگ سے ڈھکیا ہے جو لہلہاتی ہے)۔

**رُكْبَةُ آيَات** ۱۰  
 میں مانتے والوں کے لئے وظائف اور نیکوئی کا بدلہ دے رہا ہے۔

فوسٹ محلہ بھکارو، ج. ا. اور جٹنگ کا، گرجہ۔

معارف و مسائل

اہل جنت کو نکاح بھل ایک ہی شکل اور صیغہ میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک ہی ہے۔

اور لطف کا سامان بنا تاں ہوگا بلکہ بعض مغسّرین نے فرمایا کہ پھلوں کے عشاق ہونے سے مراد یہ کہ

کہ جنت کے پھل صورتِ انشکال میں، دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، وہ اپنی اصل حقیقت کو چھپائیں گے تو

کہیں ملے کہ چتواری بھیل ہیں خدا نیا میں نہیں ملتا کرتے تھے، مگر انفراد لذت میں انسانی بھیل

سے اُن کو کوئی لہٹ نہ ہوگی، صرف تار کا اسٹنڈرک رکھا۔

جنت میں ان لوگوں کو ایک سات سماں طے کا عذاب دیا ہے کہ وہ اپنا کھانا

ظاہری اور احسنہ کی گندگیوں سے پاک ہوں گا، اور اور ازہ جیوں و نفاس اور بر البیوت حیز سے

یہاں ہر گرجن سے انسان کو نفرت محسوس ہے۔ اسی طرح کچھ غلطیوں پر فالو معنوی دوسرے بھی

اک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ بھر جنت (نبیوں کو دینا) اور آقا (ﷺ) کو نبیوں کا طریقہ نہ سمجھ سونے کے دینا

موصوفی نے اس سب سے پہلے اپنے وقت کے غلامانہ فکر و رائے کو ان کے ذہن سے ہٹا دیا۔

خوشادخبر رہی ہرگز

میرا یہ منہ ہے کہ جتنے کائنات میں ہیں، ان میں سے ہر ایک میں ایک خدا ہے۔ (مکمل)

کہ ایمان بظہر صلیح کے ادا کیا کو اس اشارت کا مستحق نہیں بنایا، اگر صرف ایمان ہی جو شرفِ غلام اور دامن سے پہانے کا سبب ہو، اور مومن کشتی میں بھی بٹکا ہو کسی دیکھی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا، اور جنت میں پہنچے گا، مگر اہل بیت باطل غمات کا بظہر صلیح کے کوئی نسخہ نہیں ہوتا اور دامنِ ایمان ہی قرطی

لَإِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا  
بہ کلک اندر مرقا، جہیں اس بات سے کہ میان کرے کوئی مثال ہماری یا سرچرکی یا جانور کو  
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا  
سو جو لوگ کفر میں ہیں وہ جھٹکتے ہیں کہ کوئی مثال نہیں ہونی ان کے وہی ملک اور کوئی  
گفہر و اقیقہر کون مآذ اَرَادَ اللَّهُ هَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا  
ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اندر کا اس مثال سے گمراہ کرنا جو بظہر صلیح کے مثال سے بڑھ کر  
وَالَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا  
اور دایت کرنا ہی اس سے بہتر ہو کہ اور گمراہ نہیں کرنا مثال سے گمراہ کرنا کہ جو قوت ہے خدا  
عَزَّ وَجَلَّ مِنْ بَعْدِ مِثْلِهِ بِهٖ هُمْ وَيُضِلُّونَ مَّا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ  
کے معادہ کو معبود ماننے کے بعد اور قطع کرنے میں اس چیز کو کہ اللہ نے فرمایا مٹانے  
يُؤْتِلُ وَيُضِلُّونَ فِي الْآخِرِينَ ۚ وَلِلَّهِ هُمُ الْخَيْرُونَ ۝  
کہ اور خدا کرتے ہیں کلک ہیں وہی ہیں قوتے والے۔

## خلاصہ تفسیر

دعوتِ مخالفین نے قرآن کے کلام آئی ہوئے پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی جزو و ذیل چیزوں کا ذکر غفلت میں کیا گیا ہے جیسے چھرمسکی و فو، اگر خدا کا کلام ہوتا تو ایسی چیزیں نہ لکھتا کہ اس میں جو باتیں کا جواب دیا گیا کہ ان واقعی اللہ تعالیٰ تو ہمیں شرعاً نے کہ بیان کر دیں کوئی مثال ہم خواہ چھرمسکی و فو اس سے بھی بڑی چیز ہو جو ہم نے نہیں لکھی کہ ان سب کو جو لوگ ایمان لاتے ہوئے ہیں وہ لوگ بھی ہر اور تو ہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال بہت

ہی ہو سکتی ہے ان کے وہی کی جانب سے اور وہ کچھ لوگ جو کچھ ہیں سو جاسے کہ یہی جو کچھ وہ لوگ ہی کہتے ہیں کہ کوہ کفسا مطلب ہر کچھ جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس چیز مثال سے گمراہ کرتے ہیں اندر تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتر کرنا اور ثابت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتر کرنا اور گمراہ نہیں کرتے اندر تعالیٰ اس مثال سے کسی کو گمراہ نہ فرمائی کر کے والوں کو جو کہ قوت ہے بہتر ہیں اس معادہ کو اندر سے کہتے تھے اس کے استحکام کے بعد دینی عمل والوں میں جس میں سب کی اور اس نے اندر تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا، اور قطع کر کے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دے اندر تعالیٰ نے ان کو بڑھ کر کہ اس میں تمام تعلقات مضر و داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو زندہ اور زندہ کے درمیان ہیں، جو اس کے اوپر اور فرما اور بیشتر دلوں کے دویان ہیں، عالمِ انبی اسلام کے دویان ہیں اور جو عالمِ عالمی کے دویان ہیں، اور خدا کر کے دیتے ہیں دینی ہیں و کفر و شرک و فساد اور دوسروں پر ظلم اور فساد میں جس چیز کو کہ لازم میں ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے، جس میں وہی ہیں اپنے خدایا میں پڑنے والے کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے دیتے، کیونکہ حاکم کی زندگی میں ہمیشہ تلخ ہی رہی ہے۔

## معارف و مسائل

جنہر آیات پہلے فشرآن کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ فشرآن کریم قرطی ملک و مشہر کہ حقین شش نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلام آتی ہو جسے میں ہو تو وہ اس کی جہوئی سے سورت کی مثل جانکر دکھلانے والا ہے میں مگر میں قرآن کا ایک شبہ ذکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے مشہر ہے خدا کو قرآن کریم میں عسی اللہ تعالیٰ عجز یا فوہوں کا ذکر کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی حکمت کے خلاف ہو اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو تو اس میں ایسی چیزیں لکھوائی ہیں کہ ان کا ذکر نہ ہونا، کیونکہ بڑی لوگ ایسی چیزیں لکھنے کے ذکر شرع و حیا پسوں کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی عقیدہ دلیل چہر کی مثال دی ہو تو کسی ایسی ہی چیز جیسے مثال دینا متفقہانہ عقل و طاقت ہے، اس ضمن کے لئے کسی چیز کے لئے ایسی چیز کا ذکر کرنا شرع و حیا کے قطعاً منافق نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں لکھنے کے ذکر نہیں فرماتے، اور یہ بھی بتلویا کہ ایسے اعتقاد شہادت صرف ان لوگوں کو کہہ دیا ہو اگر کرتے ہیں جن کے غلو اور دماغی سے ان کے کفر کی وجہ سے کہتے ہو جیسے کہ ملاحیت مفقود ہو گئی ہو، ایمان والوں کو بھی ایسے مشہدات و مسائل نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلا دی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر دنگر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں اور بے پڑائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوضَةً فَمَا كُوْنُهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ ٹھپڑ ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہو کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (منظری)

فَيُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہو کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ فاسقین فسق کے لفظی معنی حسیرت اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعت الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور علیٰ ناسرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کا فرق کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کا مشرود ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مومن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی میں استعمال ہوا ہے کہ کسی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی تقسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا ضعیفہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنائے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (منظری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرات کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ناجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعت خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَنْفَعُ شَرُوْنَ عَهْدِ اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مِيْثَاقِهٖ۔ عہد اس صورت، حاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور میثاق ایسے معاہدے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے معنوں کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجام کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دوجہ ہیں:

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس اذلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟ اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بلیٰ قیٰں آپ رب کیوں نہ ہوتے؟ جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا استہرا ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہو کہ ہم اس کی اطاعت سے سربموجہ و نڈر نہ کریں، اس لئے یہ عہد اولیٰ انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آئے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی سفید پیر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہو جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرمکار کار کے ساتھ ہو، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعت اسلام ہے، اور راہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد اٹکے، اسی لئے اس چلنے کے بعد فرمایا وَ يُضِلُّوْا فِي الْاَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی خبر و دلیل یا شرمناک | اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ سَهَابَتِہٖ ہوا کہ کسی مفید معنوں کی توضیح چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے | میں کسی حقیر دلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہو، اور نہ قائل کی عظمت شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماء ملت کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عموماً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عربی شرم و حیا کی پردہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔





مکتوبہ شریفہ از خان خانان خانقاہ قادریہ حیات آباد، اموات، میت کی جمعہ و عید و عروہ و اودے جان چکر کر کہا جا  
ہے۔ مراد یہ کہ انسان اپنی اصل حالت میں عذر کرے تو طوطم چوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء و وجود  
ذرات ہیں جو کچھ خیر و ہر ذرہ کی شکل میں کچھ ہیں وہی ذرات ہیں جو کچھ خیر و ہر ذرہ کی صورت میں  
تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جان ذرات کو کہا کہ ان کی صورت میں جمع فرمایا  
پھر ان میں جان ڈالی، ان کو نر و نرسان بنا دیا یہ اس کی ابتداء پیدا کرنے کا ذکر ہے۔

فَمِنْ وَجْهِكَ كُنْتُ رَقِيمٌ فَجَعَلَ بَيْنَهُمَا حِجَابًا  
 کر کے اُن میں جان پیدا کی، دوسرا عالم میں تمھاری حرکات و سکنات پر وقت لگا رہا ہے کہ بعد میں موت  
 ملے گا اور وہ ایک عرصہ کے بعد قیامت میں اس طرح تمھارے جسم کے لیے جان اور متعلقہ ذرات کو  
 جس کر کے تمھیں زندہ کرے گا اس طرح ایک موت لائیں گے جان پر اور تمھاری پیدائش میں تمھارے  
 اور آسمانی نے تمھیں زندہ کیا، دوسری موت و دنیا کی پوری عمر کو لے کے دفعتاً اور دوسری زندگی  
 قیامت کے روز ہوگی۔

پہلی موت اور زندگی کے درمیان چونکہ کوئی ناقص اور عشاء اس لئے میں محروم ہوا کہ استعمال کیا گیا، خاصاً پتھر اور جنم و نیک حیات اور موت کے درمیان اور اس طرح اس موت اور قیامت کی زندگی کے درمیان عشاء ناقص عشاء اس لئے وہاں لفظ **عشاء** اختیار کیا گیا۔ **عشاء** لفظ کا معنی ہے کہ لفظ **عشاء** شہادت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

فَرْدِ اَلْبَدِیُّ مَشْرِیْقُ حَقِّیْ عَزَّ وَجَلَّ یعنی ہر چہ ازسی ذات پاک کی طرف ہرگز باز نہ گئے ، اس سے مراد جبر و فساد کا قیامت کا وقت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام و احسان کا ذکر کیا ہے جو ہر انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے ، اور جس سے انعامات و احسانات کا مدار ہے ، یعنی نورِ محمدیؐ ، دنیا و آخرت اور دنیا و آسمان کی جتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں وہ سب اسی نورِ محمدیؐ پر موقوف ہیں ، زندگی کی ہر خوشی کسی نعمت سے خالی نہیں ، تنہا سکھ ، نورِ محمدیؐ کا نعمت ہے ، دنیا و آخرت ہر نعمت ، مگر اس آیت میں موت کو بھی اہمیت کی فہرست میں شامل فرمائی ہے کیونکہ اگر آپس سے کہہ دینا کی موت و دوزخ ہے ، اس واقعہ نورِ محمدیؐ کا جس کے بعد موت نہیں ، اس لحاظ سے موت بھی ایک نعمت ہے ۔

مسئلہ: آیت مذکورہ ثابت ہوا کہ:

جو شخص، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا حکم ہو، یا قرآن کے کلام الہی ہر نے خدا  
منکر ہو وہ اگرچہ بظاہر خدا کے وجود و وحدانیت کا کلمہ نہ کہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ منکر ہے  
خدا ہی کی غیبت میں شمار ہے۔

میانِ نزعی اس ثابت میں دنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک مہات کا ذکر ہے، جو حق کے دروازے والی ہے، جس کی زندگی میں کسے اور یہی قیر کا سوال جواب اور قریں قلوب و عذاب جو انسان کو کرب کی بند و آفات اور حدیث کی متواتر دایات سے ثابت جو اس کا ذکر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر بشری زندگی اس طرح کی زندگی نہیں ہے جو انسان کو دنیا میں حاصل ہے، چا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک اور دنیا میں صرف جہل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دنیا کی زندگی کا اصل بھی کہا جاسکتا ہے، اور آخرت کی زندگی کا قدر بھی، اس کوئی مستقبل زندگی نہیں، اس کا دعا دعا ذکر کیا جائے۔

تھو آئی ہی خلق لکھ کر عانی اکثر میں کچھ عبادت اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا محتاجی  
 لے کر کچھ میں ہے۔ سب کاسب، جاس نصیب، عا، کا ذکر کہوں ہی تمام انہیں لکھ کر دیا وہ ایک  
 شریک ہیں اور ایک نظر میں تمام نعمتوں کا مال آج جو دنیا میں کسی انسان کو حاصل ہوئی ہے ایک  
 ہیں کہی کر انسان کی قدر، انیس، عقلی، اور وہ اور دوست کے کے سامان زمین کی کی پیداوار ہیں۔  
 نعم انشئک فی الارض لکھ کر عانی اکثر میں کچھ عبادت اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا محتاجی

استقامت کے غلطی میں سزا جہاد کرنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ زمین کی پیداوار میں سے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کا تصور درست فرمایا جس میں کوئی حائل اور مانع نہ ہو، جہاں تک کہ کائنات آسمانوں کی تخلیق تکمیل نہ فرمادی، اور وہ ہر جہے کا جائزے والا ہے، اس لئے تخلیق کائنات اس کے لئے کوئی حائل نہیں۔

یہاں ہر چیز نفع بخش ہے  
اس آیت میں زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا فرمانے کا بیان ہوا ہے۔

اس سے لگ بھگ نوے معلوم ہوئی کہ گروہا کی کئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو کسی  
کسی حیثیت سے بھروسہ یا واسطہ یا واسطہ ہو چکا ہو خواہ یہ فائدہ دینا یا استعمال کے لئے کیا جائے،  
آخرت کے لئے جنت و نصیحت حاصل کرنے کا راستہ اس چیز میں کا فائدہ تو انسان مخصوص کرتا ہے  
اس کی نگاہ اور واسطہ استعمال میں براہ راست آتی ہے، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو کبھی  
سے فائدہ ہو چکا ہو، مگر اس کو غریب نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں انسان کے لئے مضر کسی  
مانی ہیں جیسے زہر، آتش، اور بے جان و زہر و طور کر ہی تو کسی بھی حیثیت سے انسان  
کے لئے نفع بخشنے کی ہوتی ہیں جو چیزیں انسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں، دوسری کسی طرح  
اور مشیت سے ان کو نفع بھی پہنچا سکتا ہے۔

نہیں ہے چیز بھی کوئی زمانے میں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں





کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو خضار کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم  
برایں تسبیح کرتے رہتے ہیں بعد ازاں اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں فرشتوں کی یہ گزارش  
نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم  
ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں ایک وہ ہر طرح کے لوگ ہونگے، بعض لوگ  
اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مند ان عرصہ میں کیا کہ ہم سب کے  
سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور اگر وہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے  
کوئی نیا علم پڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیلئے ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق  
میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم  
ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی (حق تعالیٰ نے  
ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق  
بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض نسا بھی پھیلا دیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا  
اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے  
تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود ہم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا،  
اور اعتدال سے تجاویز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں  
نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے نوزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا  
عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی،  
آگے اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی  
ضرورت ہو، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم دیکھنا اللہ تعالیٰ نے  
آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا یعنی سب چیزوں کے نام اور ان  
کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دے دیا گیا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رد برو کر دیں پھر فرمایا  
کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم پہنچے ہو (یعنی اپنے  
اس قول میں پہنچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ  
آپ تو پاک ہیں اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا ہم سے پوشیدہ رکھا  
کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے  
لگ کر کے دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام  
کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت  
اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا، مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں ذکر جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا  
اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراض تو ثابت  
ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ  
کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے  
سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے احق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم  
تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب  
آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رد برو بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے  
کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیے ان کو  
آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو)  
میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں  
آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو  
اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

## معارف مسائل

**رابط آیات** | پچھل آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے  
انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر کو تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا، ہر  
کیونکہ نعمت و اذیت کی ہوتی ہے، ایک معنوی میں محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان، جائیداد  
دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھل آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر  
تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو  
دولت علم دی، اور سجدہ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔  
خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت  
قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا،  
جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی  
کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور  
انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ



نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی ان سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کا مستظاہر بھی وہ درست کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے ہم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم کے حقوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمینیں مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متعلیٰ نہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرنا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق و دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہو کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصیرت کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب ان کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَیْسَ عَلَیْکُمْ اَلْعَمَلُ وَهُمْ لَیْسَ بِکُمْ اَلْعَمَلُ (۱۲، ۳۳) اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا۔

بات یہی ہو کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو مسند مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت مشرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کی اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تائید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا رکمانی روح البیان، دوسرا فائدہ خود الفاظ مشرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ اَلَّذِیْ یُخْلِقُ اللّٰهُ خَلْقًا اَکْثَرًا عَلَیْہِ سَآءَ ذَکَ اَعْلَمُ رَبِّیْ اللّٰہُ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرما دیں گے، حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنائے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خوئی ریزی کا بھی مرتکب ہو گا، اس سے بچائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطا و لغو سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبارت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے!

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافت البیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ لے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔



اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیل علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ٹنکی متعل نہیں، فرشتہ کیا جائے کہ بھوک کھا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز پر نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بھوکا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہیں کو سکھایا گیا، پھر فرشتوں کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تبتائی میں فرشتوں سے ملنے دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدا سے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بچے کا بچہ خیرنا جانتا ہو، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہو، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر ان کو بھی یہ چیزیں سکھاسکتے تھے، تو ان کو کیوں نہ سکھایا گیا، مگر اس کا ماحول تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پتے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ماکم کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پرآواقت ہو، اس کے بغیر وہ ان پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کرے کہ بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟ غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم و موزوں کو دیکھنا نہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پرآواقت ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے اثرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے قرآن بول اٹھے، سَبَّحْتَكَ لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا لَا إِلَهَ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم و حکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا امتداد تھا کہ زیادہ اعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہو کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اہل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علی فوق کا اظہار فرما کر دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اپنی إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے سناپی سمجھ رہے ہو درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب



بھیجے گی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشاء الہی یہ ہو کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیے جس سے کسی گناہ خطا کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے مشیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاءِ خداوندی ہے، جس میں خیر و شر نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذباتِ شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضح لغت خود حق تعالیٰ ہیں | اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضح خود حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے ہستعالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کو واضح لغت قرار دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر | اس واقعہ میں قرآن حکیم کے یہ بلخ الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے منبرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ **أَمْسِكُوا** ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ **أَمْسِكْ لَهُمْ** فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرز بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالب علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے کیونکہ جن چیزوں کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو بھی ان چیزوں کا ارجاعی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دیدیا گیا۔

خلافتِ ارض کا مسئلہ | زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کس نائب کا مستتر ہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدارِ اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہو، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (۵۱: ۵۷) اور **لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (۱۰: ۳۲) اور **الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ وَالْأَنْعَامَ وَالْأَنْفُسَ** (۵۴: ۵۴) وغیرہ زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذنِ خداوندی زمین پر سیاست و حکومت اور جنگاں خدایتعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکامِ الہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا اقتدارِ بلادِ اسطیٰ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسبِ عمل کا کوئی دخل

نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسی پسند نہیں، جس کو کوئی اپنی سی دھڑل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کیلئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، قرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِمَّنْ أَمْسَكَ كَلِمَةً  
رُّسُلًا دِينَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ يَتَجَبَّرُ  
بِهِ (۵۵: ۲۲)

اللہ تعالیٰ انتخاب کرتا ہے فرشتوں میں  
اپنے رسول کو اور انسانوں میں سے جسکے  
اللہ تعالیٰ اپنے والد کیجھے والا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَ رَبِّكَ  
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَ رَبِّكَ

اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رستہ  
کس کو عطا فرمادیں۔

یہ خلیفہ اللہ بلا واسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے، اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ خلافت و نیابت الہیہ کا آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر ہیبت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لاتے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل انبیا خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف سے مبعوث ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت و خستیار اپنی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ طرف بھیجا گیا، آپ کا اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر جاری ہیں اور آپ کی خصوصیات، فرمایا گیا، قرآن کریم نے آپ کی بخت و نبوت کے عام ہونے کا

اعلان اس آیت میں فرمایا:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ  
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ  
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ  
ذُو الْحِكْمِ (۲۱: ۱۰۸)

”آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول  
ہوں، تم سب کی طرف اللہ و ذاتِ رحمت کے  
قصد میں ہر ملک آسمانوں اور زمین کا“

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء



علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت دنیا بت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا، کہ آپ کی خلافت دنیا قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہونے لگتے تھے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، مسترآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُونَ مَا نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاحِظُونَ (۹۱، ۹۲)

ہم نے ہی مشرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو نشانہ نہ کیا گا اللہ تعالیٰ کی تائید میں اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب منہ و محرف ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایت حدیث سب کی سب اپنے اصل خود خال کے ساتھ قیامت تک موجود محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفہ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیا بت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول مخاب اللہ مقرر ہوتا اور دنیا بت کا کام سنبھال دیتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت دنیا بت قیامت کے بعد نظام خلافت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی کائنات کے بعد نظام عالم کیلئے جو نائب ہو گا وہ خلیفہ الرسول اور پیکار نائب ہو گا، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

كَانَتْ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ثَلَاثُ مَنَاسِبٍ  
أُولَاؤُنَّ يَأْتِيَهُمْ كُلَّمَا هَلَكَ مِنْهُمْ  
خَلْفَتُهُ نَبِيٌّ وَلَا تَبْقَى  
بَعْدِي نَبِيٌّ وَتَسِيكُونُ خَلْفَاءَ  
فِي كُلِّ رَوْقٍ

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا، کہ آپ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا منظر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں ہمیں حجت اجماع امت تسلیم کرنی پڑے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَنُحْيِيهِمْ أُمَّتِي عَلَى الْفَلَاحِ

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضلل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے ہمیں واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا بت زمین اور نظم حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ شروع ہو گیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کر دے وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہو گا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز



اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان متعلق منبرایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء  
الراشدين

”میری سنت کو لازم پکڑو اور متابع رہیں  
کی سنت کو۔“

خلافت راشدہ کے بعد خلافت راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک ہر قوم کا ملحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہی اس ملک کا امیر اور اول الامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** (۲۸۱:۳۲) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں کا اسمبلی اور نیک ممبران شورا میں مشرق بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا برا قانون بناتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر ان کی قانون سازی بھی شرع و سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی اول: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے، چند اہم دفعات کا ثبوت دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے

اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت اہلبیت کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافت رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب کے مشورہ پر پایا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ

اور جب ہم نے حکم دیا کہ فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو سجدہ میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۴﴾

اس نے مانا اور تکبر کیا، اور تمکارہ کافروں میں

## خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس رضی عنہما سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سب سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس کے کہ اس نے کہا مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

## معارف و مسائل

ربط آیات | پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت

خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، ان کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعلیم کرائی جائے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور صادق

آنخبہ خواہاں ہر دو گروہ کو تہنہ داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قومی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعلیم کرائی جائے کہ علم بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعلیم کر رہے ہیں، اور گویا زبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔





فَازِلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا

پھر بلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب تیرے

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ الْحِينِ

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہو اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

## خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بی بی و جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت

کا طر سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا، بہشت میں پھر کھاؤ و پوٹو اس میں ہے

با فراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائو اس درخت کے ورنہ تم بھی اپنی میں شمار ہو جاؤ گے

جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرما دیا، اور پھر

آقا کو اختیار ہو کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے،

اور جس چیز کو چاہے منع کر دے، پس بعض نے دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے

سو بر طرف کر کے رہا ان کو اس پیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ بیچو اگر تم میں سے بعضے بعضوں

کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک (یعنی وہاں

جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

## معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا مکمل ہے جس میں لیا گیا گیا کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافت ارضی کی مصلحت

فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے

کائنات پر کمال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت

میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے

پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا و خوار

کھائے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے

کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی جس حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور

یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات

اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

تعلیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں غیر اللہ کے لئے

تعلیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں جب

تعلیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

یہ حدیث میں صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصول حدیث کی معروف کتاب

تدریج الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر

ہو جاتی ہے، جو شریعت کی طرح قطعی ہے، یہاں تو میں صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ میں صحابہ ک

روایتیں ماسیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں

ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ :- ابلیس کا کفر محض علی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو

ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل پس

حکم بانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم

دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

مسئلہ :- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا

کہ اس کو طاؤس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟

بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی ہی

ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ وہ

اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر

نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی

ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے، اے

إِذَا كَفَرْتَ كُنْ غَوًى تَوَّانَ اللَّهُ يُلْعَثُ لِي

فَإُولَٰئِكَ مَا يُنَاجِيكَ عَلَيْهِ إِحْبَادُهُ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہو جو آخر عمر اور

اول منازل آخرت تک ساتھ رہے، مگر وہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غور نہ ہونا چاہئے اور

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

اور ہم نے کہا اے آدم رہا کرو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ

جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم



وَعَلَّمْنَا تِلْكَ آيَاتِنَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝۱ اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تمہارے اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو۔ یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق اور ملائکہ کے سجود کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت کے باہر نہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقین نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا مگر اس وقت تک ان کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن دستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الْمُخْرَجِينَ ۝۲ رَحْمَنُ اُس کے معنی عربی لغت میں اُس نعمت و رزق کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت و مشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا ختم ہوجانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوتا ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل فراغت سے استعمال کرتے رہو، نہ ان کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی، اور نہ یہ منکر کر یہ غذا ختم ہو جائے گی۔

وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ ۝۲ کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہو کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ، یہ درخت کونسا تھا قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے عندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو مشرآن و حدیث نے بہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے (قرطبی)

فَتَكُونُوا مِنَ الْمُخْرَجِينَ، یعنی اگر آپ نے اس شجرہ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا ۝۳ رَزَا کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، ازلالی کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم و حوا کو لغزش دیدی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم و حوا کی یہ خلافت و رزق اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تمبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی، کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنْهَا میں لفظ عَنْ بمعنی سبب ہی، لیکن اُس درخت کے سبب و ذریعہ سے شیطان نے آدم و حوا کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مڑو کر جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم و حوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور دباؤں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر ملاقات کے ان کے دل میں دوسوہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنت میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہو کہ اپنی قوت جنت کے ذریعہ سرزمین کی صورت سے آدم و حوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہو کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت قُلْنَا إِنَّا نَتْلُو لَكَ الصَّحُفَ الْأُمِّيَّةَ (۲۱: ۲۲) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف دوسوہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم و حوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قہیں کھا کر متاثر کیا۔

فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۝۴ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم و حوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے محال دیا جن میں وہ آرام سے گزر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ حکم خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا مِنْ هَٰذَا الشَّجَرِ ۝۵ یعنی ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا ہیں، اور شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا بیخ آدم و حوا اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلا یا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہو کہ جنت سے زمین پر اکرا لیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا الطبع زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن)

وَلَكُمْ فِي الدِّينِ مَسْئَرَةٌ ۝۶ یعنی آدم و حوا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو دین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک یہ عداوتیں تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔



آیات مذکورہ سے متعلق مسائل واحکام شرعیہ

اَشْكُنْ اَنْتَ وَرَوْحُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے اَشْكُنَا الْجَنَّةَ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد مَکَلَّا اور لَا تَعْلَمُ تَابِینِ دونوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَرَوْحُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرت حضرت آدم کو قرار دیا اور اپنی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ اول یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ لفظ اَشْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ ختمی، کیونکہ لفظ اَشْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیا گیا یہ تمہارا مکان ہو، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اس سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہو، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی) فَاَوْفُوا بعهْدِکُمْ بَیْنَکُمْ وَرَوْحُکُمْ بَیْنَهُمْ یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت اس میں بطور مذکور سابق خطا شوہر کے تابع نہیں حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے مَکَلَّا مَکَلَّا فرمایا اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

برج چلنے پھرنے کی آزادی وَتَعْلَمُ اَنْتَکُمُ الْجَنَّةَ لَفْظًا تَعْلَمُ، کلمات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہو کر انسان کا فطری حق ہے جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتی ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاٹاؤ اور مانع نہیں اور لفظ تَعْلَمُ میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خط ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی سادگی چیسزین ہٹا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہو، اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَتِّیْ تَعْلَمُکُمُ الْفَرَاحَ کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سُورَةُ الْاَنْعَامِ کا مسئلہ وَلَا تَعْلَمُکُمُ الْفَرَاحَ، یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احیاء طبعی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سد ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں سَدُّ ذَرَائِعِ شَبَّہ ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی تنبیہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھالیا جو نظر ہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور لفظاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیر گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیر صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جاتے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق اوست یہ ہو کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ای کا صدور ہو جائے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ یہود نسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور



تشریح سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا پہنچنا ہوتا ہے (تفسیر بحر المحیط)  
مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے  
چھوٹی کسی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات  
کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار  
سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علما تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں ان میں چند یہ ہیں:

اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا اسونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہی حکم ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ مانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہو جو اُس وقت آپ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا مانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی دوسوہ اُن کے دل میں عزین اور مستحکم کر دیا، اور قمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بھئی کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی مانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی مانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ دوسو سال میں ڈالا ہو کہ اس رخت کی ممانعت صرف آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے پھولنے پھولنے کو اول عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، بلکہ غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہوجانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے۔ تو اب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ ممانعت یاد نہ رہی جو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت **فَفْتَنِي وَكَذَّبْتُهُ لَنْ اَعْرَظَ مَا (۲۰: ۸۵)** یعنی آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم لے ان میں بچشکی نہ پانی، یہ اس احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاحاصل یہ ہو کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش، ہو درحقیقت گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شانِ نبوت اور قربِ خداوندی کے مقابلہ مال کے اعتبار سے یہ عنسز بھی بڑی سبھی گئی، اور مشرآن میں اس کو محصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور دوسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی دوسوسہ ڈالے، جنت و مشیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں دوسوسہ ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں بڑا بے فائدہ اور لالچ بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مشنبہ کر دیا تھا، اَلْبَاقِیْنَ لَکُمْ مَاعَنْوَ، کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرائے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکہ میں کس طرح آ گئے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و دنیا طین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ السَّوَّابُ

موسىٰ کہ یس آدم نے اپنے رب سے چند بائیس پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر بیشک دہی ہے تو یہ قبول کر لیا

الْزَّحِيمُ ﴿٢٥﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

بہس رہی ، ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب ، پھر اگر تم کو پہنچ میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ يَتَّبِعْ هُدًى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٥٠﴾

ہدایت تو جلا میری ہدایت پر نہ غوث ہوگا کسی پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

در جو لوگ مسک جو - برادر حشاش اسلامي (نہالہ) کہ وہ ہم دہنہ خیر جا نہ اے



فِي سَاخِلِدُونَ ﴿٢٩﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

## خُلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کر لے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہو رہے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی غلامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ان پر زمین توبہ قبول کر لے، بیشک وہی ہیں بڑی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان (اور حضرت حواء کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے، قَالَ لَا زُنْبًا لَّكُمَا اَلَمْ تَنسَا جِسْمَ مَعْلُوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اترنے کا حاکمانہ طور پر بطور مزا تھا، اب بیگم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا فَلَمَّا أَصْبَحُوا نَظَرُوا فِيهَا فَبُغِضُوا (یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس پہشت سے سب کے سب، پھر اگر آدے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہزل اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مصرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم و دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ ان پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کورہیں گے۔

## معارف و مسائل

رابطہ آیا پہلی آیات میں شیطانی دستور حضرت آدم کی لغزش اور اس کے نتیجے میں جنت نکلتے اور زمین پر اترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے خطاب عتاب کہاں کئے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی بہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلافت شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دونوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھائیے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی ان کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمون تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود میں آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافت الہیہ قائم کرنا، حدود و احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْہِ اٰیٰتٍ خَافِیَۃٍ۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور مزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافت الہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فَرَاقْنِیْ مِنْصِبِیْ کا بیان ہے جو ایک خلیفہ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی، تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہو گا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّیْ، تلقی بمعنی میں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو مستہل کرنا (روح کشات) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

تَلَقَّیْ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو اِخْرَضِ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مغفرت صحابہ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو مسرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَافْسَا وَلَیْکُمْ تَغْفِرُ



لَنَادِ مُرَحِّمًا لِّتَكُونُ مِنَ الْخَيْرِينَ . (۲۳: ۷)

تَابَ، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوم اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے "اللہ توبہ" کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تَابَ عَلَیْہِ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبِّتَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِی (۱۸۰:۲۸) یعنی اے میرے ہالنے والے میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے، اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۸۰:۲۱) یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں، (مطلب یہ کہ مجھ پر رحم فرمائیے)، (قرطبی)

**قائدہ:** حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی احسنش یا بھول صادر ہوتی ہے، اولاً تو قرآن حکیم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَاذْكُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاخْرَجَهُمَا اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ اهبطوا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں یہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس احسنش کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، عَصَىٰ آدَمُ وَغِيْرُهٗ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مشورہ رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحتہ نہیں فرمایا، اور ایک جہگہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِن لَّآ تَدْرِي لَٰكِنَّا ۖ كَآذِبٌ كَذِبٌ کی تو یہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت خوات

کا قصور محانت نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقبل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (مستربط)

لقاب اور نصاب میں فرق (۱) قرطبی نے فرمایا کہ لفظ ثواب بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے إِنَّ اللَّهَ يُجِزُّ  
الْقَوَّامِينَ (۱۲/۲۲) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ الثَّوَابُ الرَّجِيحُ، جب بندہ  
کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب  
اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ ثواب  
کا حکم ہی، اسی معنی کا دوسرا لفظ ثابث ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ  
لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور  
القباب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر مشرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ  
معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

مکہ سے توبہ قبول کرنا کا اختیار | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہے۔ ہونہ نصاریٰ اس قاعدے سے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں

مسبب تلام ہو گئے، کہ پادریوں اور پیسروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے جمناء معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا، آج بھی جہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا رشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم کا زمین پر اترنا اس کے طور پر نہیں  
بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا

میں غالباً حکمت یہ ہو کہ پہلی آیت میں زمین پر اُتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اُتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر جو خلافتِ الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور محنتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تنہائی آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔



دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوابوں کا  
اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو  
انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد  
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام  
انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس  
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز  
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں مسترایا کہ لا حزن علیہم بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور  
اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے ذلہم یتحزنون فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے  
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ  
کی دی ہوئی ہدایات کی بھل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا  
خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا  
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کسے بے غم نباشد

وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے  
میں منکر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مسترآن مجید میں دوسری جگہ  
بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا ان  
پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۱۷۰:۲۵) اس سے  
معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا  
آمل حق تعالیٰ کے ساتھ سمجھ لیا اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ  
جو بچھا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی  
مصلحت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی  
ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں  
یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے  
فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء  
و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا  
سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَادْخُلْ فِيْ نَفْثِہٖ خَیْفَةً مُّؤْتًی (۱۷۰:۲۵) کیونکہ یہ  
فطری اور طبعی خوف ابتدا بہ حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل بھل گیا۔  
اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس  
بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں  
گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت ذِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی  
ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ  
ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو  
ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی ہو گناہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے  
کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاِیُّہَا اِسْرَآءِیْلُ اِذْکُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو

بِعَهْدِیْ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیْ فَاَرْهَبُوْنَ ؕ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَّکُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ؕ وَاٰمِنُوْا

کو جو میں نے تماری ہر پہچ بتا دیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیْ فَاَتَّقُوْنَ ؕ وَلَا تَلْبِسُوْا

ذو میری آیتوں پر مول تمہارا اور مجھ ہی سے بچتے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتُکَفِّرُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ

سچ میں غلط اور مت چھادو سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر | اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)



دعا و غم سے نجات مرتب ہوگا۔  
کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا۔  
اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔  
خوف، آئندہ پیش آئے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد  
مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام  
انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس  
سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز  
میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں مسترایا کہ لا حزن علیہم، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور  
اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے ذلک لا ھم یحزنون فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے  
کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ  
کی دی ہوئی ہدایات کی بھل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا  
خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا  
جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کسے بے غم نباشد

وگر باشد بن آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے  
میں منکر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مشرآن مجید میں دوسری جگہ  
بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا ان  
پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَدْخَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۱۷:۲۵) اس سے  
معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا  
آمل حق تعالیٰ کے ساتھ سمٹل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ  
جو بچھا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی  
مصلحت یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی  
ہیبت و جلال تو ان پر اور سب زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں  
یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے  
فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء  
و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا  
سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَادْخُلْ فِیْ نَفْیْہِ خَیْفَہٗ مُؤْمِنِی (۱۷:۲۵) کیونکہ یہ  
فطری اور طبعی خوف ابتدا بہ حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل بھل گیا۔  
اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس  
بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں  
گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت ذَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی  
ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ  
ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو  
ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی ہو گناہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے  
کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاِیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اٰتٰیْکُمْ عَلَیْکُمْ وَاذْكُرُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پر یاد کرو

بِعَهْدِیْ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاٰیٰتِیْ فَاَرْهَبُوْنَ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝

کو جو میں نے تماری ہی پہنچ بتا دیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَاٰیٰتِیْ فَاَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَلْسَبُوْا

ذو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو، اور مت ملامت

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْسَبُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)



یاد کر دیجئے کہ لوگ میرے ان احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر ان کا حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارا لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں، اور پورا کر دیجئے میرے عہد کو یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان تشرآن کی اس آیت میں ہے وَقَعْنَا اٰخٰی اٰدَمَ مِیثَاقًا بَیْنَیْ اَیْمٰنَہُمْ وَنَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ سُلُوٰتِہُمْ (۱۲: ۵) پھر ان لوگوں کو بتائیں کہ تمہارے عہد کو یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں لکھا ہے فَاٰمَنَ اٰدَمُ اور صریحاً یہی ہے اور وہ اپنے عوام معتمدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جائے گی، اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی تشرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلائے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، یعنی تورات کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تعریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی، اور مت ہنو تم پہلے انکار کرنے والے اس تشرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے) ان سب میں اڈل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک ان کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا ہے گا، اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاد ضہ حقیر اور خاص مجھ ہی کو کہ طور پر ڈرو، (یعنی میرے احکام) چھوڑ کر یا ان کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیا سے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ ان کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَلَا تَلْمِزُوا اٰیٰتِیْ بِاَلْبَاطِلِ اور مخلوط مت کر دو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کر دو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

## معارف مسائل

**رابطہ آیات** | سورۃ بقرہ تشرآن کے ذکر سے شرودع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ تشرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مومنین اٹھائیں گے، اس کے بعد ان لوگوں کے مذاہب شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لاتے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، اور تیسرا ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مومنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور تشرآن مجید کا اہم ذکر کیا گیا، اور بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی درجہ بندی میں جن کا ذکر اور پر آیا ہے کھلے کافروں متنافی، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پر بڑھ امتی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے تشرآن میں ان لوگوں کو امتین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر ایمان لاتے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم ان کے پاس تھا، انکے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصا آرمی کہلاتے تھے، ان دونوں کو تشرآن میں اس بنا پر اہل کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں مسترزاد قابل اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات ان پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ جو مکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تین آیات آخر پارہ السجد تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے آزل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر ان کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی ساٹھ آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوت ایمان اور چار میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیل خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر پھر اہتمام کے لئے یٰۤاَیُّہَا اَشْرَکَیْنِ اٰیٰتِیْ شرمناکرا نہیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور قوی بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰۤاَیُّہَا اَشْرَکَیْنِ۔ اسرائیل عبرانی زبانی کا لفظ ہے، اس کے معنی عبد اللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، تشرآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب کیا گیا۔



نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عیسیٰ یعنی اللہ کی عبارت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، تو ریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؓ اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكُتِبَ عَلَيْهِمُ اسْمُهُمْ إِذْ أَخَذَتْهُمُ إِذْ هُمْ أَوْسَىٰ** (یعنی یہاں) **فَقَرَأْنَاهُمْ أَصْنَافًا** (دیا پڑھا ۶۰ سورہ مائدہ: آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم مادہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس متقدمین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشا کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ متقدمین میں گئے آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) امت محمدیہ کی ایک خاص فضیلت اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور امت محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا **قَدْ كُفِّرَتْ عَنْكُمْ**، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، اس میں امت محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق حسن و نعم سے بلا واسطہ ہو، یہ حسن کہ پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری امتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ حسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایضاً عہد واجب اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ

مضمون آیا ہے: **أَوْ كُفِّرُوا بِالْعُقُودِ** رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا دی جائے گی کہ خشر کے میدان میں جہاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اسی جیسی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدان خشر میں رسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہو اس پر **أَوَّلَىٰ كَافِرٍ يَلُمُ**، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب کھٹا جاتا ہے

یہ فرمایا کہ پہلے کافر بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر ٹپے گا، اس پہلے کافر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بنکر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

**فَأَوَّلَىٰ**۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اسی طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب نیکی عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، شران مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) **وَلَقَدْ كُفِّرُوا بِلَآئِنِي**، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہے جو آیت کے سابق لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم شران پر رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح بتلا کر یا چھپا کر اس کی اجرت لینا کیسا اجرت لینا جائز ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہے

کہ تعلیم شران پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہ اہل سنت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے متذہب منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شران کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا شاہدہ کیا، کہ شران مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین



کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم مسترآن کا سلسلہ بحیرہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم مسترآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر نشوونما دینا چاہئے، کہ تعلیم مسترآن پر اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم مسترآن کی طرح دین کی بقتا موقوف ہو، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم مسترآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (رد مختار، شامی)۔

(۱۶) ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن پر علامہ شامی نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفا بعلیل اجرت لینا یا تعاقب حبانز نہیں میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ تعلیم مسترآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاحسین فقہاء نے جائز مسترآر دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں غفل آنے سے دین کا پورا نظام بخل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مروجوں کو ایصال ثواب کیلئے ختم مسترآن کرنا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعہ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین دہلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے قبر پر مسترآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم مسترآن کرنا صحابہ و تابعین اور اسلاف امت سے کہیں منقول نہیں، ان کے بعد مت ہے (شامی، ص ۱۴۴ ج ۱)۔

(۱۷) حق بات کو چھپانا اس میں آیت دَلَّا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الْوَ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط حیل سے مٹا کر ناحسرام ہو میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوت یا طبع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہو، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام شریعتی نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازم تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ابو حازم تابعی سلیمان بن عبد الملک کے ساتھ مذکور ہو کر ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ میں اور جبہ و زقیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کبھی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اسے ابو حازم یہ کیا ہے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازم نے کہا، آپ کی میری کیا ہے مروتی اور بیوفائی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے شہرور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازم نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی!

سلیمان نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاکم بن حاکم کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح منسرایا، آپ نے غفل کی۔

اس کے بعد سلیمان نے زوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اسے ابو حازم، یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے دیران میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ منسرایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھانگا ہوا غلام بچہ کر آقا کے پاس حاضر کیا جاتا ہے۔

سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش میں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کر دو تو تیرے گناہ گار سلیمان نے دریافت کیا کہ مسترآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (۱۱۳، ۱۱۴) یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار و دورخ ہیں۔

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ ہمارے پرگھادی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (۱۵۷) یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔

سلیمان نے پوچھا اسے ابو حازم اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو مروت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ زانض و اجابت کی ادائیگی حرام چیزوں



سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ اس سے پہلے احسان جتانے اور نہ مال مٹول کر کے ایذا پہنچانے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہو؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہو؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بچ دیا، سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح منسرایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا، اے امیر المؤمنین تمہارے آباء و اجداد نے بڑے شمشیر و گول پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہو تاکہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو مستحکم کہا کہ ابو حازمؒ تمہارے یہ بہت بری بات کہیں ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بڑی بات نہیں کہیں، بلکہ وہ بات کہیں جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں، لَیْسَ لَکُمْ مَلٰئِمٌ عَلٰی شَیْءٍ (۲۰: ۲۷) یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ منسرایا کہ

مختصر چھوڑ دو عزت خستیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، منسرایا، خدا کی پناہ سلیمانؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلاؤ اور جنت میں داخل کرو، سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں منسرایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمانؑ آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنائیے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہو تو اس کے بال بچہ کو اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی غلامی و حلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد تنوگیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خطا کے ساتھ ان کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ تنویر بناؤ میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجاؤ کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں اور نہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۱﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور گھجک نمازیں گھجکے والوں کے ساتھ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْلُونَ

کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو



الْكِتَابِ مَا أَفْلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۶۱﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ لِذِكْرِ

کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿۲۶۲﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّ هُم

البتہ وہ بھاری ہے مگر اپنی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ دوبرہ ہونے والے

مُتْلَقُونَ بِرَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۲۶۳﴾

میں اپنے رب کے اور یہ کہ ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو یعنی مسلمان ہو کر اور دو رکعت کو اور عاجزی کرو و عاجزی کرنے والوں کے ساتھ و علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء ان سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا کیا غضب ہو کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو، اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو یعنی اگر تم کو حجت مال و حجت جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے (یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حجت مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو میں نے کہ اور بیشک وہ نماز دشوار و غیر ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ بیشک غنہ والے ہیں اپنے رب سے اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں وراثت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی مدد ہیں۔

## معارف و مسائل

ربط آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلایا کہ ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلے تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور حاصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ————— اور اگر تم کو حجت مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حجت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی درجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی تسراوانی کی ضرورت نہیں ہے گی نہ اس کی بھنت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حجت جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حجت جاہ و منصب اور تکبر و عشرہ گئے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی بھنت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو گا مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معینہ اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان بہت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں پیشہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے خصوصاً نماز کی پابندیوں کا تو اس دشواری کا کیا علاج ہو گا؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

حاصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان کا قلب جو مرکب و میدان خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضا، بھی آزاد ہیں، اور منت از سر اس آزادی کے خلاف







اجاعت نماز کے احکام | نماز کا حکم اور اس کا مندرجہ ہونا تو لفظ "آفِیْہِوُ الصَّلٰوۃُ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ صیغہ الشرحی کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے بلکہ غرض شریعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَا صَلَٰوةَ لِبَعْدِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ (رواہ ابو داؤد)

"یعنی مسجد قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد میں جائز ہے۔"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز اور ہر تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت | اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازل توان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گھانٹاں اور رخصت نہیں پاتا (آخر جہ ابو داؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَمِعَ الْيَقِيْنَ اَوْ تَلَمَّحَ يَجِبُ عَلَيْهِ اِلَّا مِنْ عُلْيَا (صحیحہ القرطبی)

"یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں بھٹی مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو۔"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ اشعرمی وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا غرض کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکتی ہے، اگر مگر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء فقہاء صحابہ و تابعین کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فخر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر و نہی کو صیغہ الشرحی کے دو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔ اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقہ الاہل حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (مشرقی) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن حدیث میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے نبی کو ایسا پایا ہے کہ منافق بنی النفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دوا آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرمادیا کہ وہ سنن ہدی میں سے ہے جس کو فقہاء سنت مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذر شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنائے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد دیران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ شبہ غامض سننا ہے، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲/۸ ج ۱)



جے مل واعظ کی مذمت | اَنَّا مُرْسِدُونَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَنَنْسَوْنَ اَنفُسَهُمْ اس آیت میں خطا اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جا رہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو، اور دین اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہو اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود انسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈراتے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج میرا گذر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی لپٹیوں سے کترے جا رہے تھے میں نے جبریلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں! جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیا دار واعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خیر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیوں نہ گر بیٹھے گے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے: ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے (ابن کثیر)

سبا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا! لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص متوجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کر دوں گا، تو تجربہ نگار یہ نیکے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے پاک ہو! حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو بھی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ بیٹھیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدہ جحیم الامتؓ تھا تو نبیؐ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَنَّا مُرْسِدُونَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَنَنْسَوْنَ اَنفُسَهُمْ کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دلوں میں فرق واضح ہے، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو وعظ کیلئے جائز ہو نہ غیر واعظ کیلئے؟ پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس پست عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی حبس کر لیا جائے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا امتیاز ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ (نسائی) اور ان کا عیال باریاں | حُتِّ مال اور حُتِّ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان اور ان کا عیال | کی دنیاوی زندگی اور آخرتی زندگی بیکار ہو جاتی! اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز زلیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حُتِّ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:

۱۔ کج فہمی اور بغل پیدا ہوتا ہے، جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، اگر سناشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرض پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے ہشیام میں ملاوٹ، تاپ تول میں کمی، رشوت سستان، صحر و فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے نبھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون چھوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ



اضافہ کر دیں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنادہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔  
ہم حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں  
کرتا جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پرے معاشرہ کا امن و چین برباد  
کر ڈالتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال محبت کا نظر آئے گا، اگر اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی  
حقائق کی پامالی، ہوس اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز  
خرابیاں جنم لیتی ہیں جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ  
تجویز فرمایا: **وَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْخَالِصِ** اور مرد و صبر اور نرمی سے، یعنی صبر  
انہستیا کر، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کر، اس سے سخت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال  
کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات  
کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت، ہاندھ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گذرے گا لیکن رفتہ رفتہ خواہشات  
اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمام آدمی عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی،  
اس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حسبِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی  
ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی  
کا تصور رہنے لگے گا جس سے تکبر و غرور راجحہ جا گھٹ جائے گی۔

**وَالْإِسْلَامُ الْخَاشِعِيَّةُ**، قرآن سنت میں چھان خشوع کی ترغیب کو جو اس کے مراد وہ قلبی سکون و  
انکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے  
نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب  
متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی  
باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصد اظہار کرنا بھی پسند فرماتے ہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر  
بھکانے بیٹھا ہے، فرمایا، سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ بھی نماز کا ارشاد ہے کہ مٹا پہنے، مٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع  
نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریعت و ذلیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے  
جو تم پر سنسنی کیا ہے اسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلوب کو فانی کر دے۔

حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ، حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔  
خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و نیت سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور  
مذہب ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو محذور ہے۔ (قرطبی)

**فَاتَّقِ اللَّهَ**، خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خشوع بھی ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی  
بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تفسیراً یکساں معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور لہجہ  
کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو،  
قرآن کریم میں جو خشوع لکھا ہے اسے (آواز میں پست ہو گئیں) اور خشوع کا لفظ بدن کی تواضع اور  
انکساری کے لئے ہوتا ہے، مفسرین یکجہ میں ہیں،

**فَتَقَلَّبْتُ أَعْيُنَكُمْ لَمَّا خَضِعْتُمْ** | آپ ان کی گردنوں میں اس کے ملنے جھک گئیں۔  
نماز میں خشوع کی نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے،  
**فَقِي حَيْثُ** | اور نماز قائم کر کے یاد کرنے کے لئے،  
اور نماز پر کھفت یاد کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جل شانہ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا  
فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے،  
**وَلَا تَكُنْ تِقًا كَمَا تَكُنُ تِقًا** | اور تو غافلوں میں سے نہ ہو۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، نماز تو صرف تمسک اور تواضع ہی ہے، جس کا  
ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسک اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور ہر ایموں سے بے روک سکے وہ اللہ سے  
دوری ہوتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور ہر ایموں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت  
کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا کہ اگر ان کا یہ تقاضا  
ہو کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوری، حسن  
بصری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسک  
لیکن امام اربعہ اور مجاہد و فقہاء نے خشوع کو شرط صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے نماز کی روح قرار  
دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ بھیر تحریر کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی



نیت کرے، باقی نماز میں اگر شروع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں شروع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اعضائے ظاہر کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حد سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور شروع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے شروع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ شروع کے اولی مرتبہ کو شرط کیا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت بعض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

شروع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستقرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں شروع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف بالالطاف سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدا و صلوٰۃ میں شروع کو شرط قرار دیا گیا۔

نماز شروع کے بغیر بھی امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ شروع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود بالکل بے فائدہ نہیں ہیں اللہ سے یہی امید کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھو لایں بالکل تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں کیونکہ ہر حال اُس نے ادا سے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فانی بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا در حیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام ناسرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے پتہ چلے گا کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتنا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ ہم درجہ کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی معذور بہر کو بخشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوا النِّعَمَ الَّتِيْ اٰتٰىكُمْ وَرَبُّكُمْ

اے جنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ فَنْسُكُمْ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا يُثْقَلُ مِنْهَا

تمام عالم پر ۱۰ اور ڈرو اس دن سے کہ اس دن آنے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصہ تفسیر ۱۱ اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو، جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس بات کو یاد کرو،

کہ میں نے تم کو دھماں خاص بڑاؤ میں، تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی، مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فاصلہ کا :- اس آیت میں خطاب جو بحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور جو ایسا ہوتا ہے، کہ باپ راوا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر شاہد ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور دوسرے ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہو، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے، جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرفدار کی جمل سکے گی۔

فاصلہ ۱۲۔ آیت میں جس یوم کا ذکر ہوا اس سے قیامت کا دن مراد ہو، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہ جسے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیاقی کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچالائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدین ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہو کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرفداری کی صورت یہ ہوگی کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زبردستی محال لائے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدین ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ يَسُوْهُمُوْكُمْ سُوْعَ الْعَذَابِ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور یاد کرو اس وقت کہ جبکہ رانی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کہتے تھے تم کو برا عذاب ذبح کرتے تھے

اَبْنَاءُكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی



عَظِيمٌ ۵۱

طرف سے بڑی

**خلاصہ تفسیر** | اور چون خاص بڑی باتوں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم لوگوں کے آباء و اجداد کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، اگلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد و ذرہ کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لو کیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہوجائیں) اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری تمنا تھا۔

**فائدہ:** کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے ماہاگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور بارہائی دنیا مراد ہے چونکہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب بھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھرنے کا اور تم کو اور فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ۵۱ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۵۱

بجھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

**خلاصہ تفسیر** | اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریا سے شور کو پھر تم نے (ڈر بنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون

کو (میں فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

**فائدہ:** یہ نعمت اس وقت ہو کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پہچے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو بار ہو گئے، فرعون کے پیچھے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب یہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے رتوریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر چالیس رات کا زمانہ ہو گیا تھا، پھر تم لوگوں نے دستکش کے لئے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ علیہ السلام کے (جانے کے) بعد اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر مکر باندھ رکھی تھی کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے۔

**فائدہ:** یہ نعمت اس وقت ہو جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض مصر میں واپس آکر پہنچے گئے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر پھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کو وہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد انظار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راحہ (جو غلو سے معدہ کی تنجیر سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہوا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مثل جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جب بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵۱

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

**خلاصہ تفسیر** | پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتی



پچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ ۱۰۔ اس توبہ کا بیان کنگے کی بھری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نمونہ اللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ طلبتہ ہو کر یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۴﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو تافق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چیزیں، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ ۱۱۔ فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شریعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں (کیونکہ شریع سے نماز اعتقادی اور عملی خستہ لافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے) یا معجزوں کو کہا کہ ان سے بچے، جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصلہ ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بَاتِعَاذِكُمُ الْعَجَلُ فَتَوَبُّوا إِلَىٰ بَارِعِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ

بہمیشہ بنا کر سو اب توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِعِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۵﴾

معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس کو سالہ پرستی کی جوڑ سے اسوہ تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی، بعض آدمیوں کو (جنہوں نے

گوسالہ پرستی کی قتل کرو یا یہ (عقل و آراء) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اس عقل و آراء کرنے سے حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ ۱۲۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا بارجہ توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ بَهْرَةً فَأَخَذْنَا لَكُمْ

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین مذکر ہی تجھے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آیا

الصُّبْحَةَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۶﴾

تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں نے دیوں کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ

طور پر دیکھ لیں، سو اس گستاخی پر تم پر کوک بجلی کی آ پڑی، اور تم اس بجلی کا آنا، آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ ۱۳۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ

ہماری کتاب ہے، توبہ شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے اذان الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ

لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو

بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر ان پر بجلی آ پڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، رملکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے،

ثُمَّ بَعَثْنَا مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۷﴾

پھر اٹھا کر آیا ہم نے تم کو مر گئے پچھے تاکہ تم احسان مانو۔



## خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:۔ موت کے لفظ سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پہل سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل میں ہی برگران بہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لپکا کر کس تدبیر سے ان کا کام تمام کر دیا ہوگا، پھر اس جہت سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَلَقَدْ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور آٹا منہ پر من اور سلویٰ

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يَظْلِمُونَ ﴿۵۰﴾

نقصان کرتے رہے

## خلاصہ تفسیر

اور سایہ لگن کیا ہم نے تم پر ابر کو میدانِ قیہ میں، اور (خزائنِ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور طیرس اور تم کو اجازت دی کہ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، اور مردہ لوگ اس میں بھی خلافِ بات کر بیٹھے اور اس سے انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:۔ دونوں قصے وادیِ قیہ میں واقع ہوئے، وادیِ قیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا پہلی وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی وہ پڑے، اور ملک شام میں عاتق نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عاتق سے چاد کرو اور اپنی اہلِ عبل کو اُن کے قبضہ سے بچھڑالو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مقرر ہوئے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عاتق کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو جہتِ اُردیشیہ اور چارہ سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی پے سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مقرر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مقرر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے آئے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو وادیِ قیہ کہا جاتا ہے، قیہ کے معنی ہیں سرگرداں اور پریشان ہونے کا۔ وادیِ قیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو منہ دسلوئی نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اس کو منہ کھا گیا ہے، اور طیرس اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھائی نہ تھیں، یہ اُن کو کپڑے دیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلویٰ کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور طیرس کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہو، لہذا اس جلیبیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے نکل کر دی گئیں، اُن کو بانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لکھی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چٹے پتھر پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر مستطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے ماسے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَاكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاؤ جہاں چاہو

رَغَدًا وَأَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

خراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخدا تو بخدا کر دے تمہارے گناہوں کو



## وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیک والوں کو

**خلاصہ تفسیر** اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کر دے بھگائی سے، اور یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو دروازہ میں داخل ہونا عاجزی سے، جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں تو سب کی، اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

**فائدہ** بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فقرہ بھی زمانہ وادی تیرہ کا ہے کہ جب من و سلوی کھاتے کھاتے اُٹھ گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آیا ہے، تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخير ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ ہے، اور کوئی اشکال دیگر مفتخرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیرہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یروشع علیہ السلام نہیں تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول ازل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب جز من و سلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہو گا کہ یہ درخواست تھی گوستاخی، لیکن خیر اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو محاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

قَبَلُ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَىٰ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاص اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا ہم نے

## الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

**خلاصہ تفسیر** اس بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور طرح خلاص تھا اس کلمہ کے جس کے کہنے کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سادی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

**فائدہ** ۱۔ یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلاص یہ تھا کہ جُطَّةٌ یعنی توبہ کی حسب گہ ازراہ تفسیر حنفیہ فی شیعہ و غیرہ (یعنی مذہب میان جو کہ) کہنا شروع کیا، وہ آفت ساری طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمرانوں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے۔ (قرطبی)

## معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں جُطَّةٌ کا حکم شریعی یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو یہ لکر جُطَّةٌ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل الٹ گئے، جُطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی میں ہوں کہ نظر انداز کرنے کے تھے، اور جُطَّةٌ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مامور یہاں کوئی تعلق نہیں الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ مسترآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا ستمناز یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی تصریح الفاظ بھی مقصود اور ادب عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک ایلہم، النجیات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود جن الفاظ سے منقول ہیں انہیں الفاظ میں اور اگر نا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام مسترآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام



متعلق ہیں وہ صرف اپنی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں بھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآنی صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں تَبَدَّلَ الْكَلِمَ الْاَلْفَاظِ لَا غَيْرَ الَّذِي يَقِيْلُ لَهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو توبہ کے لئے جو الفاظ حفظ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماحول تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی الٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصور نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، مستشرقین نے امام مالک، شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر مشرطیہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرین، قاسم بن محمد وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا قائل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اس غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کے میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعا پڑھے، اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا مِّنْ اَمْرِ دِيْنِيْ وَبَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا مِّنْ اَمْرِ دِيْنِيْ اَزْ سَلَمَتٍ، اس شخص نے تَبَيَّنَ کی جگہ وَبَيَّنَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ تَبَيَّنَ پڑھا کرے جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

نَهَى اللّٰهُ اَمْرًا سَمِعَ مَعَالِيْقُ  
فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا  
فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا  
فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا  
فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سننا تھا اپنی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔  
مگر جہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنے ہیں، اپنے قصد سے ان میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلخیا کما سمعہا کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سننا ہو وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی منہ رقی نہ آئے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبی نے اس کی تائید میں مسرایا کہ خود ہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسول اللہ کے بجائے نَبِيٍّ ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبی میں صفت مدح بہ نسبت رسول کے زیادہ ہے، کیونکہ رسول کا لفظ تو قائل کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبی کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) اسی کو عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ بھی اسی قسم ازل میں داخل ہیں جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ  
فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ نَبِئًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ  
سُورۃ اعراف ۱۶۰

اور جب ہانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر  
فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ نَبِئًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ  
سُورۃ اعراف ۱۶۰



كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱

کھاؤ اور پو اور پو اللہ کی روزی اور نہ پھر ملک میں فساد بجائے ۔

**خلاصہ تفسیر** اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور (پینے کو) پو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حذر (اعتدال) سے مت بکلو، فساد (رفتنہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا۔ یہ قصہ بھی دادی تہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوٹی اور پینے سے مراد پانی تھا، اور انسرائی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہوا، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی فکر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

## معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقا کی دعا انسرائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لاشی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقا کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتسقا کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز ہتسقا کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقا کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقا خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیوں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ رہا کرو اسلئے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

ایسی درجہ کار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلہری اور گیہوں

وَعَدَائِهَا وَبَصِلِهَا قَالِ الَّذِي تُدْعِي هُوَ الَّذِي يُؤْتِيكَ مِنْ بَدَنِكَ

اور مسرور اور پیاد، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَدَنِكُمْ وَلَكُمْ أَلْفُ تَحِيَّاتٍ يَوْمَئِذٍ وَكُنْتُمْ تُخْلَعُونَ

بہتر ہے، انہو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر ذلت

الدِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُ وَبَغَضُ بَيْنَ اللَّهِ وَلِذَلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّاتِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،



كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱

کھاؤ اور پو اور پو اللہ کی روزی اور نہ پھر ملک میں فساد بجائے ۔

**خلاصہ تفسیر** اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو کھاؤ اور (پینے کو) پو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حذر (اعتدال) سے مت بکھو، فساد (دفتہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا۔ یہ قصہ بھی دادی تہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوٹی اور پینے سے مراد پانی تھا، اور انسرائی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار ہیبت بڑی غلطی ہوا، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ محض سطحی فکر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

## معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقا کی دعا انسرائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقا کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتسقا کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا بھی خاص نماز ہتسقا کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقا کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقا خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیوں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ رہا کرو اسلئے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا وَفُومِهَا

ایک ہی درجہ کے کھانے کے نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلہری اور گیہوں

وَعَدَئِهَا وَبَصِلِيمًا ۚ قَالَ أَلَسْتَبْدِلُ الْوَنَ الَّذِي هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ

اور مسرور اور پیاد، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ وَصُرِبْتُمْ عَلَيْكُمْ

بہتر ہے، اتر کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكِنَةُ وَبَاءٌ وَبِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَلِذٰلِكَ يَآئِزُهُمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ ۚ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّاتِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،



## ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱﴾

یہ اس لئے کہ انہیں مان تھے، اور حد پر نہ رہتے تھے۔

## خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اسے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پیر و گار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگلا کرتی ہیں، اسگ (دھواں گلاوی) (ہوئی) (گیہوں) (دھواں) (مسور) (ہوئی) (پیاز) (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، (دونوں) درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح، (جم غنی) ان پر ذلت رکھ دو سروں کی (جگہ) میں قدر نہ رہی، اور پستی رکھ خود ان کی طبائع میں اول و پسری نہ رہی، اور سخت ہو گئے غضب الہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (دھواں) کہ وہ لوگ جاتے تھے احکام الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (دھوتا تھا) اور (زیر) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (دھواں) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرہ (اطاعت) سے بھل بھل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی وادی تہہ کا ہے، من و سلویٰ سے انکار ان زکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بود و جود کھاؤ کماؤ۔

اور منجملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیڈروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور و شور و جہال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جاتا تھا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کر دے گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت: وَإِذْ نَادَيْنَا رَبَّكَ أَنْ لِيَجْعَلَ عَلَيْنَا رَحْمَةً تَقْرَأُ الْقِيسَةَ مَنْ يَسْتَوْفِيهِمْ سَوَاءٌ الْعَذَابُ الْآخِرُ مِنْ ذِكْرِهِ، (موجودہ اسرائیل حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن غنا و اور ضد نے اندھا بنا کر کھا تھا۔

## معارف و مسائل

یہودیوں پر اہل ذلت کا مطلب اور اسرائیل آیات مذکورہ میں یہود کی سزا و نیا میں دائمی ذلت و مسکنت کی موجودہ حکومت سے مشابہ اور اس کا جواب اور دنیا و آخرت میں غضب الہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صاحبہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا تَزِلُّوا الْكَوْنُ مَسْنُونٍ لِّينَ مِنْ وَجْهِ هَذَا مَسْنُونٍ لَهُمْ وَضُرِبَ عَلَيْهِمُ الصَّغَارُ، یعنی وہ کہتے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر رہیں گے، جن کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور ان کی پر غلامی کی علامتیں لگائے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم اهل القبالات یعنی الجزیہ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورہ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

حُصِّنَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ أَيْمَنًا  
تُعْطَوْنَ إِلَّا يَتَحَدَّوْا اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
وَقَدْ نَسَّيْنَا - (۱۱۲: ۱۱۳)

تجاویز گنی ان پر پے قدری جہاں کہیں جائیگے  
مگر ان ایک تو ایسے ذریعہ سے جو ان کی طرف  
سے ہوا اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف  
سے ہو

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا حبزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر افعال قرآنی میں مِنَ النَّاسِ فَرِيَاہُ مِنَ الْمُتَسَلِّطِينَ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ ہشتاد و چل من اللہ اور جبل من الناس کا اگر بقول کثافت ہشتاد متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہودی ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز ان دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے جو زمین وغیرہ اس ذلت و خواری سے بھل جائیں یا معاہدہ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کے



ہمارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریریں استثنائے متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خواری رہیں، مگر قانونِ آبی کی دست میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہو گئی، اور اس سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ تران کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت بھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کر کے رکھنے کے لئے ان کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی ان کی نظروں میں ہیں، ان کے شرراں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد و تعجبی حق الثانی کے ہمارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں ان کی شریعت، ان کی تہذیب سب سے پہلی ہو، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کیسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے قدر تفریق کے باوجود ان کی سلطنتیں بت پرستوں کی سلطنتیں، لائبریلوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیل چکی ہیں ان کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے ہوا ان کا ثواب

عِندَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر غدر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ مذکور فرمایا کہ، یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانون شریعت) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خائن لا۔ قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں خستیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری لگاؤ، اطاعت و محبت یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہو، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا حق نجات اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پورا نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا امور و عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنا، تو اصل میں مخالفت کو ہے، لیکن اس میں نہکتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہو سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفت موافقت پر مدار ہے ہمارے عنایت کا، سو اگر مخالفت بھی خستیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالفت کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔



وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا

اور جب یا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تھا کہ اوپر کوہ طور کو کہ بکڑو

مَا أَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ۖ وَآذِكُمْ كُرُومًا فِيهِ كَعَلَّكُمُ تَتَقُونَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

**خلاصہ تفسیر** اور وہ زماں یاد کرو جب ہم نے تم سے قول وشرار کیا کہ قرآن پر عمل کریں گے اور اس قول وشرار لینے کے لئے ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تھا کہ اوپر

(محازات میں) معلق کر دیا، (اور اس وقت کہا کہ) (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی قرآن) مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

**فائدہ**۔۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو ازل تو انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہو تب مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے) غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انھوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ ستر مادیات کا قصہ کہہ دیا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا ہو نہ ہو سکا ہے، تو کچھ تو جہلی شرارت کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا جیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

**ایک شبہ کا ازالہ** یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اذل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عساکر مخالفت اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، ان کے لئے ہر حکمت میں ذریعے ہوتے ہیں یا اٹھا کر قتل کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْنَاكَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی ہرمانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہو گئے

**خلاصہ تفسیر** پھر تم اس قول وشرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو اس عہد شکنی کا مقتضایاً تو یہ تھا کہ ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ جو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک جہالت سے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ و بال اعمال میں مستلزم ہو گئے)

**فائدہ**۔ حق تعالیٰ کی رحمت عامہ دنیا میں مومن کا فرسب پر ہے، جس کا اثر عینیت اور دنیوی راحت ہو، رحمت خاصہ کا بطور آخرت میں ہوگا، جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔ بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔ اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔

اس معنوں کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم خوب جان چکے ہو جنھوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلَفُوهَا وَوَعْدَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنیوالوں کی واسطے

**خلاصہ تفسیر** اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (حدیث شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز



بھل کر شکار کر گیا، سو ہم نے اُن کو دیکھ کر قریٰ تکوینی سے منع کرنے کے لئے، اکبر دیا کہ تم بندہ دلیل بن جاؤ اور چاہے وہ بندہ ولی کے قاتل میں سے ہو گئے، پھر ہم نے اس کو ایک دراقہ مرحمت کیا اور اُن کو دلوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معادے اور ان لوگوں کے لئے بھی ہو مابعد کے زمانے میں آئے ہیں، اور دیزاس دراقہ کو موجب نصیحت دینا، خدا سے اور قریٰ لوگوں کے لئے۔

**فَانذَرْنَاهُ**۔ یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہندو کا وہ مقام اور حالت کے لئے مقرر تھا اور اصل کا شکار بھی اس روز مروج تھا یہ لوگ ہندو کے کسانے آباد تھے اور پھل کے شوقین تھے، اُس قسم کو زمانہ اور شکار کیا اس پرانہ طرے کی طرف سے منع صورت کا عذاب نازل ہوا لیکن ان کے بعد سب مرتکبے۔ اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے درجہ سب کے لوگ تھے، فرمانبردار اور مشرمان، قریٰ فزاؤں کے لئے قویہ واقعا انشروالی سے قویہ کرنے والا تھا، اس لئے اس کو نکال کر فرمایا اور نصیحت بجاواؤں کو یہ واقعہ فرمانبرداروں پر قائم رکھنے والا تھا اس کو نصیحت بخلائے فرمایا۔

## معارف و مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا جلیہ ہوتا اس آیت میں یہودیوں کے ہر اعتدالین حدود سے تجاوز کا ذکر اس جگہ پر پہل پہل ہوتا ہے۔ اگر کسی کو سب عذاب بتا دیا گیا ہے اور ایالت سے ثابت کر کہ وہ صاف طور پر حکم شری کی غلات و زری دیتی، جگہ ایسے چلے جتنے سے حکم شری کا ابطال ملتا تھا، خدا ہندو کے ولی پھل کی قوم میں ایک دور کا پھندا لگا کر دیا میں چھوڑ دیا، اور یہ دور زمین پر کسی چیز سے ہندو دی، پھر اقوام کے دور اس کو پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایک ایسا جلیہ میں جس میں حکم شری کا ابطال بلکہ ایک قسم کا پھندا، ہوا اس لئے ایسا جلیہ کرنے والوں کو بڑھ کر مشن مانتہ فرمان قریٰ کر کہ اُن پر عذاب آگیا۔

لگاس سے اُن قبیل جلیوں کی حیرت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے شکستہ میں مشغول ایک سیر مردہ کو کھ کے بدلے میں دیر غلاب، پھر خریدنا سرور میں آئیں پھر اس سے پہلے کا ایک جلیہ خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے یہ بتوایا کہ جلیں کا تیار دہ جلیوں کے ذریعہ کشت کے ذریعہ خرید و فروخت کرو، مثلاً دیر غلاب کو پھر دیر غلاب میں فروخت کر دیا، پھر ان دوروں میں سے ایک سیر مردہ کو خرید کر دینا، پھر حکم شری کی تعمیل مقصود ہوا ابطال و مقصود کو مذاق ہے، اس طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی یہی قیام کے حرام ہے، جیسے کہ بعض

ایسی ہی تہذیبیں بتلائی ہیں اُن کو یہودیوں کے جلیوں کی طرح گناہوں کا مصلحت غلط ہے۔ واقعہ سب سویت یہودی تفسیر شری میں ہے کہ یہود نے اُزل اُزل خواص ملت کے چلنے کے چھاپا کچھیں، پھر ہونے ہوئے سام طور پر شکار کھینچے گئے۔ تو ان میں دو تاجین ہو گئیں، ایک جہانت غلام، مصلحا کی خبی نفسوں نے ان کو تیار کرنے سے روکا، یہ ازانکے تو ان سے ہر روزانہ تعلقات قطع کر کے باطل نگاہ ہو گئے، اور بس کے درستی کرنے ایک میں بہ انشروالی لوگ ہو گئے، دوسرے میں علماء، مصلحا، یہ ایک روز ان کو یہ محسوس ہوا کہ جس جس میں بہ، نافرمان لوگ کہتے تھے، لوہہ بالکل مستحکم ہو کر وہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں منع ہو گئے تھے، اور شکار قمار کے لئے فرما کر ان کے ہر انداز بند بنا دیے گئے تھے اور بڑے خزانہ کی شکل میں منتقل کر دیے گئے تھے، اور شکار مشغول ہندو اپنے شریشتہ اور اور قریٰ والے اسالوں کو پہنچاتے تھے، ان کے قریٰ آ کر دوتے تھے۔

**مَسْجِدَ قَوْمِ كَيْس** اس معاملہ میں بیچ بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی علیہ وسلم سے پرچا ہوئی تھی، جس واقعہ میں مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بانی میں آنحضرت صلی علیہ وسلم سے دو لوث کیا کہ کیا وہی منع مشغول یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں منع صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو ان کی قتل بھی ہیں، (لیکن ہندو زمین ہلاک ہو کر ختم ہو جائے تھے) پھر، اور پھر فرمایا کہ ہندو اور خنزیر دنیا میں پہلے سے ہیں جو خود کو خدا کا حق ہیں، اگر منع مشغول ہندو اور خنزیروں سے ان کا کئی بول نہیں۔

اس موقع پر بعض مغربی نے بھی بخاری کے حوالے سے ہندوؤں میں نہا کی مزامین سنگسری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ بخاری کے نسخوں میں موجود ہے، در واقع بیچ بڑا دشمنوں نے اس جگہ اس کی تفسیل بیان فرمائی ہے۔

**وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَٰبُجُوا بَقَرًا**

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے کہ ذبح کرو ایک کھانے

**قَالُوا أَمَتَّحِينَ تَأْكُلُ أَرْسَالَهُ** اَللّٰهُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ  
وہ بولے کیا تو ہم سے ہستی کرتا ہے کہا پتا نہ دیا کہ ہوں ہیں جاہلوں میں۔

**خلاصہ تفسیر** اور زور نازا اور کو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تو غلات کو کھو کھو دیتے ہیں کہ اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو







بنیادت لایح انداز میں کیا گیا ہے، لیکن اس میں تپسوں میں انرا ساقی ہے جس سے نہری جاری ہو جاتی ہیں جس سے مخلوق خدا کا غذا اضافتی ہے، اور ان دیوؤں کے دل اپنے بھی نہیں رکھتے مخلوق خدا کی مخلیقت و معصیت میں گھل جاتی ہیں اور میں تپسوں میں ان سے کم تاثر پہتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ تپس نسبت اول کے کم زور ہوئے، اور ان کے قلب ان دوسرے کے مقابلے سے بھی سخت ہیں۔

اور میں تپسوں میں جو اس درجہ کا اثر نہیں، مگر یہ بھی ایک اثر ہے وہ کہ خوب خدا سے بچے کرتے ہیں، اگر وہ میں پہلی قبروں سے نہ نفع تر ہیں، مگر ان کے قلب میں تو کم درجہ طہیعت ترین جذبہ انفعال بھی نہیں۔

اَقْتَصِمُوا اَنْ تُوْمِنُوا اَلَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ

اب کیا تم اے مسلمانو! قریح رکھتے ہو کہ وہ مان بھی یہی بات اور ان میں ایک فرق تھا یَسْمَعُونَ کَلِمًا اَللّٰهُ ثُمَّ يَحْرِقُوْنَهُ مِنْ بَعْلِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ كَرِهَتْ اَللّٰهُ اَللّٰہ کلام پھر بول ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ

يَعْلَمُونَ

جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر مسلمان بہر دینی کو مومن بنانے کی فکر پیش کر رہے تھے، اور اس میں سخت احاطہ نے تھے تو یہ سب حالات اور اہانت اور کلام مسلمانوں کی، میرا انقطاع کر کے اس کی کلفت اس آیت کے ذریعہ رفع فرماتے ہیں،

و اے مسلمانو! کیا یہ سب بے فائدہ شکر باب کی تم کو قریح رکھتے ہو کہ یہ دیوڑی اٹھاتے تھے اسے ایمان لے آئے، مگر اٹھادہ ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ان سے ہو چکی ہے کہ ان میں گھوڑا اپنے گڈے میں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور کبھی اس کو کچھ کام کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھتے کہ اللہ دیا کرتے اور (دلتے کہ یہ بھی) جانتے تھے کہ ہم بڑا کر رہیں ہیں، بعض افراطی فلسفہ جاس کا رد والی کامیاب بحث چھیڑیں، فاضلہ و مطلقہ کی جو لوگ ایسے خیال اور اخلاقی نفسانی کے امیر ہیں وہ کسی کے کچھ سننے سے کب باز نہ آئے اسے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔ اور کلام اللہ سے مراد تو قرابت پر، اور سماع سے مراد بواسطہ انبیاء علیہم السلام کے ہے

اور قریح سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفسیر یا دونوں بدل کر لیا گیا ہیں اور کلام سے مراد کلام پر جو ان شقراؤ میں نے بطور تصدیق و توثیق علیہ السلام کو بطور چٹنا تھا اور سماع سے مراد بواسطہ اور قریح سے مراد وہ ہے، لیکن کرنا کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی منہر اور تھا کہ جو حکم تھا کہ اسے اواز ہوئے وہ احاطہ ہے۔

اس مذکورہ بالا سے بھی امر کا صدور و روانہ ہوا ہے نہ ہوا ہوا حضرت علی اللہ علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ وہ لوگ ہیں اپنے اسلاف کے ان اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، وہ اس نے بھی دیکھا ہے وہی دیکھتے ہیں۔

وَ اِذَا قَالُوا اَللّٰهُ اَلْمَنَّانُ وَاِذَا اَخْلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی

اور جب تھے ہی مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے

بَعْضُ اَلْوَا اَلْحُیُّ تُوْمِنُوْا بِمَا نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰیكُمْ لِيَاخُذَكُمْ

پاس تو کہیں ہیں تم کیوں کہہ رہے ہو ان سے بظاہر کیا اللہ نے تمہارے جھٹلاہیں تم کو

بِه عُنْد رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر

اور جب تھے ہی مسلمان ہوئے مسلمانوں سے قریح سے تھی، کچھ ہیں کہ ہم ایک ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہا ہیں جانتے ہیں یہ بیٹھے (مناظرین ہو دی) دیکھ کر بیٹھے دلتا ہیں بہر دینی کے پاس تو ان کی معیت وہ مشرک کے مدعی ہوتے ہیں اس وقت اللہ (دوسرے بہر دینی) سے کہتے ہیں کہ تم رہ، کیا و غلبہ کر کے ہو کہ مسلمانوں کو خوشامد میں، وہ باہیں بظاہر حق ہو تو ان کے مفید مذہب، اللہ تعالیٰ نے (تو بیت میں) تم پر کلفت کر دی ہیں (وہ حق و حقیقت پر مشیہ دیکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو محبت میں غلبہ کر دیں گے کہ وہ (یوں) یہ مضمون اللہ کے پاس بت تھا، یہ کتاب میں آیا ہے، کیا تم راضی ہوئی ہو (بت) نہیں سمجھتے۔

فاضلہ و مطلقہ بھی ایک آواز بت خوشامد میں اپنے ایمان کی حمایت جنگلے کے لڑ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ قرابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہو یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ ان کو ملامت کرتے تھے۔











مَعَارِف وَمَسَائِل

[illegible]

ان کے مددگاروں (ظلمت و گمراہی) کو روکنا لانے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں (دوستانہ) ضابطہ چرتے ہیں جس کے ہم اعلیٰ کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو آزاد پہنچا کر حق الضالہا ہو، ضائع کر دیا۔

آجے اس عہد شکنی پر ملاوت و شکایت کے ساتھ ساتھ ہنر کو بھی بالخصوص بیان فرمایا کہ  
فرشاد ہے۔

کیا تو میں اپنی جگہ کو کہہ کر احکامِ دُور میت اسکے (جس احکام) پر عمل کیا میں رکھتے ہوں اور میں احکامِ ہمایا میں نہیں رکھتے تو اسے کیا سزا ہو جانا چاہئے ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسے حرکت کرے جو رسول اللہ کے دیوئی اور مذکورہ احکامات کو کرنے سے علتِ مذہب میں ذائل ثابت ہو جائے

اور اللہ تعالیٰ رکھ رہے ہیں نہیں ہیں تمہاری اعمال (زشت) ہے۔

فائنل : ہر چہ کہ وہ بیہوشی میں کھڑے ہو کر رہے ، مگر اس کی اسٹاپنگ اور اس کی فٹنگ کو  
 انکار کرنے کی بناء پر کراچی کے قریبی علاقوں میں ان کا سفر بدنام ہو گیا ، لیکن ان کا ہر ایک کام پر عمل کرنے کو  
 کفر سے تعبیر فرمایا ، وہ حالانکہ کتب گنگ حرام کو حرام سمجھ کر بھی کراچی میں ہوتا تھا اس شہ کا جواب یہ کہ  
 جو لوگ گناہ بہت شدید کرتا ہوا ہے اس پر عکارات شروع ہیں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اعلان کیا گیا تھا  
 ہوا ، ہم نے عکارات علیہ میں اس کی مثالیں دلائل دے دیے ہیں ، جیسے ہیں دلائل حرکت کرنے والے  
 کو کہہ دیتے ہیں کہ تو کافر کا اہل ہمارے ، حالانکہ مخالف چاہا تو قیصرانہ نہیں ہے ، اس سے متصور و شہرت  
 نفرت اور اس کام کی قیامت ظاہر کرنا ہوتا ہے ، اور یہی سچ ہیں اس حدیث سے کہ شَرِّكَ الصَّلَاةِ  
 شَرِّكَتِ الْفَاعِلِ مَعَهُ وَفِعْلِهِ کے۔

اس مقام پر بھی دوسرا نزل کا ذکر ہے کہ ان میں سے پہلی سرائین و نیابین وقت و رسوا کی خواہش کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضرت رسول علیہ وسلم کی کہنے نے میں اس اعلان کے ساتھ حاضر ہوئے کہ خلافت وادوی کرنے کے سبب، فی قتل و قید کیے گئے اور یہی انتہی تکب شام کی طرف ہزار دولت و غواہی کا حال بھی ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ فَلَا

یہ وہی ہیں جنہوں نے مولیٰ دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سونپ دیا

يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابَ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٦﴾

ہوگا اُن پر عذاب اور نہ اُن کو مدد دی جائے گی۔

اور جو سزا ان کے لئے یہ کر کہ یہ لوگ ہیں کہ انہوں نے احکام کی مخالفت نہ کر کے اور دنیاوی زندگی میں ان کے مہولہ کوئے لیا ہے، بعض مقامات پر انہیں احکامات ہے، سو کہ تو رہنا اپنے والے کی طرف سے، ان کی سزا میں، کچھ مختلف دی جانے کی اور نہ کوئی دلیل اعتبار بدست و شہادہ ان کی طرف سے دی جانے کی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَطَّعْنَا مِنْهُ الْبُعْدَ بِالرُّسُلِ

اور یہ شک دی ہم نے عوسلی کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول









فول کہ جب اور کنوؤں کی حقیقت اور واقعیت میں دلیل قلعی سے ثابت ہے تو پھر اس کا کیا وجہ ہے! اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے قلعی کر لیتے۔ انکار بعض کی آخر کیا وجہ!

دوسرے اردو کتابیں مثلاً قرآنی تجوید ج تو راۃ کا مسند ق ہے تو اس کے اکا ر سے تو خود تو راۃ کی نکتہ سب و اکا ر لازم آتا ہے۔

تیسرے سے لے کر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا حرام آسانی سے کہا جاتا ہے کہ وہ مسافر تھے، پر حرمہ جہاں گرد کے لوگوں نے جو کئی بیچوں کو قتل کیا وہیں کی تعلیم بھی قرآن ہی کے احکام کے ساتھ تھی، خاص کر اہل اودھن ان کا تین کو دیکھ کر ہنسنے اور وقت دیکھتے ہوئے قرآن کا دست لگاتے ہوئے ساتھ ساتھ کھڑکھڑاتے ہوئے اس سے قتل تھا اور قاتل پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط نہیں ہے۔ مگر میں کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل میں عیب اور دوست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان بیوروٹیوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن

اور اچکا نکھائیے پاس موسیٰ صرغہ صغریٰ سے کہ بھر بنالیا تم نے بھڑا اس کے

بَعْدِي وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٥﴾

میں نے بھی، اور تم ظالم ہو۔

**خلاصہ تفسیر** اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے لوگوں کے اس صاف صاف و اعلیٰ درجہ رسالت کی لائے (عمر) اس پر بھی تم لوگوں کے گواہ اور کمبود، بتایا۔  
موسیٰ علیہ السلام کے وجود پر جانے کے بعد اور تم اس پر جو جزییہ اہم دھائیے تھے۔

فائدہ دینا ہے وہ وہاں مل رہی ہیں جو اس فقرے سے پہلے جیکہ قرآنہ نہ مل سکی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے پر قائم ہو چکی تھیں انشاء اللہ، اور یہ میثاق، اور باکا پھٹنا وغیرہ۔

موسیٰ علیہ السلام، مگر بغداد اٹالی کی مرعہ گنڈ سب بھی آزمائی ہی ہے، گو سادہ کو مسیرو بنائے کاما ملے  
 اگرچہ ان بیوروں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائے ہیں۔ زول  
 لشراؤن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اہلاد کے حامی اور طرفدار نہ تھے،

اس لئے فی الجملہ یہ کہیں زور میں شامل ہیں۔

اور اس سے بہت بھی جھلٹی ہے کہ جن کے اسلاف نے مومن علیہ السلام کی تکذیب کر کے کفر کیا وہ اگر مومن علیہ السلام کے انکار کے مرتکب ہوں تو جہنم الٰہیب نہیں۔

وَإِذَا أَخَذْنَا أَمْثِلًا فَكُفُّوا رُفْعًا فَوَقَّعْنَا فِيهَا أَنْفُسَكُمْ وَأَمْثَلًا

اور جب، ہم نے با قرار تمہارا اور بلند کیا تھا اسے اور کچھ بلور کو پھونکو جو ہم نے

اَتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاَسْمَعُوا اَقَالُوا سُبْعًا وَعَصَيْنَا اَوْ اَشْرَبُوا

تم کو دیا خود سے اور سنو، اسے مستاجم نے اور نہ کیا اور پلائی تھی اسی سے

فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِسْمَايَا أَمْرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ

دلوں میں محبت اسی پختہ ہوگی بسبب ان کے کفر کے کہہ لے کہ بھڑی باتیں سکھاتا ہر دم کوں مانی تھارا

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٢﴾

الرحمۃ ایمان والے جو۔

اور وہ زانہ یاد کر کہ جب ہم نے خدا را قول دستبر آریا تھا، اور اس قول و قرار لینے کے لئے، خود کو تھامے، سروں کے اوپر لٹکا کر رکھا تھا اور اس

دل سے ہستو اس وقت انھوں نے روضہ کے مائے زبان سے قرا کر پا کر ہم نے قبول کر لیا اور ہم

ہے عمل دیرگھان (دوران) کی اس بدولی کی جو حقیقت کہ ان کے قتل (کشیہ و فیض) میں وہی گوسالہ پوسٹ ہو جائے گا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ وہ اپنے طور سے ان کو کراہتوں نے اپکے

[illegible]

تو بر کمال آئیں تو کہے کہ وہاں بھی غفلت ہوئے ہیں، اصل وجہ کہ تو بہ مذہب نے کے سہل پس کی حالت  
 قلب میں باقی رہی نہ تھی، ورنہ تو اگر گویا سالہا پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی تو یہ ہیں: بعضوں کو نقل  
 ہوتا ہوا، اور بعض کو لایا، بلا نقل سالہا پرستی میں، وہاں کہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ وہاں کی توہ  
 مانی کہ طبیعت ہوئی کہ اور جو سالہا پرستی سے مخلوق ہے، جسے ان کو بھی گویا سالہا پرستی سے جس قدر  
 لغت و اسب علی میں کو تباہی دہرے سے لے لکھ گودا اور اس صحیحہ شمرکہ کا ان کے قلب  
 میرا ہی تھا، بہر حال مذہب تو بہ کافر سے لغت دہرے کے آثار باقی رہنے لے دونوں میں وہی  
 شمس پیدار گئی، جس سے اللہ دنیا کی میں کو بدو و کون پہن کرنے کی فہم آئی۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ كَاثِرًا لِّمَّا دَارَ الْأَخِرُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ  
 دُؤْبِ النَّاسِ فَمَقُومٌ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ كُنْتُمْ تَصِلُونَ ۝ وَكُنْ  
 کے تو کہ مرنے کی آمد نہ کرو اگر تم سچ کہتے ہو، اور ہرگز  
 یَقْمَتُكُمْ آتِیْنَ إِلَّا مَا قَدْ مَثَّ أَعْبَیْ یَعْمُرُ ۝ وَاللَّهُ عَلِیْمٌ بِالظَّالِمِیْنَ ۝  
 آؤرو مد کر یہاں کے موت کی بھی سبب ان میں ہیں کہ یہ سچ کہتے ہیں، اگر وہاں شمس پیدار ہو جائے تو

خلاصہ تفسیر  
 اور بعض یہودی یہ دہریہ کہتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں غائب ہوا یہی حق ہیں  
 آپ دانی و مومن سے کہہ دیجئے کہ اگر بغل خدائے عالمیا آخرت میں خدائے ہی نے تالیق ہو کر  
 خیر سے کو حق اس کی بعد از ان کے لئے دوزخ، موت کی گناہ کر کے مگلا دوزخ اور جس دوزخ سے میں آج  
 ہو اور دہم سا میں بھی کہہ جیتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کسی اس دعوت کی گناہ نہ کریں گے بلکہ  
 دوزخ میں آئیں، اعمال و کفر سے کہے جو اپنے احمقوں سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو غیب المظاہر ہے، ان  
 ظالموں کے سالہا ان کی وجہ مقدمہ کی تالیق آئیں کی فرو مشرہ واد جہم شاہر کا حکم کر دیا جائیگا  
 فاشدہم، مشرہ ان کی بعض اور آیت سے بھی آئن کے اس دوزخ کا مقدمہ ہو چکا، جو یہ لوگ  
 فَاذْكُرْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا شَقَّ ذَنْبُهُ وَهُوَ رَاكِبٌ ۝ فَذْكُرْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا شَقَّ ذَنْبُهُ  
 اذْکُرْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا شَقَّ ذَنْبُهُ ۝ فَذْكُرْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا شَقَّ ذَنْبُهُ ۝ فَذْكُرْ لَّیْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا شَقَّ ذَنْبُهُ ۝  
 ان سبب دعویٰ کا مائل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی حق پر ہیں، اہل آخرت میں ہم کو قہر دے

خاتم لئے گی، ہم میں سے جو سبب یا مریض ہیں کو تو باہر لے جائیں، دشت میں داخل ہائے مجاہد اور چھٹا ہائے  
 وہ چند روزی غلبہ، ہمت کر خیمات بچائیں گے، اور جو مصلح ہیں وہ پیش لانا، دوزخا، محبوب و غریب  
 ہیں۔  
 بعض مفسرین ان کے قہ سے تفسیر نظریہ دوسرے دین حق پر تہا کہ ہونے کی صورت میں فی الفہم  
 درست وصال میں ہیں، لیکن یہ کہ وہ لوگ اپنے دین کے منسوب ہو جائے گی بنا پر حق پر مذہب سے تھے،  
 اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں مختلف غناوات اور طریقوں سے ان کی تذبذب قربانی، یہاں ایک  
 خاموش سیرت کو رکھا گیا کہ اگر عام عبادت کے مطابق بحث اور واکس سے فیض نہیں کرتے تو آؤ  
 مافوق الاعا، طریق میں تجزیہ کے ذریعہ اس میں دہریہ علم و فہم کی ضرورت ہو، غافل نظر رکھا  
 صرف زبان بلائے کی ضرورت ہے، اھم پیشین گوئی کرنے ہیں کہ تہا بان سے ہرگز نہیں کہہ سکتے  
 کہ ہم موت کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تہا بان سے دعویٰ میں ہے کہ تو یہ کل کہہ دے کہ تہا بان سے  
 تہا بان سے اپنی ثابت ہو جائے گا۔

جو کہ ان کو اپنا داخل اور کفر پر پڑا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومن کا حق پر ہونا  
 ان پر غلبہ و اس دور میں تھا، اس سے تو ان میں حبیب چھائی کر دیا، ان میں نہ اعلیٰ یا وہ آؤ گئے کہ مرنے  
 پر کھڑے تھے، ان کا اور موت نے آؤ جو باہر اور سیرت سے جہنم سید ہوتے، وہ ان کو حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم سے جہاد و دشمنی اس کے پیشین نظر خوان کو یہ شکر و شوق آجائے تہا، اور یہ کہ تہا  
 ضرور کہہ دینے چاہتے تھے۔

وہ حقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ سیرت کافی ہے۔  
 یہاں دہریہ اور کفار کی دہریہ،  
 اؤل کو یہ کہہ سکتا ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو ان کی کفر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے  
 میں موجود تھے، اور وہ ان کے آپ کو بھی پہنچتے تھے، بعد عدا و عداوت کی بنا، نہ کہ آپ کا انکار کیا،  
 ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔  
 وہ کفر سے بھی نہیں ہیں، ہر زمانے کے کفر کا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، لیکن ہے  
 انہوں نے دل سے حق کی ہوا اذل تو یہاں سے بھی نہیں کہہ سکتا تعالیٰ کا فرمان و تہا، نہ کہ تہا  
 کی صاف ضرورت پر کہہ رہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تہا کر کے تو زبان سے ضرور اس کا انکار کرتے،  
 کیونکہ اس میں تو ان کی حبیب تھی، اور ان کی کفر صلی اللہ علیہ وسلم کو چھٹا لے کا پھر صاف تہا۔  
 اور پیش یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے تہا کی ہو، انہوں کی شہرت نہ رہی ہو یہ اصل



یہ نہیں کہ اس کے بعد وہ معاونین کی تعداد کے مقابل میں امداد دینا غنائی کی تعداد پر مشروط ہوگی۔ اگر ایسی ہیست ہوئی ہو تو خود اس کو خوب اچھا لے گا کہ جو قسم نے جو معیار قبول و عداقت معقول کیا تھا اس میں اس کے لئے جو اسے آئے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ وَمِنْ أَقْبَلِ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اور تو دیکھ جاؤ گے کہ سب لوگوں کی زیادہ حریص زندگی ہو اور زیادہ حریص مشرکوں کی بھی۔

يَوْمَ أَأَخَذَ مِنْهُمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسٍ ۖ فَلْيُقَصِّرْ مِنْهُمْ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ قِيَمَتُهُمْ هُنَا وَلَا يُضَرِّجُهُمْ غَمٌّ مِنْ ذُنُوبِهِمْ يَوْمَ هُمْ لَا مُخَارَاجَ ۚ

جائے گا کہ ایک اسٹین کا کمرہ ہے ہزار برس اور نہیں اس کو بچاؤ والا عذاب ہے

العذاب ان يعمره والله بصير بما تعملون ﴿١٩﴾

اس قدر جیسا ، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر اور (وہ لوگ موت کی ترساکیا خاک کرتے) آپ (تو ان کو حیات و دنیا کی باتیں

یہ سارا دودھ ہم ان کی پیالوں سے لے کر پی کر رہا ہیں، اور داوروں کا تو کیا ذکر حیرت فہم ہو کہ بعض امشرکین سے بھی (بڑے کراہت) ان کو حیات کا دلیلیہ سمجھ کر، عمر اور ان کے کفر سے

کہ ان میں کا ایک ایک شخص، اس جوس میں ہے کہ اس کی عمر چار برس کی ہو جائے اور دیکھا بالقرض

سب سے پہلے لکھیں کہ ان کے اعمال، اور جو وہ اللہ کو عطا کر رہے ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے

فائدہ :- اس میں حیرت و شہسوار کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین جب تو آخرت کے منکر تھے مگر

آخرت کے قاتلوں اور مضعفہ آفتوں کو کشتہ و سلاخا تیار کر دینے سے پہلے کہ ان کی تمنا کریں تو چننا ایسا نہیں، مگر یہ

ہے کہ تمنا کریں یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اہتمام و آخرت کے طویل عرصہ کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے

پس کوئی جیسے کہ ان کی طرف سے دیکھا جاتا ہے وہی ہے حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں

مَنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ نَجَسٌ فِيهِ

سَنَ لَكَ عَذَابًا يُجْزِيكَ فَإِنَّهُ مَرْغَبٌ لَكَ عَلَىٰ فَلَاحٍ بِإِذْنِ اللَّهِ

۱

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ مَن كَانَ

کہ سچا بتاؤ اور اس کلام کو جو اس کے پہلے ہر اور راہ دکھاتا ہے اور خوش خبری سنا ہوا ہے انہی کو جو

عَدُوَّ اللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ

کوئی بڑی دشمن اٹھ کا اور اسکے رشتوں کا اور اسکے پیروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ

عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٥﴾	
-----------------------------	--

دستورالعمل کارکردن با ...

خلاصہ تفسیر

نوم مان لیتے، اس حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کلمہ علیہ السلام کہتے ہیں وہ سب کلمہ ہے۔

تو وہ سفرِ محض ہیں، سو درِ مسافت کے طرہ در (انصاف) نے ہر آہِ اک، اک کے غلاب اک، ہر غلاب اک

خداوندی ہم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھ جاتی ہے) اللہ خود قرآن کو دیکھ کر کیسا ہے سو

اس کی ذمہ داری حالتِ بیکر کے بعد نبی کریم ﷺ سے قبل والی وراثتی کتابوں کی اور ہم نے ان کی تفسیر کی ہے۔

پس مسرتان ہر حال میں کتاب سادہ کی اور قابل اتباع ٹھہرا، بعیر جہر علی علیہ السلام کی مدافعت سے اس کو

۱۰۔ مائٹا نرہی حاکمیت ہے واسب را خود مسئلہ عداوت جبریل کا، اس کا فیصلہ ہو کر حق تعالیٰ کے

خود میکائیل ہے، جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں ان سب عداوت رکھنا اور جو نسل سے عداوت رکھنا ہے

سب ہم ملے شہر گئے جاتے ہیں، اور ان سب مدارتوں کا قانونی یہ ہے کہ جو کوئی شخص خدا تعالیٰ کا

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے لیے ایک کافور کا

\_\_\_\_\_

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاقُونَ ٩٩

اللہ نے آدابِ نبویؐ طاعتیں دہی اور انکار نہ کریں گے ان کا گروہی حوالہ فراہم ہے

}

یہ نہیں کہ اسلام کے بعد دو عالموں کی تعداد کے مقابلے میں، مادہ کی دو اقسام کی تعداد، بیشتر ہو کر وہی اگر وہی بات کہتی ہوئی خود خود اس کو خوب اچھا لے گا جو کہ تم نے جو معیار حق و صداقت قرار دیا تھا اس میں کمی پڑے گا۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ عَلَىٰ حَيٰوةٍ ۖ وَٱلَّذِينَ آمَنُوا أَشْرَٰؤُا

اور خود مجھے تم کو سب سے زیادہ عطا کر دے گا اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں

يَوْمَآءَ أَحَدَهُمْ تَوَفٰىهُمُ ٱلْأُفۡسَۃُ ۖ وَٱلْآخَرُ يُعۡزٰىجُ ۚ

ایسا کہ ایک ایک ان میں سے ہزار برس اور بھی اس کو بچا جائیگا۔ غلاب سے

ٱلْعَذَابِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِصِرَٰطِهِۦ سَمِيعٌ ۝۱۱

اس قدر عیناً، اور افسر دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اور وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے، آپ ذکر ان کو حیات دینیوں کا بھی

خلافہ تفسیر اور عالم آدمیوں سے وہی اڑھ کر پائی گئی، اور داوروں کا تو کیا ذکر حیات تو یہ

ہو کہ بعض ہمیشگی سے بھی زیادہ کر آپ ان کو حیات کا حریف دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہو

کہ ان میں کا ایک ایک شخص، اس میں جس سے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور وہ بھلا افسوس

گراؤں میں ہو کر ہی تو کیا، یہ امر مذکور ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی عمر جو تھوڑی سی ہو جائے اور حق تعالیٰ کے

سب سے بڑی تعظیمن کے اعمال و عبادتوں کا وہ بے پروا رہے

فَإِنَّ ٱلْأُولَٰئِكَ سَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِمَا عَمِلُواْ ۚ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ هُمُ ٱلَّذِينَ لَا يَرْجُوْنَ ظُلُمَٰتُ ٱلسَّعٰى ۚ

پس اوروں کو جو کچھ وہ دنیاوی ہے، اس سے لے کر اہل عمل کی تمنا کریں تو خدا ان کو عذاب نہیں، مگر یہ

وآخرت کے عذاب اور بڑے عذاب و آخرت کی شدتوں کا اپنے آپ ہی کو متوقع کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں

بہت کم شمار کریں گے جو حیرت و تعجب کی بات۔

پس اوروں کو جو کچھ آخرت کے طویل عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے

آپ کو نہیں سمجھنے کا دعویٰ دعویٰ ہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کو بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں

بچے کو چھری ٹھکانا، بچے کا اس لئے عذاب تک پہنچے، یہاں تک ہی بسا!

قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِٱلْإِبْرٰهٖمَ فَإِنَّهُۥٓ عَدُوًّا لِّكَ ۚ عَلَىٰ كُلِّ مَن آذٰنُ ٱللَّهِ

کہ جس نے عداوت کی ہو ابراہیم کے، اس کے لئے قرآن ہے کہ ابراہیم کے لئے عداوت ہے

مُصَلِّ ۖ قَالِ ٱلْمُتَنَبِّئِينَ ۖ يٰٓهٗ وَهٰذٰى ٱلْبَيْتُ ٱلَّذِیۥنَ ٱلْمُؤْمِنُونَ ۝۱۲

کہ چاہتا ہوں کہ اس کو اس مقام پر کہ جس کے پہلے پر اور وہاں کے اور جو بھی بتائیے کہ یہاں ان لوگوں کو جو

عَدُوًّا لِّلَّهِ وَلِلنَّبِیِّیۡنَ وَرُسُلِهِۦ وَحَبِیْرٍۭ لِّوَمِیۡكِلَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ

کوئی برائی دشمن نہیں بنا گا اور ان کے دشمنوں کا اور ان کے پیروں کا اور جو بھی

عَدُوًّا لِّلْكَافِرِیۡنَ ۝۱۳

دشمن ہو ان کافروں کا۔

خلاصہ تفسیر ابراہیم نے جو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پرسنا کہ جہل میں اسلام کی لائے تھے

ہا کہ ان سے تو بنا ہی عداوت ہے، یہاں تو یہ عداوتات، اہل اور احکامات، شافعی

انہوں کے ذہن پر آئے تھے، یہاں تک کہ ان کو یہاں اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ حق و باطل

تو یہاں نہیں، اس میں تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کے لئے یہاں تک کہ ان کے لئے ان سے کہنے کے

شخص جہل سے عداوت تک، اور وہاں تک کہ ان کے لئے ان سے کہنے کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

تو یہاں تک کہ ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خداوندی ہے، تو ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

اس کی طور و حالت، یہ کہ تعالیٰ نے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

وہاں ضروری ہے کہ ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

پس ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

نہاں ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک خود ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

سب میں ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

خود ایک ایک ہے، ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے



**خلاصہ تفسیر** اور اہل ایمان پر جو وہ جہاد دلا گیا جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسا دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لے چکے ہیں، اچھے لوگوں کے ساتھ ساتھ کافروں کو بھی دیکھ کر وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سوان کا انکار نہ جانے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ انکار عدول کی حکمت کی علامت کی وجہ سے ہے، اور افسوسناک یہ ہے کہ کوئی انکار نہیں کیا کرتا اور اپنے دلائل کو مانکر مرگ و بیوقوف جہود و غی کی گمراہی میں ہے۔

اَوْ كَلِمَاتٍ اَوْ اَعْدَاءُ اَنْبِيَاءٍ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ  
كَايِبٌ عَنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ يَجْزِيكَ اللّٰهُ كَمَا يَسْتَكِبُ اُولٰٓئِكَ يَوْمَ تَكُوْنُ اَلْقِيٰمُ

### لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

نہیں کرتے۔

**خلاصہ تفسیر** اہل ایمان پر جو وہ جہاد دلا گیا جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے آپ میں قوت نہ مل سکا تھا، تو افسوسناک یہ ہے کہ صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوا کہ ان کو کیا دوسرے جہاد سے ان کو انکار ہے، اور ان کی قوم حالت ہجر کے انھوں نے اپنے مسلم جہاد کی بھی نفی کر دی تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر متنبہ ہو کر کہا کہ یہاں ہرگز ضرور اس کو ان میں سے کسی دیکھی مشرتبی نے نظر انداز کر دیا ہوگا، لیکن ان کو یہ دلیل جہاد کرنے والوں میں زیادہ تو ایسے ہی تھیں جو دھوکے سے اس عہدہ امت میں بھی نہیں رکھتے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایسے یقین دہانے سے بڑھ کر فرمایا ہے۔

فَاَنْتَ اِنَّكَ اَوَّلُ الْاَوَّلِ اور ایک جماعت کی تحقیر اس نے کی تھی کہ بھینٹے اُن میں سے ان کے جہاد کو برا بھی کرتے تھے جتنی کو افریقہ میں جہاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قَبْلَ  
اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی جو ان کے پاس پہلے سے تھی  
فَرِيْقٍ مِّنَ الَّذِينَ اَوَّلُوا الْاَلْبَسَ كَيْتَبُ اللّٰهِ وَاَعْلٰهُمُ هُمُ  
دو ایک جماعت نے اپنی کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیش کر دیا

### كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

جو کوئی نہ جانتے ہی تھے۔

**خلاصہ تفسیر** اس آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان دلائے میں کام تھا، ارشاد ہوتا ہے، اور جب ان کے پاس ایک دوسرا ایمان پہنچا، تو انھوں نے انھیں ان کی طرف سے خود رسول ہونے کے ساتھ ساتھ تصدیق بھی کر دی تھی، اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی قرآن) کیونکہ اس میں آیت کی نبوت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آیت پر ایمان لانا، جو قرآن پہلے تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتے تھے، اگر باوجود اس کے بھی، ان اپنی کتاب میں سے ایک فرقہ بن گئے، خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پہچانتے تھے کہ ان کو اس کے معنی کا احساس نہ ہونے کا، اگرچہ اسلام ہی نہیں۔

وَابْعَدُوْا مَا قَتَلُوا الشَّيْطٰنُ عَلٰی مُلْكٍ سَلِيْقٍ وَمَا كَفَرُ سَلِيْقٍ

اور پیچھے رہو اُس ملک کے جو چاہتے تھے شیطان مسلمان کی بادشاہت کی وقت اور کفر نہیں کا مسلمان

وَلٰكِنِ الشَّيْطٰنُ كَفَرٌ وَّ اِيْعَلْمُوْنَ اَنَّ سَبَّ السَّيْئَرَةِ وَمَا اَنْزَلَ

لے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سب سے بدتر اور اس علم کے بغیر ہونے

عَلٰی الْمَلٰٓئِكَةِ بِبَابِلَ هٰا رِدَتْ وَمَا رِدَتْ وَمَا يَعْلَمُوْنَ مِنْ اَحَدٍ

جو اُن کو اور فرشتوں پر شہر بائیں میں کا نام اوردت اور اوردت ہے اور جس میں سب سے بدتر

حَقِّ يَقُوْلُ اٰتَمَانَعْنِ فَنَنْتَ فَلَا كَفَرٌ وَّ اِيْعَلْمُوْنَ مِنْهُمْ مَا

وہوں نے کہنے کی وجہ سے کہہ دیا کہ ہم تو ان میں سے سب سے بدتر ہوں گے، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے

يَقِيْقُوْنَ بِمَنْ يَنْبِئُ السَّرَّ وَرَوْحًا وَمَا هُمْ بِضٰرِّينَ بِهٖ

جس سے تجھے ڈانٹتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے

مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَعْلَمُوْنَ مَا يَصْرِفُهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سمجھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے

وَلَقَدْ عَلِمُوا الْمَنَ اَشْرٰهٖ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ حَلَاقٍ

اور خوب جان پہچان کر چکے تھے کہ جس نے اہل ایمان کو جادو نہیں کیا، اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ،





کے فرشتے ہوتے پر دلائل قائم کر دیتے تھے، بلکہ ان کے انکشافات اور شواہد کی تعمیل و اخلاص تھے۔

اور یہ کام انبیاء کا کام ہے اس لئے نہیں کیا گیا کہ اول قرآن آیا اور جاوہر گروں میں ہنسیاؤں و فصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے جو انبیاء کو ان کے اپنے ذریعہ کار و رجہ دیکھتے تھے، اس لئے فکر فرشتوں کے ملاو کوئی اور اثر نہ تھا مناسب تھا۔

دوسرا اس کام کی تکمیل بغیر جاوہر کے حفاظ کی نقل و حکایت کے عارفہ بود مکتب حق و اگر پہلے نقل کرنا ہوتا تو عقل و فہم کا وہ عمل کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر چونکہ نقل کرنا انبیاء کا کم نہیں تھا جانتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، ان فرشتوں کو اس کام کے لئے جو چیز دیا گیا، چونکہ کارخانہ انہوں میں جو چیز شریعت پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لے جاتے ہیں جو عوام عالم کے ہمت ہست قریب معانی و مابین ہوں لیکن لازم و مفیدہ کے سبب ان کا جو شریعتوں سے کبھی کسی ظاہر یا مابین یا موزی جاوہر و خیر کی صورت اور خود پر داخت، ان کو نہایت ہمت ہست قریب ہست و محمود ہے، اور ان فرشتوں کی مخالفت اور دست و مضموم، مغلطات انبیاء و کرام علیہ السلام کے ان سے خاص شریعتیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصاً عوام و غیرہ کی ہوتا ہے، اور جو کہ نقل و حکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک شریعتی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی ہر جہاں احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل و حکایت بھی جاوہر پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسے کہ واقع میں ہوا، تو حضرت انبیاء کو اس کا سبب بلا واسطہ نقل ہوتا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

ابن علیا نے شریعت انبیاء علیہم السلام کے دین بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی تھی۔

ان کلیات سے کہ جزئیات کی تفصیلات، وجہ ہست محال فتنہ، نسب و کار و کام کے ذریعہ، سبب انہیں کی تکمیل، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیاء اکرام نے یہ بتایا کہ شریعت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی لیکن جزئیات نہیں بتلائے، کہ ایک طریقہ شریعت کا یہ کہ صاحب معاملہ سے یوں پال کر کے فلاں بے لگے، وغیرہ وغیرہ کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور نزدیک ہیں جیسے سمجھتے ہیں، یا مثلاً اقسام جکسر میں میں مثال فرض کیجئے کہ قوا کیجئے یہ بتلا دی گیا ہے کہ دست خفہ کا عمل میں میں جیسے کہ بچے یا جب میں دیکھتے ہوں وہ اپنے مل جائیں تاباں ہے، لیکن یہ نہیں بتلا دی کہ نقل میں چڑھنے سے اس طرح رو پھرتے تھے۔

حاصلی کام یہ کہ فرشتوں نے ان میں ان کو اپنا کام شروع کر دیا کہ سیکھو اصول و فرائض کا ہر کے

دین کو اس کے عمل ہے بچے کی اور ماحول سے نہ صرف ان کے حسب اور تائید کی جیسے کوئی عالم دیکھے کہ باہر دیکھ کر ان کو ان کے لئے یہ قوت پڑا یا غیر ان کا کلام کو جس وقت شائع ہیں، میں کہ کے عوام کو مطلع کر دے کہ جو کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے ہمت لینا چاہئے۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقت و فتنہ فتنہ کی آمد اور فتنہ ان کے پاس شروع ہوئی اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول و فروع سے مطلع کر دیجئے تاکہ ان فتنے سے بچ سکیں اور عمل میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطریقہ شریعت و طریقہ اور بنظر اصلاح یہ التزام کیا کہ اصول و فروع بتائے۔ سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو، ہمت و ہمت کے ذریعے انشائیائی کو اپنے بندگی کی آزمائش میں مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہو کر ان شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کوشش ہے آگاہ ہو کر اس سے بچے، اور کوئی ایسا ہی خراب کرنا ہے کہ اس میں شریعت مطلع ہو کر نہ ہی شر و فتنہ کو کرے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفر میں ہوا، مگر کوئی دیکھیں جو ہم کو نصیحت کے لئے ہیں کہ ان میں ہمت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اس میں ہمت سے رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ کر دیکھیں بچنے کے لئے ہر چہ راہوں اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ، اور ایمان برادر کرو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ حیران ہو کر آئے، اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح حیدر و بیان کر لیتا ہے اس کے وہ دیر و جاوہر کے سبب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام بھی یہ تھا، اب اگر کوئی غیر شریعتی کر کے اپنے اندر وہ ہمت سے کافر و ناجائز ہے وہ بتا پانچہ بیٹے اس عہد پر قائم رہے، اور اس جاوہر و حکمت کی یاد دہانی کا ذریعہ بنایا، جو فتنہ و بے گناہ اور دیکھنے طریقے اس کے استعمال کے لئے ہو، اس طرح سے کار کا فرما دیتے تھے۔

اس ارشاد واسطی اور پھر غائب سے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہو کہ کوئی شخص کسی صاحب مستقل و متولی مال یا اعلیٰ کے پاس جاتے کہ کوئی کوئی صاحب یا یہ فلسفہ چاہیے، تاکہ خود بھی ان چیزوں سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کیے جاتے ہیں، اور غائبوں کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم میں حال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو دھوکہ دے کر پڑے، اور بھوکہ دے غائب ہی شریعت غائب یا اہل کفر و فتنہ دے دیں، اس کو ہمت مل کر لے، اس امکان کی وجہ سے اس کو نصیحت کرنے کی اہمیت کرنا اور وہ دے کر لے، اور اس لئے اس کو چاہنا اور ہمت دینا، لیکن وہ نہیں فتنہ کے خلاف اسلام لڑا، وفاق ہو کر سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس علم کی ملامت اپنی ہی نہ تھیں جو سبکی اس طرح اس اللہ کا محض ان فرشتوں ہی کی دیکھی شہ کے





ہی جنگ ہو سکتی ہو، مصیبت کا بھی یہی قول ہے، مگر یہ وہاں کی تحقیق ہے، مگر انصاف اعلیٰ میں مذکور عقل بہت متاع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم چتریں بن جائے، ایک نور سے دوسری نور کی طرف منتقل ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول ہے، جو کہ انصاف حقائق نہیں، ان کی محاورہ حقائق سے محال، ممکن، اور اجتہاد کی تحقیق میں کمال میں انصاف عقلاً ممکن نہیں، کو کوئی حال ممکن بن جائے، کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن میں، جن میں فروعی ماحول کے متحرک ہو، تعمیل و تدریس دے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر طرح تعمیل ہی ہو اس سے نافرمانی نہ ہو، اور بعض حضرات نے جس کے رد میں انصاف حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبار کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو موطا، امام مالک میں بروایت مختلف پنج حکیم منقول ہے۔

لولا کلمات اقولہ لعلقلنی

ایہود و نصاریٰ

گمراہانہ کے کلام کا یہی طرز ہے جو قوت نہانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر عام قوت حقیقت کو چھوڑ کر عوام راہ راہ لیا بیچ نہیں، اس لئے حقیقت اور راہ راہی معلوم اس کا نہیں ہے کہ اگر میں یہ کلمات دروازہ بند ہی سے نہ چڑھتا تو یہودی چاروں گرجے گمراہانہ دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ جس کے گرد ایک گمراہانہ کا مکان ہو، دوسرے پر کہ یہ کلمات در چڑھا کر گئے تھے، ان کی تائید ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرنا، حضرت کعب جلالت سے جب لوگوں نے یہ چکارا کیا تو کلمات کیا تھے کہ آپ نے یہ کلمات بتائے،

اَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ

اَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ  
اَفَلَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ رَجُلٌ يَخْلُقُ الْفُلَ يَمُرُّ بِالْجَنَّةِ

غاصہ یہ ہو کہ جس کے یہ یمنوں میں کمال قوت ہیں۔

بحر اور چھڑے میں فرق، جس طرح انبیاء علیہم السلام کے صحراوات اولیاء کی کرامات سے اپنے دماغ متاثر ہوئے ہیں، آگے میں برعادت نہیں ہو سکتے، اس لئے ان کو خرقی عادت کہا جاتا ہے، بلکہ ہر محسوس جادو سے بھی اپنے آپ کو آزاد رکھنا ہے، مثلاً اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں امتداد نہیں ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادو گرد کی تعلیم کو مکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سویں فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے، اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو کچھ عموماً درجہ دو سے جو میں مشابہ ہے، یہ باتیں ہیں، یہ دماغ اس بات کو کہنے لگتا ہے، انہیں فرق کرنا اسباب کے طور پر خطا جاتا ہے، چنانچہ اسباب ظاہر ہوتے ہیں، اور آثار ان اسباب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اور کوئی تعجب کی چیز نہیں جاتی، لیکن چنانچہ اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام کو اس اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقی عادت سمجھ لگتے ہیں، مثلاً ان کا کہ وہ حقیقت نام مادی امور کی طرح کی حقیقت کے اثر سے ہوتی ہے، ایک خرقہ مشرقی ایسے سے آج کا گمراہانہ ایک سانسے اگر کر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقی عادت کہیں گے، مادی کجائت و شیطانی کاپلے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو ہر کوئی خرقی عادت نہیں دیتا، خلاصہ یہ ہے کہ جس کا اثر ہوئے والے تمام آثار اسباب طبیعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مٹا لاطرفی عادت کا ہو جاتا، غلامت مجبور کے کہ وہ بد واسطہ فعل میں خالق کا ہونا ہے، اس میں اسباب طبیعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت بکر بن عبد اللہ کے لئے تردد کی آگ کو کہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ اس مطالبہ کے لئے خوشی ہو جائے، مگر شمشک بھی اتنی نہ ہو جس سے تخلیق ہوئی، بلکہ جس کے سوا حق مائل ہوا جس کی بات ہے، اگلی شمشک ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کہ وہ دماغ سے متاثر کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ مجبور نہیں بلکہ دماغ کا اثر ہے، اور اسی مخفی ہونے سے لوگوں کو مٹا لاطرفی عادت کا ہو جاتا ہے۔ یہ بات کہ مجبور ہوا و راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، اور اشارہ سراسر اس کا۔

وَمَا تَسْأَلُهُمْ فِيْ ذٰلِكَ مِنْ شَيْءٍ  
اِنَّهُمْ عَنْ شَيْءٍ مُّسْتَعِذُونَ  
اور یہ ہے کہ ایک شے غائب اور کونکر کے سامنے بھی آئے، مگر اس میں بھی اس میں بھی کچھ عمل کوئی دخل نہیں، یہ خاص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ مجبور و مفرد ہر میں میں کیا تھا کہ آپ نے ایک شے غائب





اس کو گسٹا جانے کا مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

مسئلہ اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی ناجائز ہیں مسئلہ یہی کہ ناسخ منسوخ کے لئے کونسی تعلیم دیا جائے یا وظیفہ چلے جاتا ہے مگر جو وظیفہ اسرار اکیسہ آیات قرآن میں ہے کہ جو ہر آدمی کو لازم ہے کہ وہ اس وظیفہ کی تعلیم حاصل کرے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا

اسے ایمان والوں سے کہو (یعنی) اور کہو اُنظر کہنا اور سننے و دہرے

وَالْكَافِرِينَ عَذَابُ الْيَمِّ ۖ ﴿٧٦﴾

اور کافروں کو عذاب ہے دردناک۔

بعض یہودیوں نے ایک شہر اور تاجپلو کی، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اگر غلطی سے آیت کو خطاب کرتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ

[illegible]

مسئلہ: اسی آیت سے ثابت معلوم ہوا کہ اگر آپ کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی طرف توجہ دینے سے باز رکھنا چاہیں، تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر کوئی عالم کے جائز فعل سے باہر کو مفساد میں پڑے اور ناجائز کاموں میں سبب بنے کا خطرہ ہو تو نااہل کے لئے یہ جائز فعل ممنوع ہو جاتا ہے، لہذا جس طرح فعل شرعاً مہروری اور مفساد شرعی میں سے ہو اس کی مثالیں پیش کریں، وسعت میں، سبب میں، اس کی آگاہی و دعوت اور کسی مفسد کو مٹانے کے لئے۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبیت اللہ کی عمر چوبیس فرسینے لے کر ماں جاہلیت میں پیدا ہوئی تھی اس میں کچھ چیزیں بنامہ خداوندی تھیں، طہارت کر دی گئی، برادر اور چاہتا ہے کہ اس کو کہند کہ تم کو فرشتہ بنا دیا ہو، یہی حقائق بنا دیے گئے، ان میں اس سے نابالغ وقت عوام کے فتنہ میں مبتلا ہوا ہے کہ کاغذوں پر اس نے افضل میں نہیں کرتا، لیکن احکام کا اصولی اندیشہ کا اصلاح میں سے دوبارے سے تعبیر کیا گیا۔

پھر جرم و فتنہ کے نزدیک نہیں ہے، خصوصاً حضرات خاندانِ علی کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور قرآنی

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُسْلِمِينَ أَنْ

دل نہیں چاہتا آئی لوگوں کا ہر کا فریض اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو

يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنْ خُبْرٍ مِّنْ لَّدُنْهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ

کہ آخری عمر کوئی تک بات چھاننے کی طرف سے اور ان خاص رہی ہے اپنی رکت

مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿١٥﴾

جس کا جیسا چاہے اور اللہ کے ساتھ

**خلاصہ تفسیر** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیورو کا جو برتاؤ تھا، وہ اور کیا ہے؟ میں بیان کر گیا، اب اس آیت میں بیورو کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے؟ بیورو کسی ایسے مسلمانوں سے کہنے لگے کہ چھ ماہوں سے تمھارے خیر خیر چھا اور ہزار جان سے پسند کر رہے ہیں کہ تم کو کوئی احکام دے گا، دینی احکام سے بہرہ فراغت ہو جائے گا، ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ تمھارا دین چھ ماہوں سے دینی احکامات نہیں دے گا؟ حق تعالیٰ میں دوسری چیز خواہی کہ گنہگار سے کہیں کہیں کہے گا، اور کیا پسند نہیں کرتے کہ اگر کوئی گنہگار دینا دینا اپنی کتاب میں سے لے لیں اور خواہ ہر شے کہیں میں سے، اس امر کو کہ تمھارے بیورو کو گنہگار کے طرف سے کسی طرح کی پہچان دینی، کسی گنہگار کے حسد سے کہیں نہیں پہچانے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور رحمت کے ساتھ جس کو جس کو منظور کرتا ہے، انھیں انھیں انھیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے۔

**خاتمہ۔** ان بیوروں کے زودھوئے تھے، ازل بیوروں کا پیشرو اسلیم ہے،  
 دسکان کا کاروبار ہونا، قوتوں جوے کو تو یہ ثابت نہیں کر کے، قرے دھوے سے کیا جانتا ہے  
 اور پھر دھڑی ہے یہی فضول سی بات، کیونکہ جب ناسخ آج ہے مضموع کر کر دیا جاتا ہے  
 افضل طرافضل کے فرق یہ مرقوف نہیں، البتہ آج کا ہر لکھنوی ہونے لگے اس کے برابر

یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

صرف دوستوں کو خبر دینا ہی کافی نہیں ہے، اور اہل گھر کے ساتھ مشرکین کا ذکر، مصلحتوں کو قوی اور حاکم کرنے کے لئے کیا گیا، اگر جس طرح مشرکین ایضاً تھانے سے خبردار نہیں اس طرح اہل گھر کو بھی۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْزِلُهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ  
 جو نسخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا نازل کرتے ہیں تو بخیر ہے اس سے بہتر اس کے برابر کیا کچھ کو

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ۝۱۰۱  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝۱۰۲  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَفْضَلِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۰۳  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝۱۰۴  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَفْضَلِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۰۵  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝۱۰۶  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَفْضَلِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۰۷  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝۱۰۸  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَفْضَلِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۰۹  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝۱۱۰

لہذا میں نے اور نہیں تصانیف و ایضاً ان کے سوا کوئی حمایت اور نہ ہردگار ۔

[illegible]

معارف و مسائل

تائیدِ حقینِ اَللّٰہِ اَعْلٰی اُنْکے کرتا، اس آیت میں کسی آیتِ قرآنی کے منسوخ ہونے کی جتنی ضرورت ہو سکتی ہے سب کچھ کر دیا ہے، قبیح کے لئے نفلت میں زانی کرنے اور بھٹکے کے آنے میں، اس میں تمام مغفرتِ جہالت کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں نفلت سے مراد کسی حکم کا ادا نہ کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اس میں یہ ملاحظہ کیا کہ کتاب و سنت میں حرج ایک ٹکڑے کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جائے ہو، بخلاف وہ دوسرا حکم ہی ہو کہ سابق حکم کا اہل غم و اندوہ یا جانتے ہو کہ اس کا منگو دوسرا عمل تھا جانتے۔

[illegible]

ایک بیماری صورت سے بھی برائی ہے کہ حکم دینے والے کو قائل ہی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت پہنچا مناسب نہیں کیا کہ وہ اس حکم کو بگاڑ جائے، جانتے ہوئے آج تک حکم دیا اور جب اس طرح کے مطابق حالات بدلے تو اپنی صورت اور اس کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس مثال میں ہے کہ اگر مل کے خورد و حالات کو دیکھ کر کوئی کہہ دے کہ آج کرنا ہے، اور وہ جانتا ہو کہ وہ اس درد کے سبب نکال کرنے کے بعد دوسری کھان کا مل بنے گا، اس وقت بھی دوسری درد جو کرنا ہوگی، وہ سب کچھ جانتے ہوئے بدلے گا، یہ درد اور بخیر کرنا ہے جو اس درد کے مناسب درد کے مطابق حالات بدلے، دوسری درد اور بخیر کرتا ہے۔

ماہر سیکرٹری انچارج میجر سرکار کے کہ چیلنج کی دن اپنے ملازم کا نظام گھر کو رہنے کے دوران  
تک سے دور پہنچا کر دیا۔ پھر کچھ روز گزارا اور ایک ہفتہ گزارا۔ وہاں میں نے اس کی طبیعت پر  
بے وجہ ایک بار بھی ڈانٹا ہے۔ اس میں مسئلہ نہیں کی وجہ سے عمل کا میں خواہ ہے۔ اس لئے وہ  
پہلے ہی سے سب نقصانات نہیں جانتا۔

فصلی شام کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت  
نسخ کی جو صحیح ہے، اور ہوئی رہی ہے، ہرگز نہ والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب کے پھیل



نیز تلواریں رکاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی بہت اور شریعت میں ایسا ہونا باوجود عرصہ تک حکم جاری رہا، پھر یہ ثابت ہوا کہ حضرت خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:

قوله من نبتة خطا لا شافعه .  
 میں نے اپنی کھوپڑی پہن کر کہا کہ میں نے خطا کیا اور وہ خطا جو میری ہے

جہاں پر شریعت | اللہ کو چاہی ہو بدلوں نے اپنی جہالت سے احکام کو اپنے لئے کوئی نیا احکام کے کچھ کی پہل دو دنوں میں بدل کر لیا اس کے لئے کہ یہ پہلی احکام کو بدل دیا اور اس کے لئے کہ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: **وایما جہسیرا ہی کثیر وغیرہ**

مسلمانوں میں سے منسوخ و معطلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے منہ سے بچنے کی وجہ سے یہ کہنا کہ احکام کو اپنے میں منع ہونے کا امکان تو ہے، کوئی اور اس امکان کے لئے مانع نہیں، جیسا کہ پہلے منسوخ میں منع کا وقوع کہیں نہیں ہوا، مذکور کی آیت مانع ہے، منسوخ ہے قول ابوسعلمہ اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علماء اہل سنت نے ہمیشہ زور دیکر فرمایا ہے:

تفسیر روح البیان میں ہے:

وانقضت اهل الشرائع  
 جواز النجس و وقوعه و خالف  
 اليهود غیر العیسوی کہ فی جواز  
 و قالوا ینقض عقلاً و بالمرسل  
 النسخ فی وقوعه فقال انه و  
 انصار حقل لکنہ لرفعہ .

(۱۵۲۳ ص ۱۲۸)

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

معنی فتن الالباب اکیسے د  
 فائدتہ حلیۃ لا تستغنی عن  
 معنی فتن العلماء و لا ینکحوا الا  
 البہلۃ الا علیہا . (قرطبی ص ۱۶۶)  
 منشی نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ  
 مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وہاں پہنچا کہ وہاں آگ لگ چکی ہے اور وہاں سے لوگوں

نے کہا کہ وہاں دھواں دیکھتے ہو، آپ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی دھواں نہ دیکھتے ہیں، بلکہ یہ کہنا جانتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو بیچارہ! پھر اس شخص کو بولا کہ یہ جہاں کیا تم قرآن وحدیث کے مانع منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہماری مسجد کھلی جاؤ، آئندہ ہمیں یہاں دھواں نہ ہو۔

مشرکوں و منصف میں منع کے وقوع وقوع کے متعلق صحابہ کرام میں سے اتنے آثار و اقوال پہنچے ہیں کہ ان کو بیان کرنا مشکل ہے، فقیر ابن جریر، ابن کثیر، رد المحتار وغیرہ میں اسانہ قویہ میرے ساتھ بھی بہت روایات مذکور ہیں، اور وہ اپنا یہ حلیہ قیادہ کار بنائیں۔

اس لئے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماع رہا ہے، صرف ابوسعلمہ اصفہانی اور چند محدثین نے وقوع منع کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازنی نے تفسیر تحریر میں شرح و ہدایت کے ساتھ رد کیا ہے۔  
 نیا کہ منہ میں حق ہے، و تاخری | جو کچھ منہ میں حق ہے منہ ہی منہ ہے، اور یہ منہ ہی کہ منہ میں منسوخ | جس طرح ایک حکم کو باطل دیکھ کر منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لائے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنا دینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کا اضافہ بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف امت نے منع کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا ہستنا، وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآنی آیات منسوخ یا نسخہ کار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام منع رکھا ہے، جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہوئے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخ کی تعداد بہت گھٹ جاتی گی، اسی کا لالہ اثر یہ تھا کہ حق میں نے تقریباً پانچ آیات قرآنی میں منع ثابت کیا تھا، جس میں سے منہ ہی تبدیلی قید و شرط یا ہستنا، وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں سلامہ سیوطی نے صرف منہ ہی آیات کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیات کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل یا تفسیر کے نہیں ہو سکتی، یا اس لحاظ سے منہ ہی کہ احکام میں اصل بقا یا حکم ہے، منع غلطی اصل ہوا اس لئے جہاں آیت کے معنی یہ ہونے کی کوئی قیود ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت منع اتنا درست نہیں۔

کیونکہ اس تفسیر میں منہ ہی، مگر نہیں ہو سکتا کہ منہ ہی منع اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوئی وجہ نہ ہو، پھر اس کی تفسیر میں منہ ہی، آخری اکتشاف حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا،





عَلَىٰ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَاقِعُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا

پرچیز پر قادر ہے ۔ اور قائم رکھو نماز اور دینے دو زکوٰۃ اور جو کچھ

لَقَدْ مَوَّالًا نَفْسِكُمْ مِنْ خَيْرِ عِبَادِي وَعِنْدَ اللَّهِ لَنُفَّةٌ

آگے پیہر دے اپنے واسطے بھلائی پاتو گے اس کو اللہ کے پاس ، بے شک اندر

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے ۔

خلاصہ تفسیر اور میں یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دینی اور غیر خدائی کے چیلے

میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے ، اور ادا کو

اکاسی کے اپنی اُمت سے باز داتے تھے ، منی قتال نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرادیا کہ اپنی

مسابقت میں یہود ، عیسائیوں سے تفریق نہ کرے ، چاہتے ہیں کہ تم کو تھامے لہذا ان سے بچو

کافر کواپنی راہ پر چاہنا کفر غیر خدائی سے نہیں ایسا کو ۔ انکار کرتے ہیں ، بلکہ احسن حد تک

وجہ سے جو کہ تھامی جا سکتی کسی امر کے سبب چپا نہیں ہوا ، بلکہ انھوں نے قبول ہی سے

رجوش مانا ہے ، اور یہ بھی نہیں کہ ان کو رنج نہ ہوا ، بلکہ حق واضح ہوئے پچھو رہا

ہے ، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ کرنے کا حکم تھا ، اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ تیرا اب تو

سادہ کر داور دگر جب تک حق تعالیٰ اس معاملہ کے متعلق ، اپنا حکم قرار نہ دے ، اس

واشارہ بتلاؤ کہ ان کی کشتیوں کو نہ کا علاج قانونی اسلام میں منی قتال وجہ سے ہم

بلکہ کرنے والے ہیں ، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھکر اس قانون کے اجراء

کے متعلق کجب سو سکتا تھا ، اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم جو یہودی کہ جو اللہ تعالیٰ پر چڑھ

دعاؤ وہ معمولی بڑھوا ، عجیب ہوا ، قادی ہیں ، اور زبردست موت ، انھیں پابندی سے چڑھے جائز

اور ان پر زکوٰۃ فرض ہے ، زکوٰۃ دینے جائز ، اور جب وہ قانون آجاتا ہے ، ان اعمال صالحہ کے

اس کا بھی اضا ذکر کیا ، اور یہ کہ یہودی کجب تک چاہا کہ ان کو دے دے صرف نماز روزہ سے کہ تو اب

میں کی دے گی ، نہیں ، بلکہ اگر کجب کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے چاہے کہ وہ تم سے حق تعالیٰ

کے پاس دیکھ کر ، اس کو دوا پر دامت صلہ کے پاتو گے ، یہودی کہ اللہ تعالیٰ تم سے کئے ہوئے

کاموں کی وجہ سے کبھی ہمارا ان میں کا ایک ذرہ بھی متانے نہ ہوئے ، ہائے کا

فائدہ ، اس وقت کی حالت کا بھی متنبہ تھا ، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا

اور حاد کی آیات نازل ہوئیں ، ہمیں کے پیروں کے ساتھ ہیں وہ قانونی برتاؤ کیا ، اور ان کے

لوگوں کے ساتھ حسبِ حیثیت ان کے لئے کوئے نکل باجہ دینا یا جو یہ پر عملدرآمد کیا گیا ۔

وَقَالُوا لَن يَذَّلَ لَنَا الْيَتَامَىٰ وَلَا مِنَ كَانَ هَوْدًا أَوْ نَصَارَىٰ

اس کہتے ہیں کہ ہرگز نہ ہمارے جنت میں عمر جو یوں گے یہودی یا نصرانی ۔

تِلْكَ أَمْثَالُهُمْ قُلْ مَا تَوَاتَرُوا بِهَا تَكْمُلُ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

یاد رکھیں ، انھوں نے انھوں نے کہہ دیے کہ آئندہ اپنی اگر حق پہنچے ہو ،

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ

کیوں نہیں ، میں نے تاج کر دیا ، ان کے لئے ، لیکن ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے ان کے لئے

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُودُ

اور وہ ڈرتے ہیں پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ، اور یہودی تو کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ

نصرانی نہیں کسی راہ پر اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی نہیں کسی راہ

عَلَىٰ شَيْءٍ ، وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ لَئِنْ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

ہر ادھر دیکر سب پڑھتے ہیں کتاب ، اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ قَالَتْ يَتْلُمُ بَنِيهِمْ يَوْمَ الْفَيْتَمَةِ فِيمَا كَانُوا

انہی کی کسی بات اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَحْتَلِفُونَ ۝

مختلف کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر اور یہود نصرانی دونوں کہتے ہیں کہ یہیشت میں ہرگز کوئی نہ جائے یا دیکھا جو

ان لوگوں کے جو یہودی ہیں وہ فرمودہ کا قول ہے ، ان لوگوں کے جو نصرانی

ہیں وہ نصرانی کا قول ہے ، من تھان لوگوں کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نصرانی

دل بھولے کی باتیں ہیں اور حقیقت یہ بھی نہیں ، کتب ان سے یہ تو کہنے کا دھانچا ، اپنی دلیل کو

[illegible]

اور غاصبوں کی قید سے منافقوں جل گئے تو یہ کہ وہ بھی شرعاً کفار ہیں اور داخل اسلام کی چیز نہیں  
 اور ایک اور یہ کہ جو ادھر کی نصرت اور پیٹھ پر کمر بند ہی بنا کر بیٹھ گئے، تو یہ بدروپ اپنے عقیدہ کو بیاں  
 نصاریٰ کے دین کو بیاں کرتا ہے، اور حضرت علی علیہ السلام کی بہت اور اوچل کے کتاب النصار کے  
 انکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ میں عند وقتب میں اگر یہ بدروپ دیکھ لیں، اصل دیکھ لیں گے، اور حضرت علی  
 علیہ السلام کی رسالت اور قربت کے کتاب النصار میں گناہ انکار کرنے لگے، مگر حقائق اس عقیدہ کو  
 نقل فرما کر بغیر قرآن سے لے کر آپ کے کہہ دیے گئے، کہ انصاری کا مذہب (جسے بنیاد پر دو قائم اولین  
 دین سر سے غلطی سے جو اس طرح انصاری کہتے تھے کہ یہ وہ دیکھنا ہے، اسی بنیاد پر قائم نہیں،  
 دین سر سے غلطی کا مذہب، فرقہ کے لوگ اس میں اتنی ہی دھن دج نہ دیکھ سکتے تھے، انہیں یہی بدروپ  
 کو دیکھ کر دین میں کچھ نہ دیکھنے پر آمادہ ہوئے، تو ان کو اس پر آمادہ ہونا ہوتا تھا کہ انہیں نہ جو یہ بدروپ  
 قبول کیا، اصل بنیاد پر منحوس نہ ہوئے بلکہ قابل اصل مذہب پر ادا رہے۔

اور اہل کتاب کو اپنے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشینیں کہیں جو کچھ بایا اور اس طرح سے لوگوں کو دیکھ کر راضی و مطمئن بنائے، اہل علم و ادب کی اہل کتاب کا سا قول دہرانے لگے۔ وہ کہنا شروع کر دیں کہ یہاں سب اہل علم و ادب ہیں، اس لئے یہاں سب اہل علم و ادب ہیں، انہی کے لئے کتابیں لکھی گئی ہیں، انہی کے لئے تعلیم دی گئی ہے، انہی کے لئے قیامت کے دن ان تمام عقائد میں جن میں

۱۵) باہم اختلاف کر رہے تھے، لاہور، علی فیصلہ سے ہر گناہ کا بین بن کر ہشت میں اور اہل باطل کو جہنم پہنچانے کا، اہل فیصلہ کی سید اس نے لکھائی کہ کوئی اور برائی فیصلہ تو عقل و عقل کا دفاع کے ذریعہ اور ایمان بھی ہو چکا ہے۔

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے پر مذہب کا ذکر کرنے اور ان کی تائید اور اس سختی کے منہ زلفات کا بیان، پہلا اصل حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم بات یہ تھی کہ یہاں آگے آجائے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے دین کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنائی تھی اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے باقی اور مقبول ہونے اور اپنے سوا حقیقتاً اقوام عالم کے روبرو پیش کرنے اور گمراہ ہونے کا مقصد تھا۔ اس مسئلہ اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ حیسانیت کہیں نے دنیا اور یہودیت میں ہے اصل، حق و صحیح ہیں ہماری نسبت برتری ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی حیثیت و گرامی کے متعلق منسوخ فرمایا کہ یہ دونوں قومیں  
میں جانے کے اصل مہذب کاغذ ہیں، بعض مذہب کے نام کی قومیت کے چھپے چھپے ہوتے ہیں، حقیقت  
یہ کہ مذہب جو دنیا انصاری یا اسلامان سب کی اصل روح دوزخ میں ہیں!

ایک بے گناہ کو دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ تو خدا کا رسول ہے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا واجب و ضروری ہے، چاہے یہ کس مذہب میں داخل ہو، حقیقت یہی ہے کہ ہر مذہب کو فرمانروا کر کے پس پشت ڈال کر پیروی یا اطاعت کو اپنا مقصد بنالیا، اس میں وہ مذہب ہے جو حقیقت و ایمان کی راہ پر دوسری بات ہے کہ حقیقت میں جانے کے لئے صرف یہ ہی کافی نہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ میں نے خدا کی فرمانبرداری کی یا خدا کو دوست کر لیا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت و اطاعت اور امتثال امر کے طریقے بھی دیکھنا، اعتبار کرنا جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے بتائے اور مصلحتیں کے ہوں۔ پہل بات یہ تھی کہ اللہ کے رسول کے ذریعے اور دوسری وہ کھوٹیں جن کو اللہ کے ذریعے واضح کیا گئی ہیں جو جس سے معلوم ہوا کہ کجی یا اخروی اور دنیوی حقیقت کے لئے صرف قصد اطاعت کافی نہیں، بلکہ خیر میں بھی ضروری ہے کہ اس میں عمل کا صداقت دینی تعلیم و طریقہ ہے جو قرآن و سنت و صلوات خیر الامم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔





وہ دوستوں کی فرست میں داخل ہے، اس کے برعکس اہل کفر سے اس کا سزاوارتہ دنیا ہی بنائی جاتی ہے، دنیا کی آخرت کا وہ بظاہر جانے، بظاہر کے کارکن کے پاس یہ باتیں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہر ایک سزاؤں سے ان کا بظاہر مذاہب بظاہر نہیں کیا جاتا، جس کو ایک سخت و مناسب میں پکڑا جاتا ہے، رسول کریم ﷺ کو مسلم کے اس رشتہ دار کو ایسی سزا دینا کہ اس کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جہنم ہے۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے مندرجہ بالا اور پریشانی اور کٹنگ کی ترقی کو نام کی ہے کہ اگرچہ حق پر عمل کا ہوا اور خاصہ تکلف ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ برمال میں نفاذی، اور ایک خاصہ ہے دنیا کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں نوری دانت لگا کر بیچا کر اور اس کے علاج کی طرف توجہ دینے تو شخص تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اس طرح وہ دار و دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ میں مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی دوسری ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان انصاف و پرہیزگاری اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ مکتول ہے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، اراضی اور حکومت سیاست کے مفید راستوں کو نہتیا کر دیا، معطر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لے، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر چلے جاتے اور دوسری ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کٹنگ کر مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بن سکتا، پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر جہاد اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فوجات کے دروازے کھول دیا، اسلام و اپنی اگر داخل صحیح اصول پر چلی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجات آخرت اور جنت کی دائمی دستبرد دنیا میں مال و دولت کی فراوانی و پیش و آرام کی دستبرد اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتا، فروری جیسے جیسے اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد کی جائے۔

اور بات تجربہ سے ثابت ہے، ذکر جہاں ہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت سیاست کے اصولی چکر کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دوسری فوجات و نتائج کے خورم نہیں رہتا، جو کس کا کفر کو عمل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو کہ دنیا میں ہمارا انصاف و جہت سچا اور صاحب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان ظلم کاموں سے منکر ہونے کا نتیجہ ہے جس کے عمل میں آئے، مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب پورے مال و مال کے ساتھ اخلاق کا اتفاق پیش کیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کٹنگ اور آخرت سے غفلت اور بے حسی اور دنیاوی اخلاق کو سبب سمجھ کر، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سمجھ کر ان کے وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں ان کے پیچھے ان کے شک و شبہ، ماحول کی پانی، بات کی پانی اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کر کے لئے، نئے طریقے جو وہ صنعت و اسلامی کی اصلی تعلیمات ہیں، ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نفی ان کے لئے کرنا نہیں کی تو یہ تصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا تصور ہے۔

ان غرض مشرق کی ان بات کے واضح کر دیا کہ اصل سبب اسلام کا نام کا دنیا کی کسی بھی چیز میں نہیں پڑتا، جب تک ایمان اور عمل صالح کو حاصل طور پر نہ پڑا دیا جاتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِکَّرَ فِيهَا اسْمُهُ وَ  
سَمِيَّ نَحْرَ ابْنِهَا وَأَذَلَّتْ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْعَاقِلِينَ  
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰  
اور اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے، ایسا کہ اللہ کی مسجدوں میں کرنا چاہتے ہیں اس کا نام اور  
سَمِيَّ نَحْرَ ابْنِهَا وَأَذَلَّتْ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْعَاقِلِينَ  
موسیقی کے ان کے اجازت ہے، ایسا کہ لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مکرر دہرے ہوئے  
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰  
ان کے لئے دنیا میں ذلت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور اللہ کا پکارنا  
النَّاسِ وَالْمَعْبُوثِ فَإِنَّمَا تَوَلَّوْا قَوْمًا قُلُوبُهُمْ مُّصْرِفَةٌ عَنْ رُوحِ اللَّهِ وَإِنَّ اللَّهَ  
مَرْفِقٌ أَوْ مُخْرِجٌ مِّنْهُمْ سَلْطَنٌ ثُمَّ كَرُوْا وَإِنِّي مُتَوَلِّوْهُ جَاءَ اللَّهُ بِحُكْمٍ  
وَأَمْرٍ عَظِيمٍ ۝۱۱

پھر ان کے پیش کر دیا کہ سب کے پکارنا

خلاصہ تفسیر  
دوسرے وقت قبیلہ کا حکم دینے کے وقت طرح طرح کے اعضاء کر کے کہ سب کو گول  
کے دلوں میں مشیہات پیدا کرتے تھے، اگر وہ مشیہات عام طور پر قلوب میں افر  
کرتے تو کلاں خیرہ انکار و رسالت اور ترک مذاہب، اور ترک نماز سے مسجد کی دیر لانی لازم ہے،  
وگرنہ یہودی اس طرح سے ترک نماز اور ویرانی مساجد خصوصاً مسجد نبویؐ میں بھی کرنا شروع کر دیا  
روم کے بعض مسلمانوں جو نصاریٰ کے اسلام تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار نہیں کرتے  
تھے مگر وہ نصاریٰ مذہب کی زبان میں یہود مشابہہ کر دیتے تھے، عقل و قتال میں پورا اور اس  
وقت بعض قبائل کے اکثر مسیحی بیت المقدس کی بے حرمتی میں کوئی اور بدنامی کی وجہ سے اس میں



وہ دوستوں کی فرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں آتی جاتی ہے، دنیا کی آخرت کا وہ بھلا ہو جائے، بھلائیوں کا کارکن ہے، دنیا کی بھلائیوں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی بھلائیوں سزاؤں سے ان کا پر مذہب بھلا نہیں کیا جاتا، جس کو ایک سخت ماسب میں پکڑا جاتا ہے، رسول کریم ﷺ کو سلم کے سر شاگرد کی وجہ سے طلب کر کر دیا، جس سے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جہنم ہے۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے مشنرل اور پریشانی اور کٹنگ کی ترقی کو امام کی ہے کہ انہیں حق پر عمل کا ہوا کا خاصہ نکتہ ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ برمال میں نفاذی، اور ایک خاصہ ہے دنیا کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں توفیق دات لگا کر پکڑا کر اور اس کے علاج کی طرف توجہ دے تو شخص تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اس طرح دوا دار کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ برمال کی برائیوں میں عمل نہیں کر سکتا، کفار کی دوسری ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان انفس اور پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ مکتول ہے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت سیاست کے مفید راستوں کو پشت کیا، معطر طریقوں سے بچے، تو دنیا میں ترقی حاصل کر لیں، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر چلے جاتے اور دوسری ترقی کے لئے اس کے اصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کٹنگ کر مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بن سکتے، پھر ہم یہ کیسے سمجھیں کہ جہاں اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فوجات کے دروازے کھول دیئے، اسلام و اپنی اگر داخل صحیح اصول پر چلی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذریعہ نجات آخرت اور جنت کی دائمی راستہ ہو، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا پیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجہ میں حاصل ہوتا فردی جیسے جیسے اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد کی جائے۔

اور بات تجربہ سے ثابت ہے، ذکر جہاں ہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت سیاست کے اصولی چکر کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دوسری فوجات و نتائج خود میں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا دنیا میں ہمارا انفس و جہت سیاح اور صاحب ذاتات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان ظلم کاموں سے شرم کرنے کا نتیجہ ہے، جس کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں فراوانی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب مراد والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق پیش کیا تو ہم نے ان سے

صرف ان کا کٹنگ اور آخرت سے غفلت اور بے حسی اور اخلاقی فوسب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سمجھیں جن کی وجہ سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں ان کے پیچھے ان کے کٹنگ، ماملوں کی پانی، بات کی پانی، اور دنیا میں اثر و رسوخ حاصل کر کے لئے طریقے جو وہ صنعت اسلام کی اصلی تعلیمات ہیں، ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی لغت اندر لے کر کٹنگ کی کو یہ تصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا تصور ہے۔

انہیں مشنرل کی ان باتوں نے واضح کر دیا کہ اصل سبب اسلام کا نام دنیا میں کیا کسی نتیجہ نہیں ہوتا، جب تک ایمان اور عملی صالح کو حاصل ہو کر نہ پکڑا نہ کیا جاتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِكرَ فِيهَا اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے، ایسی اشکی مسجدوں میں کرنا چاہوے وہاں نام اس کا اور

سَمِيَّ نَحْنُ نَحْنُ اِيْهَا دَاوْلِيْكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوْا هَآلِكَ اَلْمَسْجِدِ

موسلمین ان کے اجازت سے، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر وہ نے ہرگز

لَهُمْ فِي الدِّيَارِ اِخْرٰى وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۵

ان کے لئے دنیا میں دوزخ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور اللہ بڑا

الْمُنِيْمُ وَالْمَعِيْزُ فَ لَا يَسْتَاوُوْنَ اَلَّذِيْنَ اَقْتَمَوْا حُجَّةَ اللَّهِ اِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب میں سونے لوت تم کو رو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ بڑا

وَالْبَاسِعُ عَظِيْمٌ ۝۱۶

پہلے کٹنگ کر دیا، سب کے کٹنگ کر دیا

خلاصہ تفسیر  
دوسرے وقت قبل کا حکم دے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ مسجدوں کو ان کے دلوں میں شہادت پیدا کرنے تھے، اگر وہ شہادت عام طور پر قلوب میں افر کرتے تو ان کا ان نتیجہ انکار و رسالت اور ترک مذہب تھا، اور ترک مذہب سے مسجد کی برائی لازم ہے، اور گویا یہودی اس طرح سے ترک نماز اور ویرانی مساجد خصوصاً مسجد نبویؐ میں بھی کر سکتا تھے، اللہ روم کے بعض مسلمانوں جو نصاریٰ کے اسلام تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار میں نہ کرتے تھے مگر وہ نصاریٰ مذہب کی زبان میں یہود مشام پر چڑھ گئے تھے، عقل و قتال میں ہر دو اور اس وقت بعض جہلاء کے اعتراض سے مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی بھی ہوئی، اور بدیہی کی وجہ سے اس میں

خلافہ و غیرہ کا جہاد میں نہ ہوا اس طرح یہ نصایح کے اسلاف ترک نماز و زکوٰۃ والی مسجد کے بانی ہوئے، اور نصایح پر ہر عہد میں ان کا التزام کیا گیا، اس پر اشراف کا نام ملے جس مقام اور نصایح کو کتب میں لکھا گیا کہ اس میں یہودیوں کی تبدیل ہوئی تھی اور یہ یہود سے حادث دیکھتے تھے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے مکہ منظر میں داخل ہو کر مسجد الحرام کا طواف اور نماز اور اس زمانہ چاہی تو مشرکین مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال وہاں تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی سمجھ گرام کی ویرانی میں کوٹھن ہوئے، اس بات پر حق تعالیٰ نے عید معلوم سے اس کی قربت اور برائی ظاہر فرمائی، یعنی، اور اس شخص سے زیادہ اور کون عالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی عید میں نہ اس کی مسجد حرام، نہ منبر کی مسجد بیت المقدس کی مسجد اور مسجد مسیحی، ان میں ان کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے بند کر دے، اور ان دمساحہ اسے ویران اور مغل (بھولے) کے بارے میں کوٹھن کرے، ان کو کتب کو کھینچ کر بیت وادہ بیابان، ہر گز اور دمساحہ میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، اور کچھ جگہ تو نہایت سخت و حرمت اور بے جانے جب بیابان ہو کر اندر جانے تک کا اشتیاق نہیں تو اس کی کینک حرمت کا سبب حاصل ہوا، اسی کو نظر فرمایا گیا، ان کو کون کو دنیا میں بھی رسولی نصیب ہوگی، اور ان کا آخرت میں بھی سزا دے عظیم ہوگی۔

دوسرے شیعہ میل قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یعنی، اور اللہ تعالیٰ کی ملوک ہیں اور سب چیزیں اس پر مشروط ہیں، اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)۔

پہلی جہت وہ آنگ ہیں جس جہت کو چاہا، قبلہ مقرر کروں، کیونکہ کثرت تعین قبلہ میں مشقتا ماہ میں کا اتفاق بیت اور اجتماع غلط ہے، اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا حکم دین میں بتائے ہوئے نہ ہو، ان بات پر یہ سمجھ کر کہ ذات نور اللہ تعالیٰ جہت خاص کے ساتھ مقید ہوئی فرض وقت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلہ عبادت بننے کا اصرار یا اختیار لیکن وہ ذات ایک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے، تو تم لوگ جس طرح بھی تمہارے اور دوسرے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایک کا فرض ہے، کیونکہ حق تعالیٰ درود تمام جہات اور اسطرح کر، اور یہ اس طرح کا اسطلاح ان کی شان کے لائق ہے، لیکن اگر درود عید و خود ہوئے کے پھر بھی جہت عبادت کو ضمیمہ اس لئے فرمایا کہ وہ کامل نظر میں، اور کہہ رہے کہ مصالح کو خوب جاننے ہیں، چنانچہ ان کے علم میں یہ تعین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دیا۔

۱۔ اور انی مساجد میں کوٹھن لگروں کی دنیا میں تو یہ رسولی ہوئی کہ یہ مساجد میں قریش اور ان کے اشراف کی رعایت اور بچ گزرا ہو، اور مطالب آخرت کو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے، اور انی مساجد میں کوٹھن کے سبب یہ مطالب اور بھی سخت و شدید ہو جاتے تھے، اور ان کی آپت میں ہوا ان چند اشراف کوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ لگوا ہوا تھا اس قصہ سے اسل قزو کا ایک عہد معلوم ہیں پھر آیا کر ایسے ایسے افعال کر کے صاحب حق ہونے کا دعویٰ بڑے مشہم کی بات ہے۔

۲۔ تعین قبلہ کی ایک حکمت بلکہ مثال اور بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفین استدلال کیا یہ اعتراض کہ مسلمان کعبہ پرست ہیں، بالکل احمقانہ۔ جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت کعبہ کی تلب کی ضرورت، اور نیز اوپر کی ہیست اجتماع کر بھی اس کی کوئی مثل ہو چکا ہے، یہ دونوں بھی حیرت و شادہ سے ثابت ہیں، اس لئے اس کی پھول اور اجتماع ہیست حاصل کرنے کے لئے تعین ہیست شروع ہوئی، لہذا اس اعتراض کو شہد کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برأت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی چوٹی کو سامنے اس قصد و فرض سے دیکھتے ہیں، تو اقول قواہی برأت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں کوٹھنا، وہ بدستور غلط و اجڑا اس مقام پر مفسر و اصل ہے۔

۳۔ عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تعین کر کے یہ مدعی پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راستہ مقرر ہوا، اور رسول کا دروازہ گھوڑا ہر وقت پرش کو معلوم ہو سکتا ہے۔

۴۔ یعنی سبیل التستر کیا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مانا بھی لی جتے پھر بھی اس میں تعین اور تعین کے لئے کسی بدستور شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ چیز اہل اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ فقہ کے میں ہیں یہاں حکمت کے لئے یہ لفظ مشافہہ کیا گیا، تو اس کی وجہ یہ ہو کہ احکام خداوندی کی کثرت اور بعض اوصاف اور استنباح کے ساتھ جس کے اوپر ایک میں نہیں، اس میں مسکن میں بھی جزا دیں چھوٹیں ہوں گی، ایک دو کے بعد جانے سے ان میں تضاد اور رسول کی غلطی نہیں ہو سکتی۔

۵۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ اگر اصرار اللہ کا ہے، اور اس طرح یہ جو فرمایا ہے کہ وہ کچھ بول اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کم کو ذکر کی جاتے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پروردگار کسی بندہ سے ممکن نہیں ایسی طرح اس کی صفات کی حق تعالیٰ سے خارج ہے۔



اجلا ان صبر وایمان لے کرے، اس سے زائد کا انسان نکلت نہیں۔  
حقائق کا رکس نشرو دام از حبیبین  
کا بیجا ہمیشہ ابو بدست است وام ہا

## معارف مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے اپیل آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق بتا دیتی ہے۔

واقعہ یہ کہ زمانہ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے اس سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی اور شاہ کے ساتھ مل کر اپنے اوشاء، طیسوں کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور لوہے کی تختے جلا ڈالے، بیت المقدس میں خیمات اور تختہ ڈال دیئے، اس کی عمارت کو خراب و برباد کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال کر ڈیا اور حضرت علیؑ علیہ السلام کے جہد مبارک تک، بیت المقدس اس طرح ویران و مہدم شدہ تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے جہد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، نئے نئے دار و جنگ دار ملک شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آئے، پہلوں کے جہد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اور تقریباً سو سال پورے کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ جمعی مدنی جس میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔ وہی نصاریٰ کی اس مستحاضہ حرکت پر کہ تو اس کو یہاں پر انور بیت المقدس کو خراب کیا ہے اس کی جے حق کی ہے آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر العصرؒ ان حضرت علیؑ نے کہا ہے، اور حضرت ابن زیدؒ وغیرہ دو دستہ مفسرین سے آیت کا شان نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکین نے رسول کریمؐ کو علیؑ علیہ السلام کو واقعہ مدینہ کے وقت چھ گرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی، ابھر چرنے پہلے روایت نمودار اور صحیحہ نے دوسری کو ترجیح دی ہے۔

صلحہ مفسرین نے اس پر اس اوشاء کا نام تحت تصریف لیا ہے، صورت تحت تصریف اس نزول میں ہو سکتا کہ اس کا زمانہ حضرت علیؑ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں ہی، اور شکار شکار کجبت نصرانی کہنے لگے جو یوں محمدؐ (محمدؐ)

بہر حال آیت کا شان نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام فقہوں میں ایک متفق ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاہم جس قدر کہ انہی نصاریٰ و مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے عام ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے شہادۂ فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا معنوں یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں رگوں کا شکار کرے تو اس کے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

مقتضا اللہ کی عظمت کا تقاضی ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو بہت عظمت اور شوق و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شہید و دہر میں داخل ہونے میں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واضح ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے،  
اولیٰ یہ کہ دنیا کی تمام مساجد اور آپ کے بعد کے خلافت ساری ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبویؐ کی جے حرمت ظاہر ہے، اس طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان میں سے مساجد کی خاص بزرگی و عظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا صلہ ہے، ان میں سے مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دور دور و ملکوں سے مسافر کے پہنچنا موجب قراۃ علیہم اور باعث برکات ہے، بخلاف دوسری مساجد کے ان میں سے مسافر کے پہنچنا دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو فضائل جان کر اس کے لئے دور سے مسافر کے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجدیں ذکر و نماز سے روکنے کی جتنی بھی مسجدیں ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں ان میں سے ایک صورت تو یہ ممکن تھی ہے کہ کوئی مسجدیں چلنے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے مبرا ہو کر رہ جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجدیں شور و شب کے واسطے کے قریب دھاریں باجے جائے یا جگہ کو گروں کی نماز و ذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اس طرح اوقات نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا جمعہ رکعات وغیرہ میں مشغول ہیں مسجدیں کوئی جہت نہ کرانے خلوت، اگرچہ ایسا کرنے کے لئے بھی نماز کی کوئی نماز کو مسجد میں ملال ڈالنے اور ایک جہت سے اگر امانت کو روکنے کی صورت ہے، اس کے خلاف حضرت قتباؒ نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، اب جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو جائے وقت ذکر و تلاوت چہر کا معنا لگے نہیں،





قَوْلِهِ وَتَحَقُّظَ شَهْنَةِ الْحَرَامِ، وَتَحَقُّظَ مَا تَحْتَضِرُ كَوْنَهُ  
وَتَحَقُّظَ شَهْنَةِ شَهْنَةِ (۲۰۲)

ترجمہ۔ آئینہ کہ تیار رہنے کی دل پرست کی وجہ سے بار بار اس کی طرف مکرر اٹھکر دیکھتا ہے  
وہ شاید فرشتہ و حکم کے آئے ایم پسند نہ ہو رہے ہیں، اس لیے ہم آپ کو اس قبلہ  
کی طرف متوجہ کریں گے جس کو آپ چاہتے ہیں، اس لئے آپ آپنا چہرہ و سامان میں  
مہر حرام کی طرف مبرا کر دیا، جس کو آپ کیسے کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت  
کے لئے ہی پاک و پاک کیا گیا، انہیں چاہیں بھی موجود ہیں، یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے  
اندھ بھی ہزار ہا میں اپنا چہرہ حرام کی طرف تیار کر دے

الزمن آیت مذکورہ و فیہ الشہنۃ فی و الشہنۃ ثب۔ نے منتقلی قبلہ کی ہری حیثیت  
کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا، بیت اللہ یا بیت المقدس کی معادلات پر مشتمل نہیں، اور دنیاوی اور  
مکافوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سامنے عالم پر پیدا اور ہر  
سمت میں اس کی فوج کیساں ہے، ہر جہت میں خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا گیا ہے اس میں دوسری  
بھتیں ہیں۔

آیت مذکورہ کے اس معنوں کو واضح اور دل لیشیں کرنے میں کہنے شاید اخصیبت اللہ  
علیہ وسلم اور صحابہ کو کراہی جو بیت کے ادا میں سوز و گداز نہ ہو، بیت المقدس کی طرف مذکور کے  
خاوا اور کرنے کے حکم کے لئے طریقہ پر بندہ دیا گیا کہ ہاری فوج ہر طرف ہے، اور دوافل میں اس حکم کو  
بیشک کے لئے جاری رکھا، کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً ارٹھ، گھڑے و فریو سوار پر ہو  
اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھ ہوئے ارٹھ سے نقل مکان کر دے، اور اس کے لئے قبلہ کی  
طرف رخ کرنا بھی ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے، اس طرف رخ کر لینا کافی ہے  
بعض مفسرین نے آیت لَا تَلْبِسُوا قَوْلَ الْإِسْلَامِ وَتَلْبِسُوا اللہ کو اس نقل مکان کا حکم قرار دیا ہے  
مگر اگر یہ ہے کہ صرف اس سواری کا ہے، جس پر سوار ہوئے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کرنا و رخوار  
اور جس سواری میں سوار ہوئے کہ طرف رخ کر لینا و رخوار نہیں، پیچے رہے، پانی کا جاد، ہوائی جہاز  
ای کی دیکھ کر جو حالت حسرتیں رخ قبلہ کا ہے، اگر نقل مکان بھی ان میں پڑیں مائے قوت و تلبیس  
پڑیں جائے، واللہ تعالیٰ کی حالت میں رہے، پانی کا جاد و رخ تر کیا ہے اور غازی کے لئے مضافی نہ ہو کہ  
وہ بھی قبلہ رخ چاہے، تو اس حالت میں خاوا پر دیکھ کر ہے،

اس طرح چاہے غازی کو سمیت قبلہ معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری و طرح کی وجہ سے نہیں  
متعین کرنا بھی دشوار ہو اور کوئی تھلائے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا ارٹھ اور ٹھیکہ

لگا کر اس طرف کو بھی متعین کرنے کا یہی سمت اس کا قبلہ قرار دے دی جائے گی، خاوا اور کرنے کے بعد  
اگر بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں خاوا دیا کی ہے، تب بھی غلطی ہے، عاوا کی  
ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جسنیات مذکورہ سے  
استنباطی قبلہ کے حکم پر کسی کی ہری حقیقت واضح ہو گئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ

اور کہتے ہیں کہ اللہ نے لکھ کر اوراد و درو سب بھلائے ہے کہہ کر، لکھ کر اس کا چہرہ کہ وہ کساں اور

الْاَرْضِ مِنْ کُلِّ لَہٗ فِیْئُوْنَ ۝ بَلْ یُحِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ کُلِّ لَہٗ

ترجمہ میں سب اس کے کا بعد ہیں، نیا پیدا کرنے والے، آسمان اور زمین کا اور جب

قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَاَیْکُوْنُ ۝

عمر کر ہے کسی کام کو تو یہی فرما دیا تو کچھ کہہ جائیں وہ ہو جاتا ہے

خلاصہ تفسیر | اربعین بیہودی حضرت خیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ تھا اور نہ ہی حضرت  
حیی علیہ السلام، اور مشرکین و بندگان کو خدا کی بیٹیاں، چہا مختلف

آیات میں ان اقوال کی تشریح گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی نزاحت اور بھلائی بیان فرماتے ہیں،  
یہی بات یہی رنگ و مختلف معانی سے کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ اور درو کساں جو جان اللہ دیا ہے اس بات پر  
کہہ دیا کہ تو اوراد و مختلف حکم نہیں، ہو کہ وہ رحا سے خالی نہیں، یا تو اوراد و غیر میں ہوگی اور یا  
جس ہوگی، اگر غیر میں ہو تب تو نہیں دادہ دینا، جب وہ حق تعالیٰ سے پہلے پاک ہیں، عقل میں  
بیس سلسلہ ہیں، اور نقل میں عیساء، بخلا مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہمیں جو تو اس لئے باطل ہے کہ  
حق تعالیٰ کا کوئی ہم نہیں نہیں، یہ کہ جو صفات کمال اور نام ذات واجبہ سے ہیں، وہ اللہ کے ساتھ نہیں  
اور غضب و دشمنی میں مصروف ہیں اور اس کا نام بھی ملزوم کی نقلی کی دلیل ہے، اس لئے خیر اللہ ذات واجب  
نہ ہوگا، اور وہ جب تو میں حقیقت، بلازم حقیقت، ہو نہیں گی، غرض اللہ کے ساتھ محبت میں  
شریک نہ ہو، لہذا ہمیں یہ بھی باطل ہو گیا، اب صفات کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ شخص  
ہونے کی دلیل مذکور ہوئی ہیں، باطل ہے کہ خاص اللہ تعالیٰ کے ملوک ہیں جو کہ کسی آسمان اور  
زمین میں موجودات ہیں، اور وہ دستور کہ ملوک ہونے کے ساتھ اس کے حکم میں ہیں، لیکن  
ہاں میں کوئی تصرف قدرت سے ملتا، عطا و فوج کوئی نہیں، بلکہ اس کا حکم مشرک ہے کہ

کوئی ملک اور میرے پرکھن تعالیٰ موجود رہی، پس اساقول اور زمین کے اور دوسرے پرکھیلوں کی بھی خدمت میں منظم و منسوب ہے کہ جس قسم کی کام کا مشغلہ پیدا کی کرنا ہے، پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بس راتنی بات ہے کہ اس کو آنتا، فرما دیتے ہیں کہ جو بلا جس وہ اس طرح اس جو چاہے وہ ان کے آفات و اسباب اور صنائع اور مصلحتوں کی ضرورت میں پڑے اور یہ چاندی اور برنج اور برنجی تعالیٰ کے کسی میں نہیں پائے جاتے اور یہ مذہبیاتی اداکار کے بھی مسلمات سے تھا، انہیں دلیل سے معذور نہ تھا خاص بھی ثابت ہو کر بحث تمام ہو گئی۔

۱۔ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملاکہ کو معسر کرنا مثلاً لڑش اور زن وغیرہ اور اس طرح اسباب اور مواد اور قوی سے کام لینا یہ سب کسی شکست خداوندی پرستی پر ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب و قوت کو حاجت و وامان کو استعانت و مدد کے طلبگار ہوں۔

۲۔ بیضادق کے کہلے کہ پہلے مشرق میں اللہ تعالیٰ کو سب اقول ہونے کی وجہ سے باپ کہا کرتے تھے، باپوں نے ولادت کے سبب سے اس لئے یہ عقیدہ دیکھا ایسا کہ تفرقہ قرار دیا اور دین فساد کی صحت سے علیحدہ نظر کے استعمال کی! اہل اہانت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُعْلِمُهُ اللَّهُ وَآتَانَا آيَةً

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں آتا کہ ہم اسے اندر پائیں آیت اور اس کی آیت

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ كَشَابَهَتْ

اس طرح کہ چھ ہی وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے انہی کی کسی بات ایک ہے۔ ہیں ول

قَوْلُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۸﴾

ان کے لیے جس کے بے نیاز کر دی فتاویٰ ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر اور دیکھئے، باپوں دیکھو و نسائی اور شکر کنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابله میں ان کے کہنے پر کہ دعویٰ اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے لڑاؤ فرشتوں کے بغیر جسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتا دیں، یا خود رسول کی ہر سو ضرورت ہی نہ رہے، یا کہ ان کو انتہائی کبر پر عملی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں تو ہم ان کی ہی رسالت کے فاش ہو کر ان کی اطاعت کرتے نہیں، یا کہ کلام نہیں کرتے تو، یا کہ اس کو ان اور

کی دلیل و ثبوت و رسالت کی آجائے (دعویٰ تعالیٰ اور اس بات کا بلا نہ رسم ہونا چاہئے کہ اس طرح وہ باپوں، لوگ بھی کہتے آئے ہیں جو اس سے پہلے کو فرستے ہیں، ان ہی کا سوا اور بلا نہ قول و رسم معلوم ہو کر یہ قول کوئی اور وقت اور ایک بیانی پسینی نہیں ہو سکتی، یا کہ وہ بلا نہ ہے۔ انہیں اس قول کا مشلمان و سب بیان فرماتے ہیں کہ، ان سب داغیل پہلے چاہوں گے کہ ثابت دیکھیں میں، یا ہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اس لئے سب سے پہلے ایک ہی میں پیدا ہوئی، پھر ان اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چکر اس قول کا حبس و اول حاققت حاصل تھا کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پر ملا کہ اور انتہا کا بنانا چاہتے تھے، جو پہلے ہی بدی اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اس عقائد بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے پر جواب اور اشارہ ہونا کہ کہ تم کو ایک دلیل کہنے چاہتے ہو، کہنے کو ثابت کسی دلیل میں (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دیں اگر وہ ان لوگوں کے لئے دلائل و کفایت ہو سکتی ہیں، جو یقین (اور ایمان) حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چکر معشر میں کو معسر قرار دیکر یہ مقصود ہے اس لئے حق تعالیٰ کی نظر سے ان کو عقین میں منظور نہیں، سو ایسوں کی قتل و تشنیہ کا کوئی ذمہ دار ہے۔)

فائدہ: یہود و نصاریٰ کو قرآن کی کتاب ہے، ان میں اپنی علم ہی ہے، اس کے باوجود جو ان کو اللہ تعالیٰ نے باطنی اسرار اور اس لئے کہ باوجودیکہ قلل اور قوی دلائل و کفایت سے قائم کر لیتے تھے پھر بھی جو اٹھ کر تھے ہمارے تھے تو بات نہیں توادر کیا تھا، اور یہ چاہوں ہی کی بات کہ بلا تھی ہذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو باطنی اسرار دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ

بے شک ہم نے تجھ کو سچا بکر ہماری دیکر کو حق بشارت دینے والا اور نذرانہ اور مجھ سے کچھ نہیں دور نہ

التَّحِيَّاتِ ﴿۱۹﴾	ہم دینے والوں کی۔
--------------------	-------------------

تفسیر: اگرچہ رسول اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و جلال و علو کا تعین ہر کسی کے لئے خاصہ تفسیر آپ کو اس جہت اور شان کی بدولت و دل میں پیش آتی، اور ان کے ایمان و یقین کی کوئی ضرورت، مجموعی دماغ کے سبب تک ملول و آلودہ خاطر ہو جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کی قتل کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کو ایک چاروں دیکر خلق کی طرف، بھیجا ہے کہ دماغ والوں کو اوقاف خبری سنا کر رہتے اور دماغ والوں کو سزا دے۔









آزمائشوں کے درپے اپنے خلیفہ کی قربت کر کے اس کے درجہ و مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر اس جہ میں مغول حکومت اور قابل کو نہ فرکر کے یوں ارشاد ہوا **وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ** اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جہالت شان کو اور نایاب سترا پایا گیا۔  
دوسرا سوال کہ امتحان میں غمازی سے رہا گیا اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف سلسلہ کا لفظ آیا ہے۔ اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضرات معارف و تابعین کے مختلف اقوال ہیں۔ یہی نے اسکا ہم آہیہ میں سے وہی چیزیں شمار کیں۔ کسی نے یقین بتلا ہی ہیں۔ اور کسی نے اور جو کہ وہی دوسری چیزیں بتائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں۔ اور جیسے میں سب کی سب یہی حضرت خلیل اللہ کے مضامین امتحان تھے۔ البتہ تفسیر میں جریر اور ابن کثیر کی یہی رائے ہے۔

ارشاد خلیفہ کی نزدیک علی مرتضیٰ سے زیادہ اس میں مضامین امتحان ہیں کہ تفصیل آگے میان ہوگی مگر اس کے قابل قدر لفظوں پر کار کی غیبت تھی ہے امتحانات کی طرح ملنے مساکن اور ان کی تحقیقات ہیں۔ کچھ اختلاف قدروں اور عملی ثابت تھی کی جارج ہے۔ اس میں معلوم ہوگا کہ لفظ غزوہ و جلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علی مرتضیٰ خیالی نہیں۔ بلکہ علی اور اسکا بی بی تری ہے۔

اب ان مضامین امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:  
حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی غفلت کا خلعت خاص علما فخر مایا ملے۔ اس نے ان کو سخت امتحانات سے گزارا گیا۔ پوری قوم کی قرعہ کو اپنا نشانہ سب کے سب بستی پر مبنی میں مسکتا تھے سب کے مقامات دوسرے مختلف ایک دین حلیت ان کو حکما پایا۔ اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرقت دعوت لینے کا ہرگز آپ پر آگیا۔ آپ نے پیغمبر ہر جز و ہمت کے ساتھ یہ غوث و صلہ قوم کو خدا سے وعدہ لا طریک لہ کی طرقت بڑا۔ بہت بدستی کی شرمناک دم کی خرابی مختلف غمناات سے بیان کیں۔ علی طور پر چونکہ خلعت چاہا دیا۔ پوری قوم کی قوم کا مادہ جنگ و جدال ہو گئی۔ بارشاد وقت ضرور اس کی قوم نے آپ کو اس میں ڈال کر نہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ کہ خلیفہ نے اپنے مولا کی رضامندی کے لئے اس سب جوں پر راضی ہو کر اپنے آپ کو اس میں ڈال دینے کے لئے پہلی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو امتحان میں کامیاب پایا **وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ فِي تِلْكَ الْأَيَّامِ الَّتِي اتَّخَذْتَهُمْ نِسْبَةً** ہم نے حکم دیا کہ آگے قرابہ ایم پ

تکلیف آئندہ جس سے ۱۱۱: ۱۱۶  
ملٹری اور دوزخ سلاطین میں جاہ  
جس وقت جسکے خداوندی آئین ضرور کے متعلق آفریقہ کے انقلابات تھے۔ کس خاص آگ

کی آئین کے کچھ نہیں دی گیا تھا۔ اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس کچھ جلا دینا کے لئے یہی اپنی چکر مرگ ملٹری برقی۔ اور بار بار دیکھیں اس ضرور کا فریب کی کہ شہنشاہی چن چن قرآن میں لفظ شہنشاہ کے ساتھ لکھا تھا اس لئے فرمایا کہ کسی چیز کی شہنشاہ کا احتیال سے بڑھ جائے تو یہی برکت کی طرح حکمت ہے۔ بلکہ ملک ہو جائی ہے۔ اگر لفظ سلطان ارشاد ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برکت کی طرح ایسی شہنشاہی ہو جائی جو بجائے خود ایک غلاب بتائی ہے۔ چہل میں ایک غلاب زمرہ رکھی ہے۔

اس امتحان سے خلاص ہو کر دوسرا امتحان یہ لایا کہ اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر شام کی طرقت جہت کرنا میں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رعنا سے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو کہیں بڑا کر دیا۔ اور دین الہی و عیالی جہت کر کے شام میں چلے آئے۔

آگے کہ قرآن شریف جنت جاں راج کند  
شہر زور و جلال و خفاں راج کند

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملک شام میں قیام کرنا یہی تھا کہ جسکے مولا کی بی بی ہر وہی شہنشاہی اور ان کے شیر خوار بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کر سنا یا کثیرا ہر تین امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر پہلے راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آئی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا لیا جائے۔ جہیز لے کر یہاں کا حکم نہیں۔ منزل آگے ہو جب وہ خشک پہاڑ اور گرم و گھسان آجائے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر و تعمیر مکہ کی بنی بنانا مقدر تھا۔ اس جہستان میں آپ کو اندھا پا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ نے اپنے پروردگار کی محبت میں سرور و دین کی شہنشاہی ان کو دے آپ دیا۔ جاہل میں بی بی کو سنے کر حکم جاتے ہیں۔ لیکن یہ امتحان اس پر ختم نہیں ہو جا۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملے کہ کہی بی بی اور بچے کو کہیں چھوڑ دیں۔ اور وہ ملک شام کو واپس ہو جائیں۔ البتہ کہ خلیفہ حکم آگے ہی اس کی تعمیل میں آگے کھڑا ہوتا ہے۔ اور شام کی طرقت روانہ ہو جائے۔ تعمیل حکم میں اتنی تاخیر کہیں گوارا نہیں کی جوی کہ یہ اطلاع ہی دینے کے کچھ ہو چکے خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جا رہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پکارتی ہیں۔ مگر آپ جواب نہیں دیتے۔ پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس قدر دین میدانی میں نہیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو اس کا بھی جواب نہیں دیتے۔ دھڑ دھڑاتی ہیں خلیل اللہ کی بی بی نہیں سمجھتیں کہ ماریا کیلے۔ اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کارن حکم ملا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی جب کچھ خداوندی کا حکم ہو گیا تو بے شک امتحان کے ساتھ فرمایا کہ جاتے ہیں

انک سے آپ کو ملے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہیں یہی منافق جنہیں کرے گا۔

اب حضرت باجرا اپنے شیرازہ پیچھے سے اس قدر اس وقت جنگ میں وقت گذارے گئے ہیں کہ پناہ کی شدت ہائی کی تلاش پھیل کر گئی ہے، کچھ کچھ میدان میں چھوڑ کر صفاء مردوں کی پناہ پناہ پر بار بار چہنی اترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آئیں یا کوئی انسان نظر آجائے جس سے کچھ ملوث حاصل کریں، سات مرتبہ کی دوڑ و دوپ کے بعد مایوس ہو کر کھپے کے پاس ٹوٹ آتی ہیں، صفاء مردہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگاہ کے طور پر قیامتگاہ آنے والی نسلوں کے لئے احکام حج میں ضروری دستور اور ایما ہے، حضرت باجرا علیہ السلام اپنی دوڑ و دوپ ختم کرنے اور اپنا جان بولنے کے بعد جب پہنچے کے پاس آتی ہیں تو رحمت خداوندی بڑی ہوتی ہے، جبرئیل انہیں آتے ہیں اور اس شگ، رگستان کی زمین سے پانی کا ایک تڑپہ نکال دیتے ہیں، اس کا نام آج نقرم ہے، پانی کو کچھ اڈل، باغیچہ بن جاتے ہیں، پھر باغیچہ بن کر دیکھ کر انسان پہنچے ہیں، اور منک کی آبادی کا ساں سوجا کچھ ضروری بات فرمائی کہ کھانا پینا بڑھ جائے ہیں۔

تو مروجہ جن کو آج حضرت خلیل علیہ السلام کہا جائے نشوونما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اشادات ربانی کا گاہ، قریش لاتے ہیں اور اپنا پناہ چھو کچھ جاتے ہیں، اس وقت چھرا شہر تعالیٰ اپنے خلیل کا تیسرا نشان لیتے ہیں، یہ جو ساسیسی دور ہے سر سامانی میں پر داں چڑھا، اور دکھا ہوا سبب، آپ کی تربیت اور شفقت سے بھی بخیر رہا، اب والدہ ماجدہ بظہر رحمہا کو اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ڈھک کر دواشا دستور آئی ہے،

لَمَّا نَبَتْ خَشْيَةَ اللَّهِ فِيهَا رَبُّهَا  
يَبْنِي أَيْ فِي أَرْضِي فِي السَّامِ آتِي  
أَوْ مَخْلُفًا قَائِلًا مَّاذَا أَمْرِي  
ثُمَّ لَمَّا بَنَى اللَّهُ الْهَيْكَلَ شَافُوهُ خُذُوا  
تَعْلِيمًا فِي الْوَسْطَةِ اللَّهُ يَمِينُ  
الْعَلَمُ وَثِي ۝ (۲۴، ۲۵)

جب بچہ پناہ ہو گا کہ کچھ سے  
کام کاج چھوڑ دے کے ابراہیم علیہ السلام  
اس سے کہہ دے بیٹے میں غلاب یہی  
دیکھا ہوں کہ تم کو نہ کر رہا ہوں  
تو تیار تیار کیا خیال، قریش سب سے  
کہہ رہا ہیں کہ جو حکم خدا پر اس کی تائید  
آپ بچہ کو خلیل بنانا ادا شہرت تھا ہی گم

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادہ سے کوڑھ کرنے کے لئے بیٹے کے جنگ میں گئے، اور اپنی طرف سے حکم میں بل و علاشا دیکھی مری تحصیل کر دی، مگر وہ ان مقصود پہلے کوڑھ کرنا نہیں بلکہ شہین باب کا تائید کرنا تھا، واقعہ خواب کے الفاظ میں ظہر کیا جاتے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ کوڑھ کرنا، بلکہ کوڑھ کا کل کرتے دیکھا،

جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گرد کھایا اور اس عمل کو بڑھانے کا نام و مکمل سے میں بھی شہید ہیں، مصلحت بڑھانے کے حکم میں کچھ دینا منظور تھا، اسی وجہ سے اور شاہد یہ جو کہ حقیقت اللہ تعالیٰ کا خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو بڑھانے کا کرنا، آپ میں وہ پڑے اترے، واللہ تعالیٰ نے نبوت سے اس کا تدبیر ناکمل فرما کر اس کی قربانی کا حکم دیا، باجرا یہ سب ابراہیم کے والی دیا کے لئے دینی ملت میں تھی۔

یہ کہانے اور وقت اتفاقات تھے جن میں حضرت خلیل علیہ السلام کو گذر گیا، ان کے ساتھ ہی دوسرے بہت سے اعمال اور احکام کی پابندی آپ پر ماہ کی گئیں، ان میں سے وہ خصائص فطرت کے نام سے موسوم ہیں جن کا تعلق بدن کی صفاتی امور یا کچھ ہے، اور یہ خصائص فطرت کے نام سے تمام باتوں کے لئے بھی مستقل احکام ہیں گئے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان تمام امور کے لئے تاکیدیں احکام دیئے۔

اور اب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ پورا اسلام کچھ حصول میں اور نہ ہے، جس میں سے دین سورہ برأت میں مذکور ہیں اور دین سورہ احزاب میں اور دین سورہ مؤمنون میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حین اور کیا، اور ان سب اتفاقات میں پورے اترے، اور کاغذیاب رہے۔

سورہ برأت میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے صلا کی دین خصوص ملامت و صفات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

أَتَا يَوْمَ الظَّهْرِ ذَاتِ  
الْظُّلُمَاتِ ذَاتِ الشَّاقِوَاتِ  
الْمُتَّقِينَ ذَاتِ الشَّجْوَاتِ  
الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ  
وَأَتَا يَوْمَ الظَّهْرِ ذَاتِ  
الْظُّلُمَاتِ ذَاتِ الشَّاقِوَاتِ  
وَأَتَا يَوْمَ الظَّهْرِ ذَاتِ  
الْظُّلُمَاتِ ذَاتِ الشَّاقِوَاتِ  
ذَاتِ الشَّاقِوَاتِ ۝ (۲۴، ۲۵)

وہ ایسے ہیں جو برکتوں کے لئے  
مومنین کے لئے روزہ رکھنے والے اور کچھ  
کریں گے، ایک باتوں کی تعلیم کریں گے  
اور جری باتوں سے روکنے والے اور اللہ  
کی حمد و کاغذی رکھنے والے، اور ایسے  
مومنین کو آپ خوش نصیبی  
مستند دیکھئے ۵

اور سورہ مؤمنون کی دس صفات یہ ہیں:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ  
فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ  
مُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ  
مُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝

مومنین مسلمانوں نے فلاح پائی جو ان کا  
برکات و شرف و حضور کرنے والے ہیں، اور جو











اور انھیں کی ملاقات کے لئے مکرر مدعو ہوئے تو کیا کہ انھیں طیارہ اسلام ایک دوریت کے نیچے بیٹے ہوئے تھیں۔ یہاں پہنچے والد اہد کو کچھ کرکھڑے ہوئے۔ ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم طیارہ اسلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک سلام کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک اس میں میری مدد کرے؟ افسوس فرزند نے عرض کیا کہ بس۔ چاہے کر دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم طیارہ اسلام نے اس ٹیکہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں بیت اللہ تھا کہ جسے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے۔ بیت اللہ کے مدد و دار جو حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتلا کر دیئے تھے۔ دونوں بزرگوار اس کام میں آگے ہوئے۔ بیت اللہ کی قدیم ہستیاں ہیں جن میں انہیں چھ دونوں نے تعمیر فرما کر دی، اگل بیت میں اس کا بیان ہے۔ وہ لڑائیوں میں لڑتے تھے۔ الخ اولیٰ بیت الکعبین۔ الخ ثانی بیت اللہ۔ الخ بیت اللہ۔ الخ اولیٰ بیت اللہ۔ الخ اصل میں حضرت عبد اللہ طیارہ اسلام اور انھیں طیارہ اسلام دو گنا کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ابن تمام آیات پر غور کرنے سے دو حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو بعض دایاں مدہا اور ناچنے میں غور کر کے بیت اللہ پہلے سے دنیا میں موجود تھا۔ یہ کہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلا دینے کا ذکر نہیں اس کو ایک صاف دیکھنے کا ذکر ہے۔ یہ کہیں مذکور نہیں کہ کج کوئی نیا تعمیر کرنا ہے اس کی تعمیر کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا۔ ہر خلاف فرمایا جسے وقت ہندم ہو گیا یا اٹھایا گیا تھا، صرف بنیادیں موجود تھیں، حضرت ابراہیم اور انھیں طیارہ اسلام کہ جس کے پہلے بنائی تھیں، بلکہ بنائے بنائی کی بنیادوں پر جدید تعمیرات کے داخل ہوئی ہے۔

ابہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کرنے والے اور کسی وقت کی اس میں کوئی صحیح اور کوئی رعایت مدہا کی مشغول نہیں، اب تک اب رعایت میں تھے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے اس کی تعمیر کو طیارہ اسلام کے اس دنیا میں آئے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر کو طیارہ اسلام نے اس کی تعمیر فرمائی، یہ تعمیر طیارہ اسلام نے جب آبادی ملو طو لہ نور میں ہندم ہوجانے کے بعد سے ابراہیم طیارہ اسلام کے زمانہ تک یا ایک ٹیکہ کی صورت میں یا فانی، حضرت ابراہیم و انھیں طیارہ اسلام نے اس پر تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس تعمیر میں شریعت و وحی تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر ہندم نہیں ہوئی، اور حضرت علی طیارہ اسلام کی جنگ قبل قرین مکہ نے اس کو ہندم کر کے اس پر تعمیر کیا جس کی تعمیر میں حضرت علی طیارہ اسلام نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

### احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

۱۔ لفظ نکاح سے معلوم ہوا کہ اگر خاتمی نے بیت اللہ کی خاص غفلت پیش ہو کر وہ ہمیشہ

مروج مسلمان بنانے کا اور اگر وہ اس کی طرف جاتے اور وہ نے کے کرنا و مندو ہیں گئے، انھیں سر حضرت کاٹنے فرما دیا، یعنی اس میں صاف طیارہ اور طیارہ ابن کوئی آدمی اس کی زیارت سے بھی سر نہیں ہو گا۔ گھر پر ہی بیٹے سے زور دیا، زیارت، اطوار کا شوق لیکر فرماتا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبلہ کی کی طاعت میں سے کہ وہ اس سے ٹوٹنے کے بعد پھر وہاں جاتے کا شوق دل میں پاتے ہیں، ہر طور پر اس کا مناد و کما ہوتا ہے کہ پہلے عرب جتنا شوق زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے، دوسری طرف کے لئے اس شوق میں اضافہ ہوا ہے، اور وہاں جوں بار، اور زیارت کرنا ہوتا ہے یہ سن کر اور بڑھتا ہوتا ہے۔

یہ مجوز بیت اللہ کی کی خصوصیت ہو سکتی ہے، اور دنیا کے ہر سے ہر زمانہ کو اس کی ایک دور و دراز دیکھ لینے کے بعد میرے ہوتا ہے، اور باوجود سات مرتبہ دیکھنے کے بعد قور دیکھے کا وہاں میں نہیں آتا، اور یہاں تو کوئی خوش منظر سبزی دہان یا پھنچا گیا کہ آسان ہے، اندھاؤں دنیا کے کار و بار کی کوئی اوجست نہ اس کے باوجود وہ لوگوں کے دل میں اس کی تپ بہت مشہور ہو کر رہتی ہے۔ ہر اور کو دیکھ کر کے سیکڑوں مفتیں چیل کر وہاں پہنچنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

۲۔ لفظ انشاء میں مگر تا میں جاتے اس کے معنی میں ہوا، اور لفظ قبضہ سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خاد کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مملو ہے، فرقان کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ اول کر پورا حرم قرار دینے کے اور یہی شرط ہو سکتی ہے اور شاید ہے، الخ انشاء اللہ تعالیٰ ۱۹۵۰ اس میں لفظ بول کر پورا حرم قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں دوسرے فرشتے بھی آئے ہیں اور بیت کعبہ کے گناہ تو مشرقی نہیں ہوتی، اور وہاں مشرقی گناہ ہوتے ہیں، اس لئے معنی بیت کے یہ ہو کر کہ ہم نے حرم مملو کیا ہے اس لئے بنایا ہے، اور جاتے اس بنا دینے سے مراد وہ لوگوں کو یہ حکم دینا کہ حرم محرم کو کام میں رہنا اور انشاء اللہ تعالیٰ سے ملنا ہو کر رہیں، (ابن کثیر)

چنانچہ زائد مالیت میں بھی عرواں کے خاتم میں سب ابراہیم کے ہو کر آئندہ ان کے گناہ تھے ان میں یہ بھی جو حرم میں ہیں، اب اور یہاں کا شوق بھی کسی کو نہ لانا، انشاء اللہ تعالیٰ میں لیتے تھے، اور ہر گناہ قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، شریعت اسلام میں بھی یہ حکم اس طرح دیا گیا، نتیجہ کے کہ وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اذن حرم میں آنا، حال گناہ کا بھی تھا، جس وقت بھی حرم میں وقت بھی حرم میں آنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبہ میں اس کا اعلان فرمادیا (صحیح بخاری)

ابہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی نروسے مانع ہو، اگر حرم اس کو اس میں نہیں دے گا، بلکہ اس پر اجماع است





ساز سے مقدم ہے رکاردی ہیں جس اس آئرسے پر اطراف عالم سے جانے والے جانتے کے لئے طرا  
بانیت نماز کے افضل ہے جو جسے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منسوس ہو  
بفضل رحمتا

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ  
وَرَجَب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو جس میں امن کا اور روزی دے اس کے لئے  
وَمِنَ الشَّجَرَاتِ مِنْ أَمْنٍ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ

دروں کو جو جسے جو کہی ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن فرمایا اور  
شجرہ قائمیتہ قلیلاً ثُمَّ أَضْطَرُّوا إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ

کار یہ اس کو جس نے ایمان نہ لایا اور وہ دن بھلا کر جہنم کا دروازہ کے عذاب میں اور  
التَّعْصِيَا ۚ وَلَا يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بڑی جگہ ہے یہ کہ اور یاد رکھنا کہ اچھا ہے ابراہیم بنیادی خانہ کعبہ کی اور  
اسْمِئِيلَ ۚ رَبَّنَا فَقَبِلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ الرَّحِيمُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا

وَسْمِعْنَا ۚ عَاذِرُكَ ۚ عِزُّكَ ۚ وَرَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الرَّحِيمُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا  
وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۚ

بنا کر اور کر کہ جس کو ہم پر وادارنا اور ہماری اور میں ہیں کہ ایک جماعت فرما اور ہر ایک  
وَأَرْزُقْنَا ۚ إِنَّا نَبْتَغِيكَ يَا رَبُّ ۚ وَأَنْتَ أَتَقَرُّبُ إِلَيْنَا ۚ وَاللَّهُ

اور کہ ہم کو تازہ کر کہ کہ اور ہم کو سوا کر جیسا کہ قری بوقہ قبول کر ہوا ہر امن  
خلاصہ تفسیر

اور اوروں سے امن لکھنے کے قابل ہے جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے  
فرمایا میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ اسے میرے لئے دو گنا اس کو ملے کہ ایک دعا اور  
شہر بنا دے اور میں بھی کہ اس راہن والا اور اس کے لئے دو گنا اس کو ملے کہ ایک دعا اور  
عاقبت کیے راہ میں سب اپنے راہوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص ان کو کہتے ہیں جو ان میں امن لائے

چراور دور قیامت پر ایمان لکھنے سن رہا تھی کہ آپ جانیں اچھا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو کہ  
دوئی بنا خاص نہیں ہے اس لئے عزت سب کو دوں گا میں کو بھی اور اس شخص کو بھی جو  
کافر ہے اور نہ جنت آخرت کے کہ لی ایمان کے ساتھ خاص ہی سوا اس واسطے اپنے شخص کو  
دوئی کا کافر ہی انھوں نے روز زمین و دنیا میں تو خوب آرام پر ناول گا لیں پھر ابد مرگ اسکا  
کشتاں کشتاں عذاب ووزن میں بہتیاورن گا اور اسی کشتی کی جگہ تو بہت بڑی ہے اللہ بھالے ہے اور  
دو وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہر ایک انھار ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس شخص کو بھی اور ان کے  
ساتھ اسٹیل علیہ السلام میں راہ میں کہنے جاتے تھے کہ اے بھالہ پر اور گوارہ عزت اے ہم  
قبول فرما کیے بلاشبہ آپ قبول کئے رائے جاتے رائے میں ہماری دعا کہ کشتی میں بارہیوں  
کو ملے ہیں اے بھالہ پر اور گوارہ اور ہم دوئی سے مل دے گا کہ ہم کو اپنا اور یاد  
ملے گا یا پھر اور ہماری اور یاد میں سے ہم ایک ایسی جماعت پیدا کیجے جو آپ کی ملیں اور اور وہیں  
ہم کو رہائے گا اور جو کہ ہم ایک ایسی جماعت پیدا کیجے جو آپ کی ملیں اور اور وہیں  
لی العقیقت کہ یہی ہیں توجہ سننا رائے رائے ہر دلی کرتے تھے

## معارف مسائل

حضرت فہیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں فتر انبا دیں ، حال وصال  
اہل و عیال اور خوار اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعویذ احکام ربانی میں مسامت  
کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائب و درگاہ میں ہے۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و رحمت ایک طبع اور غریب اور جوئے کے ساتھ  
محکم دانی میں ہے ، مذکورہ تصدیقات اس کا منظر ہیں ، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دنیا دنیا  
کی تمام حق و راحت کے لئے وہ مائیں اٹھیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں دعا کہ شروع لفظ سب سے کہا ہے جس کے معنی ہیں اے میرے  
پائے والے ۱۰ اہل الطاف میں دعا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے کہ غریب الطاف حق تعالیٰ کی رحمت اور  
لطفت و کرم کو مستوجب کر لے پر مؤثر دانی میں پھر سب سے پہلی دعا یہ سنرائی کہ اس پھیل میدان  
کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لایا ہے آپ ایک شہر جاریں  
تاکہ یہاں کی سکونت میں ان کو وحشت و ہوا و مرزوات زندگی کا ساقی ملے اور آجائیں اور بھی ما  
سوزہ ہوا میں میں خنن اللہ کی آیتا کے الطاف سے آتی ہے ، جس میں اللہ کی لطف نام کے ساتھ ذکر  
کیا ہے ، جو عربی راہی کی اصطلاح میں مرقہ کہتا ہے ، فرق کی وجہ غالب ہے کہ پہلی دعا جو کائنات



ساز سے مقدم ہے رکاردی ہیں جس اس آئینہ پر کا مرآت عالم سے جانے والے حاکم کے لئے طرا  
بانیت نماز کے افضل ہے جو حق سے کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منسوس ہو  
بائنقل رجساس

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ  
الْحَرْثَ مِن ثَمَرِهِ مِن أَمْنٍ مِّنْكَ يَا اللَّهُ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ  
دَارَىٰ بِكَ جُورِي أَن يَسَّ مِنْ أَمَانٍ لَّيْلَةِ الْبَرِّ أَوْ قِيَامَتِ كَيْدِهِ فَرَمَا أَوْرَ

سَعْفَةً قَامِيَةً فَلَمَّا تَمَّ أَصْطَرَّ كَرَاهِي عَذَابِ النَّارِ وَ يَسَّ  
كَرِهَ اس كوشی علی سجاد کا منقول ہے دون پھر اس کو خطر ڈرنا اور دوزخ کے عذاب میں اور

التَّصْيِيرُ ۝ وَلَا يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ  
بُزْ جگہ سے بڑھ کر اور یاد کر جب اٹھائے تھے ابراہیم بنیادی بنیاد میں غاصب کی اور

أَسْمِعِلْ ۝ رَبَّنَا اقْبَلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ التَّيِّمُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا  
وَسْمِعِلْ ۝ عا کر تھے اور وہ دعا پڑھتا تھا کہ ہم سے بیک طرفی ہو سنے والا سامنے والا ہی پڑھتا

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ  
جائز اور کر کہ جو حکم ہو وادارنا اور ہماری اور جو میں ہیں کہ ایک جماعت فرما تو بار الہی

وَأَرْأِنَا سَبِيلَكَ رَبِّ عَلَيْنَا ۝ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَنِيُّ الرَّحِيمُ ۝  
اور دکھا کہ تاج کر کہ اس کے اور ہم کو سوا کر جیسا کہ قری ہو کہ قبول کر تیرا ہمارا۔

اور ان وقت میں انکار نے کے قابل ہے جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے  
خلاصہ تفسیر اور ان میں اس کی کیا کہ اسے میرے پروردگار اس کو خلق کر ایک دعا اور

شہر بنا دیکر اور وہ شہر کیسا اس راہان والا اور اس کے لئے دو گاروں کو پہلوں کی قسم ہے کہ  
حاکمیت کیے راہ میں سب لئے دونوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص ان کو کہتے ہیں جو ان میں انسان

چراہ دور قیامت پر ایمان لکھتے سن رہا تھی کو آپ جانیں اسی اعلیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو کر  
دونی بنا خاص نہیں ہے اس لئے عزت سب کو دل کا مومن کو بھی اور اس شخص کو بھی جو  
کافر ہے اور نہ جنت آخرت جہ کہ لی ایمان کے ساتھ خاص ہی سزا داس واسطیٰ اپنے شخص پر  
دیکر کا کافر ہی اخصو سے روز زمین و دنیا میں تو خوب آرام پر ناؤں گا دیکھ پھر ابد مرگ اسکا  
کشاکش عذاب و دوزخ میں بہتیاورں گا اور اسی کی جگہ تو بہت بڑی ہے دائرہ چارے اور  
دو وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہر ایک افسار ہے کھراہیم علیہ السلام اور اس غاصب کی اور ان کے  
ساتھ اسٹیل علیہ السلام بھی راہ میں کہنے جاتے تھے کہ اسے ہاتھ پر اور دگر دہر غصہ اسے ہم  
قرن فرما کرے بلاشبہ آپ ٹوبہ کئے رائے جاتے رائے میں ہماری دعا کرتے ہیں ہمارے چوں  
کو پہلے ہیں اسے بلوے پر دگر اور دہر و دوزخ میں دعا کرتے ہیں کہ ہم کو اپنا اور دیکر  
مصلح بنا کر اور ہماری اور ان سے ہم ایک ایسی جماعت پیدا کرے کہ ہم کو اپنا اور دہر و دوسروں  
ہم کو ہمارے جہ و جہاد کے احکام بھی بتا دیکر اور اسے حال پر دہر رائے کے ساتھ توجہ رکھتے اور  
لی العیقتہ کہ یہی ہیں توجہ سترائے واسطے ہر دانی کرتے ہاتھ

## معارف مسائل

حضرت فہیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں فتر انبا دیں ، حال و حال  
اہل و عیال اور خوار اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعویذ احکام ربانی میں مسامت  
کے چر کارائے پیش کئے وہ مجاہد و دگر میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و محبت ایک علی اور غرضی امر جو نے کے ساتھ  
حکم دانی ہیں ہے ، مذکورہ تصدیقات اس کامل ہیں ، اخصو اپنے اہل و عیال کیلئے دیکر دنیا  
کی تمامش و راحت کے لئے دماغیں اٹلی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں دعا کہ شروع لفظ سب سے کہا ہے جس کے معنی ہیں اسے میرے  
پائے والے ۱۰ اہل الطاف میں دعا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے کہ غرض اہل الطاف حق تعالیٰ کی رحمت اور  
لطفت و کرم کو مستوجب کر لے پر نور و امان میں پھر سب پہلی دعا یہ سنرائی کہ اس پہل میدان  
کو میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لاؤا ہے آپ ایک شہر جاریں  
تاکہ یہاں کی سکونت میں ان کو وحشت و ہوا و مرز و بات نہ لگے کہ اس میں آجائیں اور بھی غا  
سوزہ ہوا میں میں خنن لاشکی آپا کے الطاف سے آتی ہے ، جس میں اہل الطاف کو لغت نامہ کے ساتھ ذکر  
کیا ہے ، جو عربی راہی کی اصطلاح میں مرقہ کہتا ہے ، فرق کی وجہ غالب ہے کہ پہلی دعا جو کائنات







## خلاصہ تفسیر

اسے ہمارے پروردگار اور رب بھی دعا ہے کہ اس جماعت کے اندر جو کسی کے پیادہ ہونے کی دعا میں اللہ میں سے کرے ہے جس میں اللہ کی ایک ایک چیز بھی قرآن مجید پر ہر ایک کو آپ کی اہمیت پڑے کہ اس کا پس اور اسی کو آسانی، کتاب کے معانی، کی اور اس میں، خوش بھی کہ اس طبقہ حاصل کرنے کی ایک تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلمذ کے ذریعہ چانت کے خیالات اور اعمال سے پاک کریں) دیکھنا آپ میں غالب انقدرت کا اظہار

## تشریح لغات

يُنْكِرُ اَنْ يَّعْلَمَهُ اَنْ يَّجْعَلَ، مصدر تلاوت سے مشتق ہے، تلاوت کے اصل معنی اتارنا اور پھرنے کے ہیں، اصطلاح میں تلاوت و حدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسانی سے استعمال اور کلام الہی کے پڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑنے والے کو اس کا پورا ادنیٰ کلام پڑنا لازم ہے جس طرح اشعاع کی طرف سے نازل ہوا طبع اس طرح پڑنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کسی روشنی یا تہذیب کی اجازت نہیں، اہم یا خفیہ، چنانچہ شعرات القرآن میں فرمایا ہے کہ کلام الہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑنے کو تو تلاوت نہیں کہا جاسکتا۔

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ اِلَهَهُمْ وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ اِلَهَهُمْ، اور اللہ کی تلاوت جو ان سنت میں کسی سینے کے لئے آئے ہیں، حق بات پر ہر چیز، حد و انصاف، قدم و رفوہ و قیام میں، نام و غیب اصناف، یعنی ہیں کہ یہ تعظیم اللہ تعالیٰ کے لئے لے لیا جاتا ہے، قرآن کے معنی تمام شے کی ہر معرفت اللہ کو گراں یاد کے پڑنے ہیں، اور جب اللہ کے لئے پڑا جاتا ہے تو جو ذات کی صحیح معرفت اور ایک اعمال کے لئے جاتا ہے، تشریح اللہ تعالیٰ میں اس کا ترجمہ جہر کی چیز، اسی معلوم کرنا کہ ہے، اور لفظ محنت جو ان زبان میں کسی معنی کے لئے لے لیا جاتا ہے، وہم و تحم و ایک عمل حد و انصاف، قول صادق و رفوہ، (تلاوت و غیب)

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ محنت سے کیا مراد ہے، مفسرین میں یہ بات بالعبین جو معانی مشرکان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ غلطی کے معنی بیان کرتے ہیں اگرچہ ان کے الفاظ مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انام تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت خداوند سے یہی تفسیر نکلیں گی کہ کسی نے تفسیر قرآن اور کسی نے تفسیر فی الدین، فرمایا کہ یہ کلام اللہ ہے، لہذا یہ کتاب اللہ ہے، انام تفسیر کا مسموع جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو چکے ہیں، انام ہے کہ ان سب کا اصل وہی

حدیث سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

لفظ یزید پیغمبر، ذکر آیت سے مشتق ہے، جس کے معنی میں جہارت اور پاک، اور یہ لفظ تلاوت اور باطنی طور پر کی پاک کے لئے لے لیا جاتا ہے۔

## معارف مسائل

تشریح مذکورے آیت کا مفہوم واضح ہو گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ دل کی علاج دنیا و آخرت کے واسطے خلیہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ میری اور آدمی ایک رسول بھیج دیجئے جو ان کو ان کی بات تلاوت کر کے سنا سے اور قرآن و سنت کی تعلیم دے، اور ان کو ظاہری و باطنی گفتگو میں سے پاک کرے، اس میں حضرت خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابی اور آدمی ہونے کی اس نذر دے، فرمائی کہ اگر تو یہ اپنی دعا کو اس کے لئے سعادت و شرف ہے، اور دشواری و کون کے لئے ایک عذاب ہے، میں سے کہ یہ رسول جب اپنی قوم اور اورادی کے اندر بھیجتا تو اس کے چال و چلیں میرت صاف سے یہ لوگ بھرتی واقع ہوتے، کہیں وہ کوئی فریب میں بسکتا نہ ہوتے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دعا کا جواب سن کر تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دعا قبول کر لی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (امیں جریہ و باہن کثیرا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند میں ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مراد اللہ بعثت، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند میں اس وقت تھا کہ ایک عالم اسلام بیان میں تھے جو کچھ لکھا تھا، غیبی تھا اور اس کا خدا اور اس کی طرف سے اس کا پناہ، بتلاتا ہوا کہ میں اپنے آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا منظر بیان، یعنی علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے، مبینہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت سے ملک شام کے حالات، لکھا دکھائے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ کرتے ہوئے درجہ سورہ آل عمران آیت ۱۶۱ اور سورہ قصص آیت ۲۸ میں بھی اسی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جسی رسول کے بھیجے کہ وہاں فرمائی معنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہو چکے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

یعنی رسول بھیجے معاصر سورہ فرقہ کی اس آیت میں اور سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ کی آیات میں آنحضرت





قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی افکار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نورانی  
فشار آن کا اصلی مقصد یہ رہا ہو کہ قرآن کو معارف و فہم پر مبنی طرح صرف مجاہد پسوں کے لئے نہ تھا بلکہ  
کلیہ مسلمانوں کے لئے تھا، اور بقول اقبال مرحوم سورۃ لقمان کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے  
چرچے سے مرنے والے کی جان ہولناک سے بچ جائے گی۔

خلاصہ حکام پر جو اس آیت میں فراموشی و سہولت بیان کرتے ہوئے حکومت آیات کو  
مستقبل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر رہی ہیں کہ قرآن کریم کے الفاظ کی عظمت اور  
ان کی حفاظت اور ان کو خشک اسباب و وسیع میں نہ چھوڑنا بلکہ ہرگز نہ ہونے ہیں، ایک مستقبل  
فرض ہوا، اس طرح حکومت آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو مدعا گاہ فرض قرار دینے  
کے ایک اور مبراہ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن ہی کے لئے صرف قرآن کا زبان کا بیان لینا کافی نہیں بلکہ  
تعلیم و سولہ کی ضرورت ہے جسے کو تمام علوم و فنون میں وہ بات معلوم و مشاہدہ کر لیں کہ  
اس کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کی زبان جانتا ہو اور زبان کا ہر جزو نامی کافی  
ہو جسے جس تک اس میں کوئی ماہر مستند اسے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آجکل ڈاکٹری،  
جو میڈیچننگ اور ایلیمنٹنگ کی کتابیں ہوتی ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ  
محض انگریزی زبان میں مہارت، پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی  
شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انگریزنگ کی کتاب میں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے  
فلوئز فرانسیسی پڑھیں، محولی و دومز کے کلاس تک مطالعہ کیا، اس سے کچھ ہونے حاصل نہیں  
ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر مینیکلر اور کتابیں بھی ہوتی ہیں، تو خود ہر کام سمجھانے کے  
طریقے بتاتے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر مذکور کی روزی بٹاتے نہ باور دی یا خود انگریز  
زبان جان لینا ہی نہیں کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کوئی پڑھا تو دنیا کے سب فنون  
اس شخص کو حاصل ہو جائے چنانچہ کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص ضرور کہتا ہے کہ سولہ فلوئز  
اور ان کے سمجھنے کے لئے جب بعض ادا والی کتابیں نہیں، تعلیم استاد کی ضرورت ہے تو معانی میں  
فشار کی جڑوں پر ایسے سے کہ تعلیمات لفظ تک تمام گہرے و قہن علوم پیش کر دے، من غسرہ  
زبان جانی لینے سے کچھ حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر کوئی پڑھا تو بعض ادا والی زبان سمجھنے سے وہ معادین  
قرآن کا ہر حصہ جانتے تو آج بھی ہر اردو لکھنوی اور لکھنوی عرب مالک میں قرآن کی زبان کے لئے  
ماہر و مبہم ہو رہے ہیں، جسے سفیر شکرانے ملے جائے، اور وہ بد رسالت میں اور قبول یا قبولت قرآن  
کے ماہر سمجھ جائے۔

فرض ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرض میں حکومت آیات کو ایک

مستقبل فرض متعارف ہوا، دوسری طرف تعلیم کتاب کو مدعا گاہ فرض متعارف ہوا کہ بعض  
حکومت آیات کا بھی لینا بہت ساری کے لئے قرآن زبان جاننے والوں کے واسطے نامی کافی نہیں  
بلکہ تعلیم و سولہ کی ضرورت قرآن کی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیمات رسول  
ہوا کہ اسے خود سمجھنے کی فکر خود فرضی کے ساتھ نہیں، مگر معانی قرآن کو سمجھنے کے لئے ضرورت  
ہوئی تو رسول کو سمجھنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب بھی دوسری طرح بھی انسان اور تک  
پڑھائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علم حکیم نہیں ہے، وہ جانتے ہیں کہ معانی قرآن کی تعلیم و تعلیم  
کے لئے دنیا کے دوسرے علوم و فنون سے زیادہ تعلیم استاد کو ضرورت ہو اور یہاں پر نام  
استاد میں کافی نہیں، بلکہ ان معانی کا استاد صرف و شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے  
وہی شرف و عکاسی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی و رسول کہا جاتا ہے، اس لئے  
قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنا کا مقصد بہت زیادہ ہو کہ وہ قرآن کریم کے  
معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، اور اشارہ یہ ہے کہ انسانی نفس، تائید و تائید، انسانی  
کتاب کو اس لئے بھیج دے کہ آپ کے لئے اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطالب بیان فرمائیں  
تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے فراموشی میں دوسری چیز تعلیم بحث بھی دیکھیں، یہ اور میں لے اور  
جلا جاتا ہے کہ بحث کے قرآن زبان کے اعتبار سے اگر کوئی سن کر ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور  
اس کے ہم معنی دوسری آیات میں حدیث و تابعین نے بحث کی تفسیر مستند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے ہے جس سے واضح ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن میں معانی قرآن کا سمجھا اور  
بتلا فرض ہے، اسی طرح فیثرت تفسیر کے اصول و قواعد جن کا نام سنت قرآن کی تعلیم میں  
آپ کے فراموشی میں ہیں، اور اس کے آخضر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما کر انسانی فہم  
تعلیم میں تو عقلی فکر ہو گیا ہو، اور یہ ظاہر ہو کہ جب آپ کا مقصد جو علم ہو کہ، تو آپ کی  
امت کا مقصد جو علم اور مطالب علم کا لازم ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت، تعلیمات  
مطلوبہ ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گہری  
ادراک میں قرآن و سنت کی تعلیمات اور اس میں مہارت کے لئے بہت، و فرصت نہیں ہے تو کہہ  
بہتر ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر ہائے۔

پھر حضرت علیؓ اور حضرت علیؓ صلی اللہ علیہ وسلم کے فراموشی میں تذکرہ ہے جس کے معنی ہیں،  
ظاہری و باطنی خواہشات سے پاک کرنا، ظاہری خواہشات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی  
خواہشات کو خدا و حشر، طہارہ و احکام کی اور اخلاق و فساد، غیر خیر و صحت و فہم و دنیا و غیر  
پس اگر علم طہر و قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے، لیکن تذکرہ کو آپ کا









اور یوسف سے مثال تک ساری دنیا میں مگھلا، فصلی شریطہ و علی آلہ و اصحابہ اسی میں مکمل لکھیا  
سچیز اور بدوسن صلی و صام و قعد و قام۔

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمْنِ سِفْهُ نَفْسُهُ ذُلٌّ وَلَقَدْ

اور کہو یہ جو چہرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہ جس نے امن بنا کر آپ کو اور یہ کہ

أَصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَارْتَبْنَا فِي الْآخِرَةِ لَكِنَّ الصَّالِحِينَ

اس کے ہیں کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں ایسوں میں ہیں

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِزَيْدِ الْعَلَمِينَ ۝ وَوَعَىٰ

باد کو جب اس کو کہا اس کے دل کو کھینچا کہ تو جو کہہ دے گا یہاں تمام کام کہہ دے گا اور گواہی دے گا

بِمَا أَمَرْتَهُمْ بَيْنَهُ وَيَعْقُوبُ يَبْنِي إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ

اگر کیا اور ہم اپنے بچوں کو اور یوسف بھی کہے بچہ ایک اللہ چن کر دیا ہے تم کو

الَّذِينَ فَلَاكُم مِّنْهُ الْآدَاءُ وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

وہ جو سوچے ہو کہ دینا مسک مسلمان۔

سِفْهُ نَفْسُهُ۔ سفر میں جہل، و انتصاب نفس، علی انہ تعبیر علی قول القرآن

اور شدت بد فعل علی قول بعض المفسرین و افضل یہ ان کو سلفہ متعارف

نفسہ کہتے نفسہ و لکن نفسہ یعنی معنی مایعنی ایسی جہل و حقو قول الزیادہ، ترجمہ شریف

اسی پر مبنی و رابطہ سِفْهُ نَفْسُهُ کے معنی میں توجہ کے اعتبار سے وہ ہیں جو فلسفہ تفسیر میں لکھے گئے ہیں ذاتی کا یہ

اعتق اور اور دوسری توجہ پر مبنی یہ کہ جس کے کشتہ ابراہیم سے تو گروائی دہی کر گیا جو اپنے نفس سے بھی

جائیں جو باقی اس کو گروائی ذات کی بھی مگر جو کہہ کیا ہوں۔

اور مطلب ابراہیم سے تو دوسری رو گروائی کرنے کا ہوا ہیں ذات ہی سے امن ہوا

خلاصہ تفسیر اور دوسری نسبت کے تاکہ کو کیوں کہ حق دیکھا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی

کی بدلت ابراہیم سے ان راہز ابراہیم علیہ السلام کو عہدہ رسالت کے لئے دینا میں منتخب کیا اور

و اسی کی بدلت وہ آخرت میں بڑے لائق و گروں میں شمار کئے جائے ہیں جن کے لئے سب ہی

کہہ ہے اور یہ انتخاب عہدہ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا جب کائنات سے ان کے یہ درود گوار

کئے و لعل ابراہیم کے فرما کر حق تعالیٰ کی اطاعت جست یاد کرو، اظہار کے عرض کر گیا کہ

اطاعت اختیار کر دت ابراہیم کی دوسری اطاعت کے جستہ کر کے یہ کہ ان کو شرف  
نیزت دیا اور وہ اس وقت ہوا بعد چہرے، اور اس وقت موصوفہ پر قائم رہنے کا حکم  
کرنے لیا ابراہیم علیہ السلام نے یحییٰ کو اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام بھی ملے ہیں  
کہ جس کا مشورہ تھا کہ میرے بچہ و بڑے اللہ تعالیٰ نے اس دین واسلام و اطاعت حق کو کھانا  
کئے منتخب فرما دیا ہے، سو علم دوم مرگ تک اس کو مت چھوڑنا اور ابراہیم علیہ السلام کے اور کسی حالت  
پر جان مت ریتا۔

## معارف مسائل

ماہرہ آیات میں مذہب ابراہیم کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان اخوان  
کی فریاد کا بیان ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباع مذہب ابراہیم کے صلح و عہدوں کی تردید  
اور صرف اس اسلام کا مذہب ابراہیم کے مطابق ہونا اور یہ اسلام کی حقیقت اور یہ کہ  
وہ تمام ایمان کا مشرک دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں ایمان علیہ السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف

خاص توجہ اور اہتمام کو دیکھ کر ہے، پہلی آیت میں مذہب ابراہیم کی فضیلت اور اس کی وجہ سے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتا کر ان کی نسبت سے اخوان کو

اعتقاد کلام بتوایا ہے، ارشاد ہے، وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمْنِ سِفْهُ نَفْسُهُ

یعنی مذہب ابراہیم سے تو گروائی صرف دین غرضی کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو تو یہ مذہب

میں دین فطرت ہے، کوئی مسلم الفطر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان

فرمائی کہ اس مذہب کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اس مذہب شانہ نے اسی نسبت کی

وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی، اور آخرت میں بھی اُن کی

عزت و بزرگی کا مشاہدہ ہوا ساری دنیا نے کیا کہ ان کو فرمودہ یہ صاحب اقتدار ہوا اور اس کی

قوم اس کیلئے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی اور اپنے اقتدار کے سامنے عامل ان کے خلاف نہال

کرنے، آخر میں آگ کے لگ جڑے ابراہیم کی گروائی دلی و باطنی و ظاہری کے سامنے طوطا کی

طائیں جو قدرت والے کے تابع مسلمان ہیں اس نے سامنے خودی منصوبوں کو خاک میں

ملا دیا، آگ کی گواہی غلبہ کے لئے گھڑا رہتا ہوا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا ہلا مٹنے پر مجبور

ہو گئیں، دنیا کے سامنے مومن اور کافر میں لگ کر نسبت پرست ہیں اس بہت شک کی عزت

کرتے چلے آئے، مشرق میں وہب بہر حال اولاد ابراہیم تھے، جنت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

کے لئے

[illegible]

ابراہیم اور ملت ابراہیم علیہما السلام کے اس بڑی غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور عظمت الہانی کے عین مطابق ہونا جو دنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جو میں کبھی عقل و فہم نمی وہ اس ملت کے سامنے جھک گیا تھا۔

یہ تو اہم ترین علیہ السلام کے دنیاوی غرت و ہرج و مرج کا ذکر تھا۔ آخرت کا معاملہ بھی اس لئے نہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ میں عرض اللہ تعالیٰ نے بھی کر دیا میں غرت و فضیلت حلال فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجات عالیہ عشر درجی۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ملتے پر ایسی کے بنیادی اصول بتکائے گئے، ارشاد ہوا۔

اَلْوَكَالَةُ لِمَا تَرَكْتُمْ اَشْتَرُ مِنْ اَعْلَانِ اَشْتَقْتُ لِيَوْمِ الْعَلَمِيْنَ : میں جب فرمایا براہِ راست  
 اُس کے دُوب کے کراہات اختیار کرو تو انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اُطاعت اختیار کی  
 اور اَلْعَالَمِيْنَ کی اِس طرزِ بیان میں بہت سے قابلِ غفر نے کراہتِ عملِ شاذ کے خطابِ اَشْتَرِ  
 کا جواب دینا بہتر خطاب ہی کے انداز میں چھوڑنا چاہیے کہ اَشْتَقْتُ لِقَوْمٍ : میں نے اُنکی اُطاعت  
 اختیار کر لی، مگر حضرت غنبل علیہ السلام نے اِس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ  
 اَشْتَقْتُ لِيَوْمِ الْعَلَمِيْنَ : میں نے ہر روزگارِ عالم کی اُطاعت اختیار کر لی، ایک تو اِس  
 میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور دوسری جمل و علا شاعری کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں کا مقام تھا، دوسرو  
 ں کا الجہل ہر چیز کے لئے جو اُطاعت اختیار کر دے پس پراختیاء نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اِس کا ذکر  
 ہو رہا تھا، کیونکہ وہ دُوبِ الْعَالَمِيْنَ میں سامنے ہوا کہ پھر دو گنا ہے۔ سامنے جان اور جانِ اول  
 کو اِس کی اُطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، جس لئے اُطاعتِ جہتِ ساری اُس نے اپنا فرض  
 ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا، اِس میں سے کسی معلوم ہو گیا کہ ملتِ براہِی کا بنیادی اصول اور پوری  
 حقیقت ایک لفظِ اسلام ہی میں مضمر ہے جس کے معنی میں اُطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے براہِ اہم  
 علیہ السلام کے مذہبِ ملک کا اور یہی حاصل ہے اِن اِمکات کا جس سے غور کرنا کھانی کا ہے

خلیل اپنے مقام عالی تک پہنچا ہے، اور اسلام میں اعلیٰ معاشرت کی وہ چیز اس جس کے لئے یہ سارا جہاں بنا چکا، اور جس کے لئے نبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے پہلے معلوم ہو چکا کہ اسلام میں تمام انبیاء علیہم السلام کو مشترک دینی اور لفظ دعوت ہے، حضرت آدم سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نے دے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو بلا یا، فرقہ کریم نے واضح القائلین منبر کیا۔

۱۔ اِنَّ الَّذِي يَنْتَظِرُ عَذَابَ اللَّهِ الْاَوْفَاكَ ۚ (۱۱۳)  
۲۔ وَتَنْتَظِرُ يُبْسِكُ خُتَمَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا  
قُلُوْبُ نَفْسًا رَحْمَةً (۱۱۴)

اور ظاہر ہے کہ جتنے دینی و مذہبی مختلف امتیاز، عظیم السلام لائے ہیں وہ سب بالآخر  
وقت میں ان کے نزدیک منہور تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دینی اسلام ہی  
ہوں، اگرچہ نامان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دین مومن و عقیقہ ایسا اسلام کہا جائے یا یہودیت و  
نصرانیت وغیرہ، اور حقیقت سب کے اسلام ہے، جس کا حاصل اخلاقی حق ہے، البتہ اس کا  
ایک خصوصیت ملت ابراہیمی کا حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا  
نام بھی اسلام تحریر کیا اور اپنی امت کو بھی امت مسلمہ کا نام دیا، دعا میں عرض کیا،  
وَمَا أَدْعَاكُمْ إِلَّا لِمَا بَيْنَ يَدَيْكُمْ مِنَ الدِّينِ ۚ لَكُمْ مِنْهُ حُكْمٌ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ  
وَمَا تَدْعَاكُمْ إِلَّا لِمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۚ مَا تَدْعَاكُمْ إِلَّا لِمَا بَيْنَ يَدَيْكُمْ مِنَ الدِّينِ ۚ لَكُمْ مِنْهُ حُكْمٌ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ  
اور دس سے بھی ایک جماعت کو پانچ قسم کے منسب اور ابنہ

اور لوگوں کو وصیت کرنے کو ہوتے فرمایا  
فَلَا تَتَّبِعُوا فِي مَوْتِكُمْ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ وَمَن تَتَّبِعُوا فَبِهَا هُمْ  
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصیت امتیاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی جو بڑے بڑے  
امت محمدیہ رضی اللہ عنہما صاحبہ العزۃ والاسلام کو حاصل ہوا کہ اس کا نام امتیاز علیہ السلام رکھا گیا اور اس کی  
طقت بھی ملت اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی قرآن کریم کا ارشاد ہے  
وَلَمَّا أَتَيْنَاهُ إِذِ ابْنُ كَلْبٍ أَخَذَهُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ قَالَ أَنِ  
اؤتِ بَنِيَّ مِن مَّوَدِّكَ وَلَئِن لَّا تَفْعَلْ لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ  
اور اس میں بھی زمین قرآن میں  
کہے کہ قرآن ہی کی کہتے ہیں کہ امتیاز ابراہیم علیہ السلام ہی اور مشرکین و کفار بھی

























طرت نچ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری محنت اہلہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور انفرادی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت عینی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سبب قائل ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر مہتر ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جسر انسانی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اعتدائی چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکرائو اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو متعارف دیا، اور کرداروں خداؤں کی پرستش میں مٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدۃ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور فطری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہو وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں سے تمہنی

معاذ البستہ ہیں ان کا برابر احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ان خست یاری امور میں اس کی پوری رعایت کی کہ فکری وحدت کے ساتھ عمل اور صورتی وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت یکھے پڑھے اور ان پڑھ شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، وہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار یا یونیفارم کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے، تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار یا یونیفارم مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور ادوار لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسرار بجا یا نفع وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی فحاشی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور مستحسنی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت خانگی صفت نہیں، ایک امام کی فعل و حرکت کی عمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ الشریعہ شائد کی ذات پاک ہر سمت وجہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے مشن جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی سمت وجہت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت وجہت کو لے کر جس کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑا اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شائد کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ ہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي

بَبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُوَ فِي الْفُلَاكِ ۝۱۳۲

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ

جو کہ میں ہر برکت والا، ہدایت والا چاند اور سورج کا گھر



نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ ہی بیت اللہ تھا، مگر نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی مہدم ہو گئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور مصلی علیہ السلام نے دوبارہ بحکم خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور وہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صفحہ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی (ذکرہ القریٰ)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداء آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صبح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ ستہ میں بیت المقدس کی طرف نماز ادا نہائی مسجد نبوی میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرین)

حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے توسیۃ الرسل سزا پا اطاعت تھے، اور حکم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیدیا جائے، اور چونکہ عارۃ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی حسدا خواہد چنیں

می و ہدی زداں مراد منتہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظار دہی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے،

فَمَنْ مَّكَّنَّا فِي  
الْأَرْضِ فَلْيَنْتَظِرْ قَبْلَ تَرْكِهَا  
قَوْلِي وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ  
الْحَرَامِ (۱۴۳)

ہم دیکھ رہے ہیں آپ کا بارگاہِ آسمان کی طرف  
ظہر اٹھانا سو ہم آپ کا قبلہ ہی بدل دیں گے  
جو آپ کو پسند ہو اس لئے آئندہ آپ نمازیں  
اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار منسربا کر اس کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں | یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں اس کی سمت کا استقبال ہی پروردگار نے دنیا کیلئے کافی ہو | کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استقبال فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلاذبعیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی عازات پائی جائے، بلکہ سمت بیت اللہ کی طرف رخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے یا کسی شہر ہی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے عازات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت بیت اللہ یا سمت مسجد حرام کی طرف رخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سورہ ستہ میں بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا اس پر جو اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ ہی روز و روز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ دیا کہ یہ فرقہ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہو گئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے، قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ خَلَقْتُكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ لِّتَعْرِفُوهُنَّ فَإِنْ تَتُوبْا إِلَىَّ مُتَّعِفِيهِ

یعنی آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔ اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح منسربا دیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے ملاوہ کسی تیسری چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہو اس کی روح حکم جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو ابائی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ،

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ  
قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ  
فَكِنْ الْبِرُّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ  
(بقرہ: ۱۷۷)

اُس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم  
مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی طرف لیکن  
نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت  
کرنے میں ہے۔



اور ایک آیت میں فرمایا

فَاتَّبِعُوا مَا تَوَكَّلُوا فَتَحْمَدُ  
الْحَمْدُ (۱۵۱۲)

تین نام اللہ کے قرآن کے مطابق جس طرف  
میں رخ کرو اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف رہے۔

ان آیات نے قبلہ اور استقبال قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے خستہ یار فرمایا، اور اس کی طرف رخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے، کہ حکم ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبلہ میں تعمیر و تبدل مندرجہ کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکم خداوندی ہے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا تو اس کی طرف رخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا جس میں فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ تَقِيهَا  
الْأَيْمَنَ مِنْ يَشَارِعِ الرِّسُولِ  
مَنْ يَنْعَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ (۱۵۱۳)

تین جن قبلہ پر آپ پہلے رہے ہیں اس کو  
قبلہ بنا کر تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے  
لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا  
اتباع کرتا اور کون کچھ بٹ جاتا ہے۔

اس حقیقت قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحول کو اصول اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعن دیتے تھے، آخر میں ارشاد فرمایا:

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ وہی ہے کہ انسان حکم حق جن شانہ کے لئے کربستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا احمد تین چیزوں پر ہے: ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری امتوں کو ملا تھا، یہودی نے شیجر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا دن تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحول کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی امت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آئیں کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں

کو معسر ہو گئیں، اہل کتاب ان سے عذر دے ہیں۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَتَكُونَ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول

الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدٌ ا ط

تم پر گواہی دینے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور اسے متبعان محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو ہر پہلو سے (ہدایت اعتدال پر ہے، تاکہ دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریق ثانی ان کی مخالفت قریں ہوں گی ان مخالف لوگوں کے مقابل میں گواہ و تجویز، اور اور آخرت بالائے شرف یہ ہوا کہ تمہارے (قابل شہادت اور معسر ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم شرار پاکر سزا یاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف مسائل

امت محمدیہ کا خاص اعتدال لفظ وسط یعنی اوسط اور اور افضل اشیاء کو وسط کہا جاتا ہے، تردی میں بردایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ وسط کی تفسیر عدل سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی) اس آیت میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل امت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا جو سب سے اشراف و افضل ہو، اسی طرح ہم نے امت اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل امت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدان حشر میں یہ امتیاز حاصل ہو گا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی امتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے ٹکرائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت امت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش



ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی متعدد و بھرپوری کوشش کی، مدد علی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملہ کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ و قیح اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا ترکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں بخلاف اور مفصلاً مذکور ہے۔

انقرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کا اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بکلیا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصفت اعتدال کی یہ اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل کیوں ہے کہ اس پر مدار فضیلت رکھا گیا (۳) اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی روش سے کیا ثبوت ہے، ترتیب لہذا ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔  
۱۔ اعتدال کے لفظ معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ بدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصفت اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے تے اور پڑاں طے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبی یونانی، ویدک، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالی مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو وہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طبی یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سودا، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں حسیلات سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور ترری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت مند رہتی

کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی مدد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آئیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر محقق نہیں کہ جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھتے والے ہیں۔

جو ہر انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آفت کے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو محنت و کم کائنات بنایا ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے۔

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست

آدمیت جسز رضاے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے لئے میں فرمایا ہے۔

ایست کہ می بینی حنلاب آدم اند

نیستند آدم حنلاب آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور احتیاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت بھی اور اس کے حسیلات کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کا مل کہلائیگا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانی کامل کے اولین مصداق



آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر پستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک حکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں جنسالاتی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجیں اور بہت ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْنَا كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ طَائِفَتًا مِنْ أَنْفُسِنَا فَخَبَرْتُمْ بِهِمْ وَاتَّخَذْتُمْ مِنْهُمْ أَهْلًا مَحْدُودًا ۝ فَذَرْنَاهُمْ فِي عِلِّيِّينَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُ اللَّهَ وَرُسُلَهُ سِيفًا مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ فَكُلَّمَا نَزَّلْنَا آيَةً مِنْ آيَاتِنَا تَوَلَّوْا ۚ وَكَانَ اللَّهُ مُبْصِرًا فَهِيمًا ۝ فَلْيَحْذَرُوا آلَ فِرْعَوْنَ فَإِنَّ هَؤُلَاءِ هُمْ الْكَافِرُونَ ۝

”یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں  
وہ کر اور راہی اُن کے ساتھ کتاب اور  
ترانہ تاکہ لوگ مدد و انصاف پر قائم ہو جائیں  
اور ہم نے انکار کیا اس میں سخت لڑائی ہوا  
لوگوں کے کام چلتے ہیں۔“

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں جنسالاتی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترانہ و معاملات دین میں علی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترانہ سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور مدد انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

انتہی محمد میں قوم کا اعتدال اس بیان آپ نے بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ انتہی محمدیہ علی ما جاءہم من العلم والصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ بولنے اور سمجھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حادی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت قرار دیا کہ انسان کا جو صبر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۃ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِنْ قَبْلُ جَعَلْنَا آيَةً يَسْتَفْتُونَكَ وَاللَّهُ خَبِيرٌ ۝ وَتِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الَّتِي كُنَّا نُنزِلُكَ فِيهَا وَلَعَلَّكَ تَعْلَمُ ۝ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۝ (۱۸۱:۴)

”یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہو  
ایک ہی امت ہے جو سچے راہ بتلاتے ہیں اور  
اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔“

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدالی مزاج اور اعتدالی روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ ذُو قُوَّةٍ يَأْتِيكُمُ الْبَيِّنَاتُ وَالْغُرُوحُ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ نَبِيًّا ۝ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۝ (۱۱۰:۳)

”یعنی تم سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں  
بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اپنے کاموں کا اور  
منہ کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پرست  
لاتے ہو۔“

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا ہمتی مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی فشر بانیوں سے سرسبز شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا، اگرچہ اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُخْرُوحُ الثَّائِمِينَ میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، بُرے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْكَفُّ عَنْ النَّفْسِ يَتَحَدُّ كَالْبُحْبُورِ مطلب ہو کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب کمالات کی خیر خواہی کرے، پھر بُرے کاموں میں کفر و شرک



بدعات، رسوم قبیلہ، فتن و فجور اور ہر قسم کی باحتمالی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کہیں زبان سے کہیں ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا چارہ اس میں داخل ہوگا۔ یہ صفت جس قدر معلوم و اہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب دوسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعہات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقاد کی اعتدالی: سب سے پہلے اعتقادی اور فطری اعتدال کو لے لیجئے، تو پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے، وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (۳۰، ۴۱) اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برکتوں کے باوجود جب اُن کا رسول ان کو کسی جنگ و جدال کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں خَاذِبٌ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلْ إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵۴، ۵۵) یعنی جیسے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

خلافت امت محمدیہ کے وہ ہر ترن ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام پر ہر زبان میں

بڑھتا ہے میں بکرا اس فرشتے کے قتل میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ کمالات و فضائل و عبادت و تضرع ماننے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ بیان رکھتے ہیں، جو قصیدہ برترہ میں فرمایا ہے

فِي مَا لَا عِلْمَ لَهُ النَّصْلَانِي فِي تَيْتَلِيهِ وَالْحُكْمُ بِمَا شِئْتَ مِنْ عَائِدَةٍ احْتَكِمِ

یعنی اس کلمہ کو تو چھوڑ دو جو فصاحتی لے اپنے نبی کے مانے میں کہہ دیا، کہ وہ معاذ اللہ خود

خدا با خدا کے بیٹے ہیں، اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب جی رسیج ہے۔

جس کا خلاصہ کہیں نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند حکموں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، ارشتریں نیکر آسانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں اور طرح طرح کے چیلے پہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور محتسب جیسے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکام خدا و رسول پر مرثیے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسری کے سخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں بر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی بھکاری بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر ہیں، اس نے بادشاہی میں فیکری اور فیکری میں بادشاہی سمجھائی ہے

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

ز تدبیر عیب اللہ آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پہلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی بردہ نہیں، حق ناخن کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کھل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب بڑا کمال ہے، ایک زمین کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بنو سلسل تہرہس جاری ہی ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ شعی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیانہ رحم دلی کہ کپڑے بکھڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کھال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے



معاشرہ میں درگزر اور عضو چشم پوشی کا سبق سکھایا، اور دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

**اقتصادی اور مالی اعتدال:** اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالی نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی غرض حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سب سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب جہد کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا عمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقبل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرتے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا، کہ امت محمدیہ ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

**اجماع کا حجت ہونا:** قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے، کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء و شہداء کے درجے پر دوسری امتوں کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر منطوری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہو، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلطی پر متفق نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے قبلہ کے لئے تاکہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولِ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى

رسول کا اور کون پھر جلتے گا آئے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوتی مگر ان پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ عِبَادًا إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَوِّفٌ شَرِيفٌ ۝۳۴

لوگوں پر بہت شفیق نہایت ہرمان ہے

**خلاصہ تفسیر:** اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا (اور جب سمت قبلہ پر آپ (چند روز قادم) رہ چکے ہیں یعنی بیت المقدس) وہ تو محض

اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کے مقرر ہونے

سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے

اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عاجزی

قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا، اور یہ قبلہ کا بدلنا (مخوف لوگوں پر)



ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے وسیعے طریق کی ہدایت فرمائی ہے، جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام ایسے کو بے چون و چرا قبول کر لینا ان کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے، اور وہ ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ دوسرے دلائل سے تو جتنی نمازیں اور ہڑوسی ہیں ان میں ثواب بھی کم ہوا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس دوسرے کورل میں نہ لانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب کو منافع اور ناقص کر دیں اور واقعی اللہ تعالیٰ تو دلیجے لوگوں پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا۔

## معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہوا کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابتدا کب ہوئی جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جن ہجرت کے بعد ہی سولہ ستروہینہ مکہ باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ مجرا سو درکن بمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیدیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ ستروہینہ آپؐ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اس کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر ترمذی میں بحوالہ ابو عمر اس کو واضح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن حق از ندی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہیست دیکھ

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپؐ کو اپنے آباء ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صحفہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صحفہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپؐ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑنے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کر دے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک بحکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے ہستیاز اور ان سے مخالفت کا اہتمام کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے ہستیاز اور ان کی مخالفت کا اہتمام ضرور ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا کہ الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهِ تَحْتَمِلُ مَا رَأَيْتُمْ، قول اول کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپؐ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہی آپؐ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپؐ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر یہی معلوم ہو جائے کہ کون آپؐ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کچھ ففاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

## بعض احکام متعلقہ

بہن سنت کو قرآن کے ذریعہ جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح بھی مشورہ کیا جاتا ہے نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل اور ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنت نبویہ ہی سے ہے، توجہ چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو مشورہ کر کے



آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو شترآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں باہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ شترآن قویہ اس کے ثبوت پر موجود، بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحاح کرامؓ ہوں اس سے شترآنی حکم منسوخ سمجھا جکتا ہے کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تخیل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور آپ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، اور بعض روایات میں اس جنگ عصر کے بھانے ظہر مذکور ہے (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سہلہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیان نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، تو یہ سنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عمرؓ میں جو پھل صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مرد کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سہلہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تخیل قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قباہ میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بڑا بیت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہل قباہ نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

هذه اخبار صحيحه مستفيضه في يدي	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے
اهل العلم قد تلقوه بالقبول فثبت	مگر قرآن قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تراثر کا
في حيز النواتج الموجب للعلم	محل کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، ان پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سہلہ اور اہل قباہ کو تو ابانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت تو انرا حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کئی عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رطبیت یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا

اور آپ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہے گا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقا قبلہ بیت المقدس غلط ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے پیچہ را حکمانی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی شترآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا منقول نہیں۔

آلہ کبر الصوت کی آواز پر نمازیں جمع بخاری باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نقل و حرکت مفسد نماز نہ ہو بلکہ استدلال جو قباہ میں تخیل قبلہ کا حکم پہنچے اور ان لوگوں کے بحالت مناسبت بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:

فيه جواز تعليم من ليس في	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص
الصلوة من هو فيها	نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے
(عدة القاری، ص ۱۳۸ ج ۳)	کو تعلیم و یقین کر سکتا ہے

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفيه استماع المتعلمي للام من ليس في الصلوة فلا يضر صلواته (الی) ممکن الاستبطله الطحاوی (عدة القاری، ص ۲۲۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو حاج صلاۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صفت پوری ہو چکی ہے، اب پھل صفت میں ہنارہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صفت میں کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گارہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درختار باب الامامة میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا تم نقل تصحیح عدم الفساد فی مثلہ من حدیث من الصف فتناء خرفہ من شرفہ فلیحدس، اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: لا تغفلوا عن مثل من آمن بالله، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آمنا لے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امر الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صفت والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شربلانیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا



پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں۔ (اِذَا قِيْلَ اُصَلِّ فَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنَّكُمْ تَصَلُّونَ) لانه امتثل امر غیر اللہ فی الصلوٰۃ لان امتثالہ انما ہو لا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلا یضراہ

ان تمام آیات ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کی شہادت نمازیں میں شرکت میں تو اس کی وضو میں ایک ہر کہ خود اس شخص کی دلداری اور اتباع مقصد ہو یہ تو مقصد نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الہی کا اتباع ہے، اس لئے مقصد نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحاوی نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ اقوال لوقیل بالتفصیل بین کونہ امتثل امر الشارع فلا یضلی بین کونہ امتثل امر الداخل مراعاة لخالطہ من غلبہ نظر لا مراعاتہ

فتاویٰ لکان حشا و طحاوی علی الدہ، ص ۲۳۶ ج ۱

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آواز بکبر الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا، کیونکہ وہاں اس آواز کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کر دے، جب سجدہ کرے تو سجدہ بھی سجدہ کر دے، اس آواز سے اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرنا کہ نہ کہ اس آواز کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکم الہی ہے، اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آواز بکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جاتے بلکہ اس کی نقل و حکایت قرار دیا جاتے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آواز امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جواز صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مسئلہ رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا اِنْ شَاءَ اللَّهُ، یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی سے جائے تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تخیل قبلہ پر جو بعض جو قوت لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے منحرف ہو گئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہو گیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بلے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایات حدیث اور اقوال سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازیں سابق قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح و مقبول ہو چکیں، تخیل قبلہ کے حکم کا پھیلنا نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابن عازب، اور ترمذی میں بروایت ابن عباس، منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس غرض میں انتقال کر گئے جب کہ نماز بیت المقدس کی طرف ہو کر کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا

ان کو نصیب نہیں ہوا ان کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تخیل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا

ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو اللہ پھیرے گا تیرے منہ کو جس قبلہ کو چاہے گا

قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا

اب پھر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہو کر رہو پھیرو منہ اس کی

وَسُجُودَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ

طرف، اور جن کو کتاب الہیہ ملے جانتے ہیں کہ یہی

الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰۳﴾

ٹھیک بران کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

**خلاصہ تفسیر** آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور امید دہی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے،

آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں اور چونکہ میں آپ کی خوشی پر راکھ منظور ہوں اس لئے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے، جو آپ کو پسند ہو (لو پھر ہم حکم ہی دیتے ہیں کہ، اپنے اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ دینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہرہ کو اس (مسجد حرام) کی طرف کیا کر دے اور اس قبلہ کے معترف ہونے کے متعلق، یہ اپنی کتاب بھی بالعموم اپنی کتابوں کی پیشگوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا، یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے) مگر عناد امانتے نہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔



## معارف مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہشتابان کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطا نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتے ابراہیمی کے تالک کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتے ابراہیمی کے مطابق تشریف دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیا جائے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتے ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانستے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے محل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہودیہ و عیسائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیا جائے، اور چونکہ معتزبان بارگاہ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امید دار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان مفسر مکر پہلے تو قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا، فَلْتَوِيْتَنَّا لَعْنَتِيْ ہِمَّ اَیُّکَا رُخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہو، اس کے فوراً بعد ہی یہ رخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمایا، فَوَلَّيْنَا وَجْهَکَ وَجْہَکَ، اس طرز عمل میں ایک خاص لطف تھا، کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفاء وعدہ کی خوشی تندرست ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، منہرجی سے لیا گیا ہے)

مسئلہ استقبال قبلہ | یہ تحقیق پہلے آپ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، فَوَلَّيْنَا وَجْہَکَ وَجْہَکَ، لیکن مصالح امت کے لئے بقائنا و تحکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عمل مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ فَوَلَّيْنَا وَجْہَکَ وَجْہَکَ، اور اسی بیت اللہ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے عزوجل بدل کر شَطْرَ الْمَشْرِیْمِ الْفَرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کنی اہم مسائل استقبال قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کر دو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات رحاات کے ذریعہ بھی صبح سمت کا صحیح دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقین ہو جائے، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رخ پھیر لینا درود و رُخ تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شَطْرِ اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ الی الْمَشْرِیْمِ الْفَرَامِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَشْرِیْمِ الْفَرَامِ فرمایا گیا، شَطْرُ دُوعْنِ کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصف ہے، دوسرے سمت ہے، باتفاق مفسرین اس جگہ شَطْر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلاد بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجد حرام کافی ہے (بھر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے استقبال قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمت مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمت مغرب و قبلہ تشریف دیا ہے، جو موسم گرمی و سرما کی دونوں ضروریوں کے درمیان ہے، اور قواعد ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب ضعیف اور مغرب ہشتا کے درمیان ۳۸ ڈگری تک سمت قبلہ تشریف دی جائے گی، یعنی ۲۳ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی تدبیر اور مشہور کتاب شرح چمنی باب رابع صفحہ ۶۱ میں دونوں مشربین کا فاصلہ بھی ۳۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

۱۰ حضرت والد صاحب نے جو اہل فقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی



سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے اس سے ان لوگوں کی چہالت بھی واضح ہو گئی جنہوں نے ہندوستان و شرقاً آلات رصدیہ اور حسابیہ پاکستان کی ہیئت سی مسجدوں کی سمت قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ریاضیہ پر مدار نہیں ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شرعیہ اسلام پر جو تک قیامت تک آنے والی فلسفوں کے لئے اور پوری دنیا کے مالک کے لئے ہے، اس نے احکام شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا مہلک وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے ۳۸۱ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں، ما بین المشرق والمغرب قبلۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی مابین المشرق والمغرب قبلہ ہے، آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا خط لکھ دیا کہ اگر تم کوئی تشریح کر دو کہ مسجد حرام کی سمت کافی البتہ بناؤ مسجد کے وقت اس کی کو شش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے وہ کر لیا جائے، صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ رہا تھا کہ جس جگہ صحابہ کرام کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوئی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلاد بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں جو حضرات صحابہ و تابعین نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمت قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انہیں دیکھ کر دوسری بیٹیوں میں سلفین نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجد مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و کافی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہات فلسفہ کا ناشر ماحول نہیں، بلکہ مذہب اور موجب تثلیل ہی، بلکہ بسا اوقات ان تشریحات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اور عمامۃ المسلمین پر یہ گمانی ہو جاتی ہے، کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جہالت ہے، انھیں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب خلیج اسی بنا پر سمت قبلہ میں آلات رصدیہ اور دقیقاً ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظہ

واما علم التیسیر فاذا تعلم منه ما يحتاج الیہ للاستہلال ومعرفة القبلة والطریق کان جائزاً عند الجمهور وما نأد علیہ فلا حرج الیہ وهو یغفل عما هو اہم منه وربما اذی التذقیق فیہ الی اساق الفلک بمساریب المسلمین امصالحہم كما وقع فی ذلک کثیر من اہل هذا العلم قد یمازحون وذلک بغضی الی اعتقاد غطاء الصعابة والتأیین فی صلاوتهم فی کثیر من الامصار وهو باطل وقد انکر الامام احمد الاستدلال بالعین وقال اتسا ورد ما بین المشرق والمغرب قبلۃ فرما یہ حدیث شریف میں (مشرق و المغرب قبلہ کیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے)

لیکن علم تیسیر پر اس کو اس قدر محال کرنا چاہئے کہ نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور رستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ زمین زیادہ کھنڈ امور ضروریہ غافل کر دے گا، اور بعض مرتبہ تحقیقات فلکیہ میں پڑنا عامہ بلاد اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق گمانی پیدا کر دینا بڑا اس شخص میں مشغول ہوئیوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس پر یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت شہروں میں صحابہ و تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمد نے (سنن) میں بھی ذکر کیا ہے کہ ہمارے بلاد میں قطب کہتے ہیں سمت قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور

اور جن جگہات یا نوآبادیات وغیرہ میں صاحب قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سلف صحابہ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہو کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جائے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی ہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسب تصریح صاحب ذرائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروچ بیچ کا قرار دے کر اسی پر نفقہ وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں، حقیقت مشقت ہر یاد ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ محمد اعظمی رسائل الارکان میں اس مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:

والشہد وقطع المسامحة علی حسب | اور استقبال قبلہ میں شرط ضروری صرف یہ



ما یبری المصلیٰ وینجی غیر مأمورین  
بالمسامتۃ علی ما یحکم بہ الأوامر  
المرصدة ولہذا افتوا ان الاخراج  
المفسد ان یتجاوز المشرق و  
المغارب (رسائل الارکان ص ۵۳)

ہر کہ غازی کی رشتہ اور اندازہ کے موافق کعبہ  
کے ساتھ مسامتہ (مجاہزات) واقع ہو جائے  
اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ  
و مجاہزات کا پیدا کریں جو کالات و مسد یہ  
کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ  
ملا کا فتویٰ ہے کہ انحراف مفسد و مصلوقہ وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے

اس مسئلہ کی محل بشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی  
حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمت قبلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلَیِّنُ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آیَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ

اور اگر تولا نے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَیِّنُ

اور نہ تیرے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لَئِنْ اِذَا لَیِّنُ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہر ان

الظالمین

بے انصافوں میں۔

**خلاصہ تفسیر** اور راجد ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ  
ران اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں جمع کر کے پیش کر دیں

جب بھی آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھیں چاہے کہ  
آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، پس  
کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی، اور جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم  
بھی موافقت نہیں کیونکہ ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا،  
مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا، اور

خدا نخواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ منسوخ غیر مشروع کر لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ  
ان کے ران (انسانی خیالات کو) گردہ اصل میں جھم آسانی رہے ہوں لیکن اب جو منسوخ ہونے  
کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہو، سو اگر آپ ایسے خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی)  
آپ کے پاس علم قطعی یعنی وحی (آپ سے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعمت اللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں  
جو کہ تارکین حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا جو بد معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے  
کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں۔

## معارف مسائل

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ  
بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے  
قبلہ کو تو کوئی تسرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب  
بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحسرحیط)

وَلَیِّنُ آتِیَتْ الذِّیْنَ اَوْتُوا الْكِتَابَ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ فرض محال کے ہے  
جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سننا نا امت محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلافت درزی  
ایسی چسپور کہ خود رسول بھی بغرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِیْنَ اتَّيَسَّهُمُ الْكِتَابُ یَعْرِفُونَهُ كَمَا یَعْرِفُونَ اَنْبَاءَهُمْ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہناتے ہیں اس کو جیسے پہناتے ہیں اپنے بیٹوں کو

ذَٰلَکَ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَّکُنَّ مِنَ الْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُونَ ۝۱۲۷

اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر، حق وہی ہے

مَنْ تَرٰ بِكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُنْکَرِیْنَ ۝۱۲۸

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو مشک لانے والا۔

**خلاصہ تفسیر**

اس سے پہلے آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان  
سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے  
جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا رہے شک و شبہ پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، رکہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کسی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایسا ہی لے آتے اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اختلا کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

## معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں بھی شبہ و شبہاء نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہو کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہو یا باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداً پیدا نش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوچھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کہیں نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچانا مراد نہیں کیونکہ اس نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہو کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچانا ہو کہ بیشائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کسی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَذِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہر مئی قبلہ کر، مگر تم اس طرف سو مت بہت کرو دیکھو میں جہاں کہیں تم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ فَلْيُذَكِّرْ ۝ وَمِنْ

ہم کو کراتے حکام کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کو سمجھتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ

(نکلے سرگھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طَوَّافَةٌ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ

برے رب کی طرف سے اور اللہ ہے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ مَا كُنْتُمْ

نکلے مگر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو مگر نہ کرو

قُولُوا وَجْهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ لِيَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأَتِمَّ تَعْمَتِي

ان میں سے افسانے ہیں اسرار سے لینی انکے اعتراضوں سے، نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

کروں تم پر نفع اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

## خلاصہ تفسیر

اور (دوسری حکمت توحیل قبلہ میں یہ ہر کہ مادۃ اللہ جاری ہو کہ) ہر مذہب پہلے

نفس کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) متوجہ کرتا

رہا ہے، چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت

سب پر ظاہر ہو بھی (سورہ مسلمانوں) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے

بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہو گے

(لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنے اجلاس میں (حاضر کر دے گا) اس وقت نیکوں پر جزا اور اعمال

بد پر سزا ہوگی اور (بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور اس حکمت کا مقتضار بھی

یہی ہے کہ جس طرح حضرت کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ

سے بھی (کہیں سفر میں) آپ (باہر جاویں تو) بھی (اپنا چہرہ (رہائیں) مسجد حرام کی طرف رکھ لیجئے،

وغرض حضور و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہی) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور)

منجانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بخیر نہیں۔

توحیل قبلہ کی تیسری حکمت (اور دیکھ رہا تھا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور



حضرت بدر جہاؤنی (پناہ چہرہ نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکعتے، اور اسی طرح سب مسلمان بھی اس میں کہ تم لوگ چنان کہیں (موجود) ہوا پناہ چہرہ نماز میں) اسی (مسجد حرام) کی طرف دیکھا کرو اور اللہ یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ (ان مخالفت) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو کی مجال نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موجود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصل قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تو یہ قبلہ کی، ان) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں وہ اب بھی کٹھ جھتی بھالیں گے، کہ یہ کیسے نہیں ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا، تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مست پڑو اور تمہارے دہرائے رہو کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضرب ہے، اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو کچھ (میرا انعام و اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت کر کے، اس کی تکمیل کرو دو اور تاکہ (دنیا میں) تم راہِ حق) پر رہیں اسلام پر قائم رہنے والو) میں (رہو جس پر وہ تکمیل نعمت مرثب ہوتی ہے)

## معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں | مذکور آیات میں تحويل قبلہ کیلئے الفاظ قرآنی وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مرتبہ آئے ہیں اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ دو مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شب کا ذریعہ تھا ہی اخذ مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ جکر اورد لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان القرآن کے علامہ تفسیر میں جو تعلیق کی مشورہ کی ہے تو قرطبی بھی اسکی ایک ایسی تفسیر نقل کی ہیں جس سے صحت و جواز

فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا قرآن وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یہ حکم حالتِ حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ معین ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں اور پھر فریضہ امت کو اس کا حکم دیا گیا، اور حَيْثُمَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ ہوا اپنی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے میں حَيْثُمَا كُنْتُمْ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کر لے گا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کر کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ وَحَيْثُمَا كُنْتُمْ کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس تیسری مرتبہ کے اضافہ کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہے نہ سکیں کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو قوراث و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ سول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلَكِنْ وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ | وَجْهًا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ جس چیز کی طرف رخ کیا جائے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہوا اور حضرت ابن عباس کی قنوت میں اس جگہ وَجْهًا کی بجائے قبلہ بھی منقول ہے، مراد آیت کی چھوڑ مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہو، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ معسر کر دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہب مساکین میں فضول بھڑوں | فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے اجتناب کی مساویات کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس کو اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مساویات الی الخیرات میں شغلی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر و درپیش ہو رہے کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا، آيَةُ مَا تَكُونُوا بآيَاتِ يَكْفُرُ اللَّهُ جَوِيحًا جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ارجحیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہو اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔



ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبدول فرمائی ہو  
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں  
قرآنی نے فرمایا کہ گستاخوں کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ النفال میں تھا اَنْحَرَجَلْ  
اور سورۃ حجر کے آخر میں گستاخوں کا اَعْلٰی الْمُفْسِدِیْنَ آیا ہے۔

قَدْ كُذِّبَتْ اَاْذْ كُذِّبَتْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان  
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی  
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے  
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر  
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول  
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی  
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس  
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان  
کو تو اپنی طاعت میں لگا لیا (فسترطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا  
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ نے ہدیٰ لے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس  
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منبر یا  
اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ  
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں  
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب  
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری  
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم یطیعہ لم یمن کرمہ وان  
کثر صلواتہ وتبایعہ  
یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی  
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں  
اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے جو احکام القرآن ابن خریز منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی  
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ  
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)  
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے  
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں  
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے  
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں  
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش  
ہلتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تخیل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دوا کرتے، ایک مذہب اسلام  
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا کر رہا ہے، اور یہی آیتوں میں اس اعتراض  
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طہانے اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص  
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بچ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت  
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایمان والوں، طبیعتوں میں عمیق ہلکا کرنے کے واسطے میں، صبر اور نماز سے سہارا  
اور مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، رادر نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبارت  
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔



ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبدول فرمائی ہو  
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں  
قرآنی نے فرمایا کہ گستاخوں کا کاف یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ النفال میں تمنا آخرت کے  
اور سورۃ حجر کے آخر میں گستاخوں کا کاف ایسا ہی ہے۔

قَدْ كُنْتُمْ فِي آيَاتِنَا أَنْتُمْ لَا تَشْكُرُونَ  
ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر بانی  
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمی نے اس کے متعلق فرمایا ہے

بزرگباں تسبیح در دل گھاؤ منسر

ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول  
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی  
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس  
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان  
کو تو اپنی طاعت میں لگا لیا (فسترطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا  
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ نے ہمدی نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس  
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منسرایا  
اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ  
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں  
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب  
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری  
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يسمع كلامه

کثر صلواتہ و تسبیحہ

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی

نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں

اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے جو احکام القرآن ابن خریز منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی تفصیل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی  
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ  
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)  
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے  
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں  
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے  
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں  
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش  
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تخیل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دوا کرتے، ایک مذہب اسلام  
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا کر رہا ہے، اور یہی آیتوں میں اس اعتراض  
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طہانہ اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص  
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بیخ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت  
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایمان والوں، طبیعتوں میں عمیق ہلکا کرنے کے واسطے میں، صبر اور نماز سے سہارا  
اور مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، راہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبارت  
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔



## معارف مسائل

مبرا در نماز ہر شکل کامل | اِسْتَعِيْنُوا بِالصَّلٰوةِ الصَّلٰوةِ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی اور ہر مخلقت کا علاج میں تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب کا علاج کو دور کرنے کا نسخہ اکبر و درجہ سے مرکب ہے، ایک مبرا دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوا کو عام سمجھو لے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، مگر فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہو، تفسیر منظر ہی میں اس عموم کو واضح کر دیا، اب اس درجہ کی نفع کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

مبرک اصل حقیقت مبرک اصل معنی اپنی نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں مبرک کے معنی شے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا، عیسے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف دہ پریشانی کے اظہار کا کوئی حکم بھی نہیں سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دوسرے جو صبر کی اصل اور بنیاد میں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ عرش میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حتما جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يَتَوَقَّى الصَّابِرُونَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱۰۴) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکبر ہے نماز ہے، صبر کہ جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جدا گانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبور بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں و مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو یا تھ یا مٹھ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا، مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اس طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام معاصی سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، درہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت اللہ تعالیٰ اس ہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہوا

اِذَا حُزِبَ عَنْ رُفْعِ اِلَى الصَّلٰوةِ

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت

پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرما کرتے تھے،

مبرا در تمام مشکلات معاصی | اِنَّ اللّٰهَ تَجَّ الصَّابِرِينَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر نجات کا سبب اس لئے ہے کہ مبرا حل مشکلات اور دفع مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حامل اللہ تعالیٰ کی بہت نصیب ہوتا ہے یہ ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کولسا کام ترک کر سکتا ہے اور کوئی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مرے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَكُنْتُمْ لَكُمْ بَشِيرٌ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو ٹھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے



مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِسِ وَبَنِي الشَّيْطَانِ ۝۱۵۷ الدِّينِ

ان کے اور جانوں کے اور میروں کے اور خوش خیزی دے مہر کرنے والوں کو کہ جب

اِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۸ اُولَٰئِكَ

پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۝۱۵۹ اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور ہدایت اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

**رابطہ** اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات غلامیہ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، اور وجہ سے اول بوجہ اعظم ہونے کے کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

**خلاصہ تفسیر** اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دین کے واسطے قتل کئے جاتے ہیں ان کی ایسی فضیلت ہو کہ ان کی نسبت یوں بھی مست کہو کہ وہ معمولی مُردوں کی طرح

مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن تم اپنے موجودہ حواس سے (اس حیات کا) اور اک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم مصیبت و رضا و تسلیم میں جو کہ متضاد ایمان کا ہی، تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ هجوم مخالفین یا نزول حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور کسی قدر فقر و فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور بھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آؤں اور مستقل رہیں تو آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہی کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ردل سے سمجھ کر یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد و حقیقتہً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے ملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جاسے والے ہیں، سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جاکر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مہذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشترک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک (رسائی ہو گئی) کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے۔

## معارف مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیات برزخی یہ قسب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو اور اس کے درجات میں تفاضل برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ فہر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ قسب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجہ انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنۃ اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت مجتہد الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مُردوں کی سی موت سمجھنے کی نہایت کمی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا اور اک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز، جو اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اور دُور سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلات معمولی مُردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صیغ سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی مانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔

پس اس حیات میں سب قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مُردے،



البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو جب اللہ نفس میں مرنے کو بھی حقیقی شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہونگے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مسرورن کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہر تہہ و دو سر کو ملکہ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہو اور اگر فحشا ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرف و شہادت ہو، تو دلیل قطعی تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے، تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھائی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام و انواع کی وحاشیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دو سر کا اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اغلاط و اجسام بیہلہ مثل آب و آتش و باد و تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد المات انبیاء کی حیات قبل المات سے اتنی نہیں، اور بعض حصہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دو سر کے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاء غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جائیں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہو کہ امتیاز اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات زیادہ مرتبت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جائیں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارج عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ و تبدل اور حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مرکب نہیں ہوتا اس لئے لا تشعرون فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

معنا یہ ہے کہ آسان ف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت کرنے کی خاص تدبیر آیت وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰہِیْمُ بِرُبُّہٖ ذَکٰہُ کی تعبیر میں گزر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعہ کوئی صدقہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو کہہ لینا چاہئے کہ دنیا دارالمن ہے، یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے، اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس عمل صبر میں سبب شریک ہیں، اس لئے اس کا حاصل مشترک تو عام رحمت ہو، جو نفس صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا حاصل جدا جدا خاص غنائتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو مل سکتے ہیں، قدر اعلیٰ و الخیرت دینے جاتے ہیں۔

مصیبت میں اتنا بڑا کچھ نہ ہو جاتا ہے | صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے تو تکلیف قلب کا بہترین علاج ہے | وقت اللہ و اتالیقہ را جوں کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہو کہ مصیبت دانوں کو ایسا ہٹانا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے کچھ کر یہ الفاظ کہ جائیں تو غم درخ کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّافِیْنَ الْمَرْوۃَ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیۡتَ اَوْ اَعَمَّرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سوچ کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطُوۡفَ بِہِمَا وَاَوْ مَنْ طَوَّعَ خَیۡرًاۤ اِنَّ اللّٰہَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاکِرٌ عَلَیۡہِۭ ۝۱۵۰

قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا

رابط آیات متقدمہ میں وَاِذَا ابْتُلِيَ اِبْرٰہِیْمُ سے درر تک خانہ کعبہ کا فضل ذکر ہوا ہے، جس کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیم کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہو، پس بیت اللہ کا مقصد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے مطلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ



صفاد مردہ وہ پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں۔ جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی جڑی جڑی تھی، اور اس وقت صفاد مردہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہو اگر شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمایا مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مردہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمایا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

**خلاصہ تفسیر** (صفاد مردہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کر رہا کیونکہ تحقیقاً صفا و مردہ داران کے درمیان میں سعی کرنا منقطع یا دگر (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا اس کا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان سعی کے محدث طریقہ کے مطابق آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے) کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے) اور رہا ہے یہاں کا ضابطہ ہو کہ جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص خوب جانتے ہیں، پس اس ضابطہ کی نوسہ سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا۔

## معارف مسائل

**بعض لغات کی تحقیق** شعا پر اللہ، شاعر جہ ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شاعر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیے، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خانہ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفاد مردہ کے درمیان حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہی امام احمد کے مساجد اور نزدیکی سنت متجہ ہے، اور مالک اور شافعی کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ کے الفاظ سے شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مردہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

ہو اگر سعی مباحات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لا یجتناء کا سوال کی مشابہت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مردہ پر بتوں کی عوریں رکھی تھیں اور اہل جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مردہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنت ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

**إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْكِتَابِ وَالْهُدَىٰ مِنْ**

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے انارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

**أَعَدَّ مَابَيْتُهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ**

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

**الْعَالَمُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا أَنَّهُمْ كُفَرُوا**

ان پر لعنت کرنا ہے، مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو قرآن کو مٹا

**عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا**

کرتا ہوں اور میں ہوں پڑا صاف کرنا ہلا ہدایت ہر ان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

**وَهُمْ كُفَرُوا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ**

کافر ہیں انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

**أَجْمَعِينَ ۝ خُلِدَ نِينَ فِيهَا لَا يَخْفَىٰ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ**

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہٹا ہوگا ان پر ہے عذاب اور

**لَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝**

نہ ان کو ہلکتا دیکھ لے گا۔

**ربط** اور بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ یعنی فوجہ الیٰ وَرَلَيْكُمُ الْكِتَابُ آئے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔



## خلاصہ تفسیر

جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (و اہی) توراة و انجیل میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتر سے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی) ان پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعا کرتے ہیں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں) اپنی اس حرکت سے (توبہ) یعنی حق تعالیٰ کے (روبرو گذشتہ سے معذرت) کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی) آئندہ کے لئے اس کی اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے) اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جتنے (و لے) لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں، تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری توبہ کثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی نشر کرنا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں، اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی حالت میں رہیں گے (جہنم میں رہیں گے) اور ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہو، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی معاذ تک) ہلکت دی جائے گی (کیونکہ معاذ اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر ازل ہی پیش میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

## معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب | آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کا چھپانا سمجھنا حرام ہے | جو ہدایات و نجات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا ناشائستہ

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے :-

اول یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَتَلَ عَنْ عِلْمٍ يَكْتُمُهُ كَلَمَةً	یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو
أَلَجَمَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ
بَلَا حَافِ قَيْنَ النَّارِ	اس کو چھپا کر قیامت کے روز اس کے منہ میں
وَمِنْ الدَّاحِشِ أَخْرَجَهُ ابْنُ مَرْثَدَةَ	اللہ تعالیٰ آگ کا نظام ڈالیں گے۔

حضرات فقہانہ نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو (قرطبی، جصاص)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسری مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل سے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو، باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتاب علم کے حکم میں نہیں ہو آیت مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْأَشْكَالِ سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سنائو گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے (قرطبی)

اسی طرح شیخ بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ عوام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کر دو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی کر دو اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد کہتے ہیں هَذَا أَيْمَانُ غَيْرِي وَلَا يُعْرَى







بَشَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ مِّنْ ذَاتِ نَفْسٍ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسْتَخَرِ

بھلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادلوں میں جو کہ تابعدار ہے

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَبْتَغِي لِقَوْمٍ يُعْقِلُونَ ﴿۲۳﴾

اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے۔ بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں مفلکین کے لیے

رابطہ | مشرکین مرنے پر جو آیت ذِالْحَكْمِ الْاِلهِ وَاجِبُ اِنِّہٖ عِتْدَہٗ کے خلاف سن تو توجہ ہے کہنے لگے کہ ہمیں سائے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حق تعالیٰ) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمن ہے، رحیم ہے،

اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدین کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہو پس جو سب معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنائے ہیں

اور بچے بعد و بچہ رے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں کے چلنے میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) بنے گئے، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تم

نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہونے پر پھر پانی اس میں نباتات پیدا کئے، اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلادے

کیونکہ حیوانات کی زندگی اور تولید و تناسل اسی غذائے نبات کی بدولت ہے اور ہواؤں کی (رحمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں رکھ کر اسے کبھی بچھاؤ کبھی گرم ہے کبھی سرد (اور ابر کے دھنچے)

میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید اور معلق رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

## معارف مسائل

توحید کا وسیع مفہوم | ذِالْحَكْمِ الْاِلهِ وَاجِبُ اِنِّہٖ عِتْدَہٗ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی

اس کا ہمسرہ برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہر تحقیق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا

تجزیہ و تقسیم ہو سکتی ہے۔

چوتھے یہ کہ وہ ایک ہی یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی، وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہی گا جب کوئی چیز موجود نہ ہوگی، اس لئے

وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حقیقتیں توحید کے ملحوظ ہیں (جہاں)

اس کے بعد حق تعالیٰ کے داعی حقیقی ہونے پر ٹکونی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے داعی انقلاب اس کی

قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، اگر ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جو ہر سال بنا دیا کہ زمین اور سیال ہونے لگے، اس کی نیچے پر لاکھوں وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے

مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے تھج بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنا اور

اور چلانے والا کوئی بڑا عظیم و خیر اور بحیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں

کا لمبی لمبی مسافت طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اسی مضمون کو فرمایا،

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوْدَ أَمْنٍ عَلَى كَهْمِهِمْ ﴿۲۴﴾

اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دینا

اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کھڑے

رہ جائیں۔

یَسَّاتُفَعُّ النَّاسَ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا

سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں

جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا

کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوڑا

اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمادیے



ارشاد فرمایا:

كَاشَفْنَا بَيْنَ يَدَيْكَ الْغُيُوبَ  
وَأَنَّا نَكْطِئُ دَحَاةَ الْجِبَالِ  
فَتَبْدُلُهَا سَوَافٍ مُّطَوَّيَاتٍ (۱۸، ۱۹)

تین ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا،  
اگرچہ ہم اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا  
برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور  
حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی دھوئیں کے ذریعہ زمین کے اندر تار دیا اور  
پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے  
اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برت کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لا دیا جو  
سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پھیل کر زمین کے اندر قدرتِ ربّی  
پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرتِ کاملہ کے چند مظاہر  
کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے،  
دیکھتے جصاص، قرطبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كُتِبَ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوا أَذْ يَبْرُونَ الْعَذَابَ إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ

ظالم اس وقت کہ جبکہ دیکھیں گے عذاب کی قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝

کا عذاب سخت ہے۔

رابطہ | ادھر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(غداً) تشرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت  
اللہ سے رکھنا ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ  
کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کہو کہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے  
مجھ پر کوئی ضرر چڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار  
حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت درمیان اس کی باقی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین  
مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان  
مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں لے لے قضا یا باعتبار حالت غالبہ کے  
بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت  
کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے  
اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ الٹ سکا  
اور نہ ایسے وقت میں اود کوئی یاد رہا، اور اس مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے  
کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہارا ہوا ہے اور بھی سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے  
سے تراشیدہ معبودوں کا عز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار  
کر لیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ

جب کہ ہزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے جو کہ ان کے پیرو ہوتے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ السُّبُلُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے یہ ہر دیکھا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كُرِّهَ فَتَنَّا بِرَأْيِهِمْ كَمَا تَبَرَّعُوا وَمِنَّا كَذَلِكَ يَكْتُمُ اللَّهُ

لوٹ جانا بل جانا تو ہم ہمیں ہزار ہو جانے لگے جیسے یہ ہم سے ہزار ہو گئے، اسی طرح یہ دکھائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝

ان کو ان کے کام حسرت دلائے گا اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

رابطہ | ادھر پر عذابِ آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سخن کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔



## خلاصہ تفسیر

(وہ سخت عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ ان مشرکین میں سے (وہ لوگ) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہو جاویں گے جو ان کے کہنے پر پڑے تھے اور سب (عوام و عوام) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے وہ ایک تاج تھا و سراسر متبوع تھا وغیرہ وغیرہ اس وقت سب قطع ہو جاویں گے جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور نتیجہ معذرت کے وقت سب الگ الگ پچھا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہدگر مشناخت تک کے منکر ہو جاتے ہیں اور (جب) یہ تاج لوگ (مقبولین کی بطوطا پٹی دیکھیں گے تو بڑے جھجھا دیں گے، اور تو کچھ نہ ہوئے مگر جھک کر ایوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (امثالہ) تو لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تاج ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے صاف (محکما) جواب دے کر) الگ ہو جاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی (کی بد اعمالیوں کو خالی ارباب کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھا دیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو درخ سے نکلا کس نصیب ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خود فی النار ہے)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن مَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُلُوعَ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو شیطان

الطَّيِّطِينَ إِنَّكُمْ لَكُمْ عَنْهُ مُبِينٌ ۝۱۶۹ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالشُّوَرِ وَالْفَحْشَاءِ

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح ۱۶۹ وہ تو نہیں حکم کرے گناہوں کے بڑے گناہ اور جہائی کرد

وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۱۷۰

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

## خلاصہ تفسیر

(بعض مشرکین جنوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعث) ان کی تعلیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الہی اور موجب رضائے حق و وسیلہ تقرب الی اللہ بواسلہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی، حلال

پاک چیزوں کی نسبت اجازت ہو کہ ان کو کھاؤ (برقو) اور ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ کچھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم شیطان کے قدم قدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے وہ کہنے والے خیالات و خیالات سے تم کو خیران ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہیں باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (مشرعاً) بُری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی) تعلیم کرے گا کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

## معارف و مسائل

## حَلَّ اللّٰغَاتِ

حَلَّ اللّٰغَاتِ، لفظ حَلَّ کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی ہو یا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی، حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فراغت ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہو اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

تخلو است، خلوة کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خلوة کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، تخلوات شیطان سے مراد شیطانی اعمال و افعال ہیں۔

الشُّوَرُ وَالْفَحْشَاءُ، سورہ وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سورہ سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبر و جفا ہے، إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ شَيْطَانُكُمْ کہ امر اور حکم کرنے سے مراد دل میں دوسوہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام داخل ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی دوسوہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بُرے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور الہام فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: ساند وغیرہ جو بتوں کے نام پر پھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور عرفاء، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نام زد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا بھی چار آیتوں کے بعد وَمَا أَهْلُ بَيْتِهِ يَخْلُقُ اللّٰهُ کے تحت آنے والا ہے، اس آیت يَا أَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقدس اس فعل کی حرمت و ممانعت ہے کہ



غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حسرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور انکار کرنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بہتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر رکھاؤ، اور اگر ایسی حرکت چہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیست کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو تعلیقاً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور بغض کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

**مسئلہ:** اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے چہالت یا عقلیت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ کتابعداری کرو اس حکم کی چونکہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو باعداری

عَلَيْهِ آبَاءُ نَا وَلَا وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِسْنَاءَهُمْ أَوْ

کرچہ انکی جس پر بچھا ہم نے اپنے باپے ادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپا بے نہ کہتے ہرگز بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِينَ يَبْعُثُونَ إِلَىٰ نَارٍ أَوْ

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہر جیسے بکائے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ تھے سوائے بکائے

وَنَارٍ أَوْ دُخَانٍ يَبْعُثُونَ فِيهِمْ فَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ وَلَا يَشْعُرُونَ ١٥

اور پھونکے کے برے گئے اندھے ہیں سورہ کچھ نہیں سمجھتے۔

**خلاصہ تفسیر** اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر

کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو جواب میں کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختصار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر تو فرماتے ہیں) کیا وہ حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ ان کا باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ کسی آسمانی کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں، وَمِثْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِينَ يَبْعُثُونَ إِلَىٰ نَارٍ أَوْ

کیفیت (دافنی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلائے اور پکارنے کے کوئی (پرہیز) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی) ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات باطل، بہرے میں (مگر یا سننا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کہ کچھ نفع نقصان نظری نہیں آتا) سو (جب سارے ہی جو اس شخص میں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

## معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندس تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو غفلتوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ لَا يَبْعُثُونَ شَيْئًا وَلَا يَسْتَدِينُونَ تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و تفویض شرعیہ سے مستنبط کئے گئے۔

تو وہ جن کے اتباع و تقلید کے حکم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جن عالم کے متعلق یہ ایلینان ہو جائے کہ اس کے پاس مشرک دسنت کاظم ہو اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحتہ قرآن دسنت میں نہ ہوں ان کو تفویض قرآن دسنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور اند مجتہدین اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلیداً متبع مجتہدین کے خلاف کی تقلید میں فرق اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام مشرطی نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آباء کے منوع ہونے



کا جو ذکر جو اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۃ یوسف میں اس طرح آتی ہے:

اِنِّیْ فَرَسْتُ لَیْلَةً قَوْمًا لَا یُؤْمِنُوْنَ  
 بِاِلٰهِیْهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ صٰغِرُوْنَ  
 وَاتَّبَعْتُ لَیْلَةً اٰبَآئِیْ اِیْسٰی هَمْدًا  
 اِسْلٰمًا وَتَعْقُوْبًا (۱۲: ۳۷-۳۸)

میں نے ان لوگوں کی سلت و مذہب کو چھڑ دیا  
 جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے  
 منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آبا ابراہیم  
 اسلمی اور یعقوب کے ساتھ

تیس نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آبا و اجداد  
اسحق اور یعقوب کا۔

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آبار کی تقلید باطل میں حرام ہے، حتیٰ میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام تسترلی نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے:

تعلق قوم بمن والاية في ذم التقليد  
 وان، وهذا في الباطل صحيح اما  
 التقليد في الحق فاصل من اصول  
 الدين وعممة من عظم الماهين  
 يلجاء اليها الجاهل المقصر عن  
 درك النظر  
 (قوليني ص ١٩٣ ج ٢)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تعلید کی بدست میں پیش کیا ہے، اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تعلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حق میں تعلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک متعلق بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملہ سے تعلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو! کھانا پینے کی چیزیں جو روزی دی تم نے تم کو اور مشرک کرد اللہ کا

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْٓ اَنْزِلْتُ إِلَيْكُمْ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَۃَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۶۰

اگر تم اسی کے بندے ہو ، اس نے تم پر بھی حرام کیا ہے مژدہ جانور اور

الدِّمَّ وَلَحْمَ الْخَيْزُرِيِّ وَمَا أَهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ

پرو اور عورتوں سے سو کا اور جس جا نور پر نا پکارا جاتے اللہ سے سو کا اور کیا پھر کوئی ہے اختیار ہو سکے

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٧﴾

دوتا فرامی کر د اور زیادتی تو اس پر کچھ غماں نہیں بیگ اللہ ہی بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر

**خلاصہ تفسیر** | اور پراکلی طبیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح مقصود تھی، آگے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں، اس کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

اے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہو کہ) جو شرع کی رو سے پاک چیزیں تم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (درو) اور (اس اجازت کے ساتھ حکم ہو کہ) حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق جو نامسلم اور ظاہری ہیں وجوب شکر بھی ثابت ہے)۔

**رَبِط** اور پر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مرد اور جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانور دن کو اپنی روٹ سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے کچھ مضمون کی تائید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی مردار (جانور) کو (جو باوجود جب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت (و اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نام پر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص بوقت بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدرت و حاجت سے) تمہادذ کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم کہ ایسے وقت میں یہ رحمت شریانی کر گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھا دیا)



## معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حرام کھانے کی نغوت حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلیہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاگرتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلیہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ (۵۱:۳۳)

اے ہمارے رسولو! اتم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب کہتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)۔

اِنَّهَا حَرَامٌ، کلمہ اخٹاصر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اخٹا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَا آجِدُ فَيْتًا اَوْ حَىٍّ اَوْىٍّ مُّخْتَرًا عَلٰى طَائِفٍ مِّنْ اٰیٰتِہٖ (۱۲۵:۷) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں مجسّر ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہو کہ دوسری آیات قرآنہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت نامہ ہوسکی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہو کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حالت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مگر اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پھل آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اور پر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم جہتنباب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکین کے عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: میتہ (مردار)، خون، لحم خنزیر، وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملائے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہو، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُحِلَّ لَکُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (۹۶:۵) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بناء پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور مڈھی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے مڈھی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی)۔

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور مڈھی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (رحماص)۔

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیردغیر و دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلہ جارح تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: ہندوؤں کی گولی سے شکار ہندوؤں کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں مَوْقُوذٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا۔

مسئلہ: آجکل ہندوؤں کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض ماما، کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارحہ نہیں



بلکہ غارتگری جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، در نہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔  
**مسئلہ:** آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز یا اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔  
 (جصاص، قربلی وغیرہ)

**مسئلہ:** اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علی غلظہ قطعہ کے الفاظ کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم میں اَصْنُوا فَنَافَعَهَا وَابْرَأْهَا وَأَشْفَا رَهَا أَنَا ثَنَا وَمَتَاعًا لِّی جِنَّہ (۸۰: ۱۶) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الا منتفع قرار دیا ہے ذبح کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)۔  
**مسئلہ:** مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

**مسئلہ:** یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں مابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر، ابوسعید خدری، ابو موسیٰ اشعری نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

**مسئلہ:** دودھ کا بغیر پلانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں اَنْفَر کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے۔ اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام عظیم ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسف و محمد اور ثوری وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قربلی)  
 یورپ اور روس کے غیر اسلامی ملکوں سے جو پیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبح جانور کا انفر استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ امام عظیم اور امام مالک کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض غیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ذبح پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

**خون کے مسئلہ:** دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون شامل اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَشْفُوعٌ یعنی پیئے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ ذَمًا مَشْفُوعًا (۱۴۰: ۱۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجھ جیسے گردہ، کلی وغیرہ حلال اور پاک ہیں۔

**مسئلہ:** جب کہ حرام صرف پیئے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح بھرا، مکھی، مکمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے (جصاص)۔  
**مسئلہ:** جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

**مریض کو دوسرے کا خون:** تحقیق اس مسئلہ کی یہ کہ انسان کا خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدل دینے کا مسئلہ سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تعاضل تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا اور وجہ سے حرام ہوا، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی ہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں۔  
 اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل



کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، بجائے  
کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی  
ہو گئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جزو بنتا ہے اور  
شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے،  
اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے  
طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق ہیا کرنا باپ کی  
ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلاوے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر  
اس سے دودھ پلاوے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْزُقُوهُنَّ  
أَجْرَهُنَّ كَمَا لِلْأُمَّهَاتِ

اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دودھ

پلاوے تو اس کو اجرت و معاوضہ دے دو۔  
خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزو انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی  
اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری

میں ہے۔  
وَلَا يَأْتِي بَأْسٌ بِأَنْ يُمْسَخَ الرِّجُلُ  
بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ وَبِهِ لَذَّةٌ

معالگیری، ص ۳۰  
اس میں معافیت نہیں کہ دوا کے لئے کسی

شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا  
بچے میں استعمال کیا جائے۔  
اور مفتی ابن تہامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (مغنی کتاب الصيد ص ۶۱۲)  
اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون  
کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزو انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ  
پاک ہو اور خون ناپاک، توحیدت کی پہلی وجہ یعنی جزو انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ  
رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج دوا کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے  
استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے  
کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری  
حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی  
دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچے گا  
غالب ہوا ان مشروطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نفس بشری کی مدد سے جائز ہے، جس میں غصہ

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحتہ مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو  
یاد دوسری دوا میں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف تھا ہے، بعض فقہاء کے  
نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث تداویٰ بالمحرم میں مذکور  
ہو، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم، اس کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے  
معافیت انسانی کی پیوندکاری، اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

**تحريم خنزير** تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرامت  
خنزیر کے ساتھ لحم کی قید مذکور ہے، امام شریعت نے فرمایا کہ اس لئے فقہاء  
لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، چٹھے سب ہی باجماع  
حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح  
نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی ہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت  
ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف جڑا سینے کے لئے اس  
کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

**مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنُ الرَّحْمٰنِ** چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو  
کی تین صورتیں  
غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں  
اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ  
کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع ائمہ حرام ہے، اور یہ جانور میت ہے، اس کے  
کسی جسٹ سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنُ الرَّحْمٰنِ کا مدلول صریح ہے  
جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا  
خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے  
جیسے بہت سے نادان مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے  
بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ  
صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذکورہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین رفتار نے اس کو بھی  
نااہل پر بغیر اللہ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حاشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلْ مَا تَدْعِي عَلَيْهِ وَيُعْبَدُ  
اللَّهُ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ دُعِيَ

بزرگ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا  
وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا



يَا سَيِّدَ اللَّهِ تَعَالَى حَيْثُ أَجْبَمَ  
الْعُكْمَاءُ تَوَاقُّنَ مُسْلِمًا ذَبَحَ  
ذَبِيحَتَهُ وَفَضَّلَ بَيْنَ بَيْتِهِ  
التَّقَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَاسَ  
مُرْتَدًّا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ

نیز در مختار کتاب الفرائض میں ہے:

ذَبِيحٌ لَعَنُ وَهُوَ الْوَيْلِيُّ كَيْفَ  
كَوْنِ أَحَدٍ قَبْلَ الْعُكْمَاءِ يَنْحَرُّ  
لِأَهْلِهِ أَهْلٌ بِهِ يُغَيِّرُ اللَّهُ وَكُوْنُ  
ذِكْرُ اللَّهِ وَآقَرُكَ الشَّاهِدِ

نام لیا ہوا اس کو کہ ملامت فقہاء کا اتفاق ہو  
کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے  
اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد  
ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا  
ذبیحہ کہلاتے گا۔

کسی امیر یا بڑے کے آگے جانور ذبح کیا  
تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ مالاہل یا بغیر اللہ  
اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح  
اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اور شاہی نے

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مآہل پہ بغیر اللہ کا مدلول صریح قرار نہیں دیا  
کیونکہ وہ ہمیشہ عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی  
نیست کے اس کو بھی مآہل پہ بغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احتسار کے  
نزدیک یہی وجہ احتیاط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذَبَحَ  
عَلَى النُّصُبِ نُصُبٌ اِنْ تَمَّامٌ حَيْثُ رَدُّ كُفَّ جَانِبُهُ، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہو  
یعنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلٌ  
بِهِ يُغَيِّرُ اللَّهُ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مآہل کا مدلول صریح تو وہی جانور ہو  
جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذَبَحَ عَلَى النُّصُبِ (۳۵) کے بالمقابل آیا ہے جس میں  
غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیست سے ذبح کرنا مراد ہو  
اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عندہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر قصد یہاں کرنا  
ہو اور اس یہاں کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت یہاں کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود  
نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جائز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ہیزائی کیے گوشت کا حصول  
ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی ملامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت  
کھا یا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ فقہاء میں آگے ہی وضاحت کی گئی ہے: وَلَوْ ذَبَحَ لِلصَّيْفِ لَا يَحْرِمُ لِأَنَّهُ سَنَةُ الْغُلَلِ  
وَالْكَرَامِ الصَّيْفِ الْكَرَامِ اللَّهُ تَعَالَى. وَالْقَائِدُ أَنَّهُ إِنْ قَدَّمَهَا لِأَكْلِهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنْفَعَةُ لِلصَّيْفِ  
أَوَّلُ لَوْلِيَّتِهِ أَوَّلُ لَوْلِيَّتِهِ وَإِنْ قَدَّمَهَا لِأَكْلِهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنْفَعَةُ لِلصَّيْفِ  
علامہ شامی نے اس کی شرح میں فرمایا: (۲۰۹ و ۲۱۰) مجازاً ثانی، ذبیحہ

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شعیب حکیم الامت)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو سخت سیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

وَجَزَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالْقَبِيحِ  
يَا سَيِّدَ الْمُقْصِدِ بِالذَّبْحِ بَيْتَهُ وَغَلَبَ  
ذَلِكَ فِي إِسْنِخْنَالِهِمْ حَتَّى غَبَرَ  
بِهِ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي فِي عِلَّةِ  
الشَّخْرِ شِمْر (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

عرب کی عادت تھی کہ جن پہلے ذبح کرتا مقصود  
ہوتا ذبح کر کے وقت اس کا نام بلند آواز سے  
پکارتے اور یہ واقع ان میں عام تھا یہاں تک کہ  
اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل مطلب  
غیر ہوا بل کہ لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام سبکی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ  
رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے رباب غالب نے ایک اونٹ ذبح  
کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی  
مَآ أَهْلٌ بِغَيْرِ اللَّهِ پہ میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول  
کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث  
نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ شے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین!  
ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار بھی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار  
ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہلکے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں  
یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ نے فرمایا:

أَمَّا مَا ذَبَحَ لِلذَّبْحِ الْيَتِيمِ فَلَا  
تَأْكُلُوهُ وَلَكِنْ تَكُلُوا مِنْ أَكْبَارِهِمْ  
(تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا  
وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل  
وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیست تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا  
نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیست تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مآہل پہ بغیر  
اللہ کے حکم میں ہو، دوسرے آیت وَمَا ذَبَحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔  
تیسری صورت یہ ہو کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری ملامت لگا کر تقرب الی  
غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے  
کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جائیں، یہ جانور مآہل پہ بغیر اللہ اور مآہل پہ  
عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کبیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہو،  
اور حکم ان کا یہ ہو کہ یہ نعل تو بعض مسترآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ تَحْتِهَا



وَلَا تَسْكَبُ عَلَيْهِ (۴۳:۵) میں انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا ملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے غلط عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔ اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر لگانے وغیرہ اپنے نزدیک وقف کر کے چڑھتے ہیں، ہندو کچھ پکار پکارتے ہوئے جو چاہیں کریں، یہ ہندوؤں کے بھاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یہ اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں، کہ بکرا، بامرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے تجارین کو خستیاں دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ ان جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا حلال ہے۔

**نذر غیر اللہ کا مسئلہ** یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہار نے اس کو بھی اشتراکِ قلت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مٹا ڈھلایا، یہ یَعْبُدُونَ اللہ کے حکم میں مسترد دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بچے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر ارا ترق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص شرعی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

**اضطرار و مجبوری کے احکام** آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم ہشتمی مذکور ہے فَتَمِنَ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاطِلٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِشْرَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوفٌ رَحِيمٌ اس حکم میں اتنی آسانی کر دی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو اور نہ قد بضرورت سے تہاد ز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی

اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ میں بڑے غفور و رحیم۔ اس میں مضطر کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اشتداد یا گیا ہے۔

مضطر، شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی جان خطرہ میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی ہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

**اہم فائدہ** یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھالے کو حلال نہیں منسرمایا، بلکہ لَا إِشْرَ عَلَيْهِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف ہستثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف ہستثناء پر اکتفا کر دینے کے بجائے لَا إِشْرَ عَلَيْهِ کا اضافہ فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالت اضطرار میں دوا کے آیت مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ حرام چیزوں کا استعمال جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیزوں کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارہ سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں،

اول یہ کہ حالت اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا حکم نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں ہستثناء اُسی وقت ہی جب کہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو، تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو قلم حرام گوشت کا کھالینا عادتاً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفاء یقینی نہیں تو اس دوا حرام کا استعمال آیت مذکورہ کے ہستثنائی حکم میں داخل نہ کر جائز نہیں ہوگا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں، کہ اس کے



استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔  
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ  
ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء است  
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو  
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت  
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

بغیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن  
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احجامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی  
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر  
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اد پر مذکور ہو میں حرام دوا کا استعمال جائز  
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان  
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،  
وہ واقعہ عروبتی کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویات کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے  
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،  
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام  
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا  
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری  
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی لبر | ترجمہ میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہو  
اختلاف فی التداوی بالمحرم و | حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے  
ظاہر المنہب المنہب کما فی | میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف  
ثم و ههنا عن العادی قيل  
بیرخص اذا علم فيه الشفاء  
ولم تعلم داء اخر كما رخص  
فی الخمر للعطشان و عليه  
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر  
ص ۳۵۵ ج ۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ جو لرائق کتاب  
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر  
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی  
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما  
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں  
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس  
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۃً  
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ  
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ  
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں  
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط  
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الصَّلَاةَ بِالْهَدْيِ وَالْعَلَا

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خریدنا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دردناک پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا



استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔  
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ  
ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت  
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو  
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عارضہً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت  
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

بغیر اضطراری حالت میں عام علاج و اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن  
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احجامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی  
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر  
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اد پر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز  
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان  
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،  
وہ واقعہ عروبتی کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویات کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے  
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،  
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام  
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا  
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری  
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی لبر | ترجمہ میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہے  
اختلاف فی التداوی بالمحرم و | حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے  
ظاہر المنہب المنہب کما فی | میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف  
ثم و همنا عن العادی قیل  
بیرخص اذا عیلم فیہ الشفاء  
ولم یعلم دواء اخر کماتخص  
فی الخمر للعطشان و علیہ  
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر  
ص ۳۵۵ ج ۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ جو لرائق کتاب  
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر  
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی  
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما  
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں  
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس  
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عارضہً  
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ  
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ  
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں  
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط  
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتُرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لپتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَكُونُ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الصَّلَاةَ بِالْهَدْيِ وَالْعَلَا

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خریدنا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۝ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دردناک پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا



الْكِتَابَ بِالْحَقِّ، وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ

کتاب بھی، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بے شک ضد میں

بَعِيدٌ ﴿۱۷۱﴾

دور جا پڑے

**خلاصہ تفسیر ربط آیات** | اس سے پہلی آیات میں ان حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے تمام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شمر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لیکر ان کے مطلب کے موافق غلط فتوے دیدیتے تھے، اور توراتیت کی آیات میں تعریف کر کے ان کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امتیاز مجاہد کے علماء کو بھی تنبیہ ہو کہ وہ ایسے اعمال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

**دینِ فروشی کی سزا** | اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیمن ہوئی کتاب (کے مفاد) کا اخلاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں دنیا کی (منازع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگٹھے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ توفیق میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (عناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی، یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور آخرت میں (مغفرت چھوڑ کر عذاب (سربریا) سوزش) آتش کی ہمت کو) دوزخ میں جانے کے لئے کیے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (دوراز) کی خلاف (ورزی) میں مبتلا ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

## معارف مسائل

**مسئلہ:** آیات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکیم شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگٹھے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالی حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی

اگرچہ اس کا آگ ہوا دنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجاتے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکي کچھ یہی نہیں کہ تمہارا اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ

لیکن بڑی نیک تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور

وَالنَّبِيِّنَ، وَآلَى الْمَالِ عَلَى حَبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

سب کتابوں پر اور یتیموں پر اور غنیمت کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو

الْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ، وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ

محتاجوں کو اور مسکینوں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں پھرنے میں اور قائم رکھے

الصَّلَاةَ وَآلَى الزَّكَاةَ، وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا

نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں،

وَالصَّادِقِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ

اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت بھی لوگ

الَّذِينَ صَدَقُوا، وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۲﴾

ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار (۱۷۲)

**ربط از بیان بستران** | شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۃ بقرہ،

زیادہ دوسرے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب اول قرآن

کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فسقوں کا ذکر

کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولادِ ابراہیم علیہ السلام پر افعامات و احسانات کو

ایوانِ نبی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیان فرمایا، وہاں سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفحہ

دومہ کی بحث پر ختم کیا۔ پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی



بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ دی، اور غمنا کوئی خطاب مسلمانوں کو ہر جانا اور بات ہو۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۃ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، مگر غمنا غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور غمنا غم سورۃ تک چلا گیا ہے جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ہے، لفظ پر کبھی الباء۔ عربی زبان میں مطلق تفسیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اول آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایثار مال و دقا، عہد و صبر، ایمان و غیرہ، جس میں شرعی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیوں کہ شریعت کے کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگئے اس پر کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یتیم و یتیم و نکاح و عدت و قہر و نکاح و ذکر جہاد، و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملات بیع و شراء، و شہادت بقدر ضرورت بیان نہ کرنا، و بعد رحمت و مغفرت پر ختم فرمادیا، سبحان اللہ، کیا بلیغ تر قریب ہو پس چونکہ ان مضامین کا حاصل پر کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب الیٰز رکھا جاوے تو نہایت زیادہ ہے، واللہ اعلم۔

## خلاصہ تفسیر

**ابواب الیٰز** کہ سارا کمال اسی میں نہیں آگیا، کہ ہم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو کر لو، لیکن اصل کمال قرآن ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آئے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی) کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، اور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں، اور (سب) کتب (سمادیہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے عاجتہ) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) اگر دن چھڑانے میں (بھی) مال خرچ کرتا ہو، اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) نزلت بھی ادا کرتا ہو اور جو شخص اس رکاز ان عقائد و اعمال کے ساتھ اپنے خلاق بھی رکھتے ہوں کہ اپنے عہد دل کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے) معرکہ (قتال) (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں) یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (رہے) جاسکتے ہیں (غرض اصل مقاصد کمال و کمال کے یہ ہیں نماز و کسی سمت کو منہ کرنا اپنی کالات مذکورہ میں سے ایک کمال خاص یعنی اقامت صلوٰۃ کے قواعد اور شرائط میں سے ہو، اور اس کے جس سے اس میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا،

## معارف مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں جب جوئی کی فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و غضب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق چہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جهت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہو گئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل پر اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جائے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جهت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعت کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہو جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلہ ربط آیات بیان ہو چکا ہے، کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہوا، جو جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین



کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکام اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بعترہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آ گیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر متن اَمَّنْ بِاللّٰهِ میں مفصل آگیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر قرآنی اَلَّذِي كُنَّا نَعْبُدُ آگیا، پھر معاملات کا ذکر اَلْمُؤْمِنِينَ بِعَقْدِهِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر اَلصَّابِرِينَ سے کیا گیا، آخر میں بنیاد پاک بچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے ایسے اشارات ہیں، مثلاً مال کو حشر چ کرنے میں عَلَّیٰ حَتَّیٰ کی قید لگا دی، جس میں مین احتمال ہیں، ایک یہ کہ حَتَّیٰ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کا مل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس حشر چ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا حتمال یہ ہو کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ آئی میں جو اس کا مصدر یا تیار مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو یا نہ ہو کہ حشر چ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دکھ رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تمینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پر نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے،  
 کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے  
 اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

فائدہ جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً دوستی، قربانی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے

ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد أَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ کا ذکر بھی

اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے **وَالْمَوْفُوقِ** صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایفاء عہد کی عادت دانی ہو چکا، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کا فرنا جہر بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں

اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفاءے عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایفاءِ معاہدہ ہے۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحُرُّ

اے ایمان دار فرض ہوا تم پر قصاص، برابری کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۚ الْأَنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جسکو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف

فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَأَدَّاءُ الْيَمِينِ بِإِحْسَانٍ ۚ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ

کچھ بھی توابعاری کرنی چاہئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو غول کے ساتھ یہ آسانی ہوئی

مِّن تَرِيكُمُ وَرَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۚ فَمَنْ أَعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ

تہا کہ رب کی طرف سے اور ہر بانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہر عذاب

أَلِيمٌ ۚ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ ۚ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

درذناک، اور تمہارا واسطہ قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿۱۶۹﴾

بچتے رہو۔

## رابط آیات اور خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیک اور غول کے اصول بتلا دیئے گئے ہیں، آگے ان کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو اب آج ہر کہا جاسکتا ہے، آگے انہی ابواب الہر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

اے ایمان دارو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین

حکم اول قصاص (بقتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی کو قتل کیا جائے ہر

(دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض

میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گویہ قاتلین بڑے

درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب برابر قصاص لیا جائے گا، یعنی قاتل کو

سزائیں قتل کیا جائے گا، ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (معتدوم) کی طرف سے کچھ معافی

ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو اس سے سزا سے قتل سے تو بڑی ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونیہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارث مقتول کے ذمہ تو (معتول طور پر) اس مال کا مطالبہ کرنا کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانون دیت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزائیں) تخفیف پر اور (شاہانہ) رحم ہے (ورنہ بجز سزا سے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جمع کیا یا اشتباہاً میں دعویٰ قتل کا کر دے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو رخصت (میں) بڑا دردناک عذاب ہو گا، اور فہم لوگو اس قانون، قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بگاڑ ہو (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکاب قتل سے ڈریں گے، تو کسی جانیں بچیں گی)، ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

## معارف مسائل

قصاص کے لغوی معنی ممانت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے، فَاَعْتَدْ لِّوَاغِدِكَ بِبِئْسَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي رَحْمَتِنَا ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ (۱۶۹:۲) اور سورۃ نمل کی آخری آیات میں وَرَبِّكَ أَكْبَرُ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي رَحْمَتِنَا ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ (۱۶۹:۲) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اس لئے اصطلاح شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں سادات اور ممانت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ: قتل عمدہ کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پرست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جائے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ: ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہو ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد کی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔



آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

ان کے جابلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے آیت نازل ہوئی **الْحُرُّ بِالنَّحْرِ وَالْعَبْدُ بِالنَّعْلِ وَالْأَنْثَى** **قانون اور قصاص کے مسائل**

غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کوئی مرد قتل کرے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو اس سے قصص نہیں لیا جائے گا، مشرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں **الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ** اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً **الْقَتْلُ بِالنَّفْسِ** وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قاتل عہد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جائے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دوست تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو مزائے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف

ذکر نے والے کو نصف دیت (خونیا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خوں بہا شریعت میں سوانٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے مردہ و ذل کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۲۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خوں بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بھٹا وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہو تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی اولیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونیا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکیم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کسی صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جستجبات بھی رقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علماء امت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

**كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا**

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوٹے کچھ مال الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف وحققاً علی دیت کرنا ان اپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

**الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَكَ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى**

پرہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ اپنی پر



الَّذِينَ يَبْدِلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۲﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَثْوًى

ہے جنہوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۔ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ

والے سے طرفداری کا پائناہ کا پھراں میں ! ہم صلح کرائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۳﴾

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہو

## رَبِطُ آيَاتٍ وَخُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

حکم دوم از ابواب البر وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت ، لیکن عورت میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

خیر، لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے، وَقَدْ أَنْذَرْتُ الْخَيْرَ لَشَدِيدٌ (۸۱:۱۰) اس جگہ اتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حقے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہو رہا ہے۔

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ بٹلا جائے (اس کا نام وصیت ہی) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری دیکھا جاتا ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت

کو سنا ہو ان میں سے) جو شخص (یعنی ان) لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سننے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور احمق در ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں ایک طرح کی

تبدیل کی امانت بھی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے وصیت کے بارے میں کسی غلطی کی یا (تصدیقاً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا دفرع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کر لے (مگر وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہو) تو اس شخص پر کوئی بار گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور دیکھنا کہ پرہیزگار مرنے والے ہیں اور اس شخص نے ترکہ کو گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہو، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

## مَعَارِفُ مَسَائِلِ

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہو جو کچھ مال چھوڑ کر رہا ہو اس حکم کے عین جسز ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حقے مقرر نہیں ہیں، ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔ تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تراکض صوابہ و تابعین کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا، ابن کثیر نے تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی وَلِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴:۴) اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہو، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص، قرطبی) یہی باطل است یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص، قرطبی) یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باطل است منسوخ ہے، اور نسخ اس کا وہ شدت و اثر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع



کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ  
فَلَا وَصِيَّةَ لَوَاسِثٍ، اُخْرَجَ  
الْمَرْمِزِيُّ وَقَالَ هَذَا حَدِيثٌ  
حَسَنٌ صَحِيحٌ

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا  
حق خود دیا یا ہو، اس لئے اب کسی وارث  
کے لئے وصیت جائز نہیں۔

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:  
لَا وَصِيَّةَ لَوَاسِثٍ إِلَّا أَنْ  
تُحْيِيَنَّهَا أَوْ رِثَتَهُ  
(جصاص)

کس وارث کے لئے وصیت اس وقت  
تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث  
اجازت نہ دیدیں۔

اس لئے ماہل اس حدیث کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود معتمد  
فرمادیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت  
کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے  
امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہ سے منقول ہے، اور فقہاء  
امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت شریعت کا  
نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقیناً طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر، مشہور وغیرہ  
میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے،  
اس لئے اپنی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں، پھر مندرجہ  
کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے  
سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہ  
اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے،  
ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر  
اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک ہتھالی  
مال سے زیادہ کی جائز نہیں

باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت  
سے ایک ہتھالی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت  
جائز اور قابل قبول ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے  
مسئلہ: خود معتمد کر دیئے ہیں ان کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ ہر وارث  
اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے  
وصیت کرنے کی اجازت ایک ہتھالی مال تک ہے۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے مت و مکہ  
مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب  
ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت  
واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں  
کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے  
پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک ہتھالی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی  
میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

انہوں پر تاکہ تم پر ہمیں شکر ہو جاوے، چند روز ہیں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو ان پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ مِّنْ طَعَامٍ مِّسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کون خوشی سے کرو

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ

نیکی تو چھاؤ اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

سمجھ رکھتے ہو۔



## خلاصہ تفسیر

**حکمِ صومِ صوم** اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے راتوں کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس طرح پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ تقویٰ بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پختگی بنیاد کو تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہی، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ جو شخص تم میں (ایسا) پیار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہو، اور بجائے رمضان کے (دوسرا ایام کالاتناہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے، اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہو تو) ان کے ذمہ صرف روزے کا (فدیہ یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے، اور جو شخص خوش سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور (جو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہو، لیکن) تمھارا روزہ رکھنا اس حالت میں بھی (زیادہ بہتر ہے) اگر تم کچھ روزے کی فضیلت کی، خبر رکھتے ہو۔

## معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی رکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رکنے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلبہ صوم سے صاف رہے نہ کر غریب آفتاب تک مسلسل رُک رہا ہو، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غریب آفتاب کے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھانی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عہد اور شعائر قرار دیا گیا ہو، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

**پچھلی امتوں میں روزہ کا حکم** روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تھا جسے ساتھ خاص نہیں، پچھلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوتی، اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہو، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات یہ کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ بالکل معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی) قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ قُلُوبَهُمْ** عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مَنْ قَبِلَ كَفَّ** سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہو، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے ارتقا کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا، کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں منسرق ہوتا رہا ہے (روح)

**تَعْلَمُ تَعْلَمُونَ** میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک مکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

**مريض کا روزہ** **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا** مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قری اندیشہ ہو، بعد کی آیت **وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِكُمُ الْمَالَ** میں اس طرف اشارہ موجود ہے، مہجور فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

**مسافر کا روزہ** **أَوْ عَلَى سَفَرٍ** یہاں لفظ مسافر کے بجائے علی سفر کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ **سَفَرٍ** کا مفہوم یہ ہے کہ



وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس یا پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین سہاروں یعنی وہ مسافت جسکو پیادہ سفر کرنے والا آسانی تین روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور ان کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ علی سقی سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کر کے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ علی سقی نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔ مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ علی سقی کی حالت میں ہے۔

**روزہ کی قضا** **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مریض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا مان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے **قَوْلُهُ الْقَضَاءُ** کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** سے مراد اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر معتمہ ہونے کے بعد اتنے دنوں کی ہمت پائے، جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن کے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیت فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھو یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیاری ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ **قَوْلُهُ يَوْمَ آيَاتٍ أُخْرَى** میں اس کی گنجائش ہے۔

## روزہ کا فدیہ

**وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ** اس آیت کے بے شکست معنی وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، مگر جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا **وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ**، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔ یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جو ہر صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، منظری)۔

یحییٰ بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ** نازل ہوئی تو ہمیں خستیاں دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینہ میں تین روزی اور ایک روزہ یوم عاشوراء یعنی دسویں محرم کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی، گنتی **عَلَيْكُمْ الْيَقِيَامُ** تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو خستیاں دے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل فرمادی، اس آیت نے متندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت



أَجِينَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفِثُ الَّذِي نَازَلَ مِنْهُ مَا كَرِهَ آسَانِي عِلَّا فَرَادَى كَرِهَ دَلَّ كِي صَح  
صَادِق تَك كَمَا نَا بِنَا وَغَيْرِهِ سَب جَائِزِ هِيَ، سَوَكْرَ أَتُخَنَ كَعِ بَعْدَ سَحَرِي كَحَانِي كُوَسْنَتِ فَنَارِ  
وَيَدِيَا لِيَا، صَحِّجَ بَخَارِي، سَلَمَ، ابُو دَاوُدَ فِي هِي اس مَضْمُونِ كِي احَادِيثِ آتِي هِي (ابن كثير)

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہو، نصف  
فدیہ کی مقدار اور  
متعلقہ مسائل

کو مالکانہ طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مجتہد مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں ہو۔

مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو  
ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بجزاز قنیہ نقل کیا ہے  
اور بیان اہل تہران میں اس کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل  
کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ  
میں ہے کہ احتیاطاً اس میں ہے کہ کسی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے  
میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے  
مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور  
دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

ہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطہ لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیل روشن راہ پلنے کی اور حق کو باطل سے مجتہد کرنے کی سو جو کوئی پائے تم میں سے اس ہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور فستے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرتی چاہئے اور

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلَا يُكَلِّمُ الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِيُكَلِّمُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵﴾

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

## خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایام صیام  
اد پر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں  
کا بیان ہے۔

دو تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے، ماہ رمضان ہی جس میں ایسی برکت ہے کہ اس  
کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں، قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسان دنیا پر) بھیجا گیا ہے،  
جس کا ایک (وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ  
ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالة ہے، اور ان دونوں وصفوں میں

مجموعہ ان کتب (ساویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ ہدایت  
(بھی) ہیں اور (وضوح دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں،

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو  
اوپر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اہل قانون تھا وہ البتہ

اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضرب ہو) یا  
(شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان

کے) (دوسرے ایام کا) راتنا ہی (شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے) اللہ تعالیٰ  
کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مستحب

کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں یکساں آسان قانون مقرر کر دیا، اور تمہارے  
ساتھ احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام بخوبی کر دیتے) اور

یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور  
کبھی شرعی عذر سے وہ جاوے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ

(ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ قراب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا  
حکم اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک

ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و منکرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا  
واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر قراب حاصل کرتا، اور (عذر سے خاص رمضان

میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی) تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر  
اداکر دو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)



## معارف مسائل

اس آیت میں پچھلی جمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں آیاتاً مَعْفُودٌ ذُو سَبْتٍ کا لفظ بھل ہو جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت دائرہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سا بن دیا پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تینیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں مشرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شقیہ تھی اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۳ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور اللہ ہی عربی لغت میں ہیمنہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے ہیمنہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے ہیمنہ کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے ملحوظ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گذر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، توہید لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، قرآنوں نے ایک چثیت سے ماہ رمضان بمثلت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا ان کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت روزہ معاف ہے، الہتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بمثلت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پایا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہو کر جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آٹھ کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعاً عین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابرو وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلے روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ



اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہر یعنی رمضان کا پالینا صادقاً نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی مانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور استہباس نہ پیدا ہو جائے (رجصاص)

**مسئلہ:** جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا معنی یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض نہیں ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوئی اور قبائی وغیرہ نے نماز کے متعلق قرآسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہوجاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں دشائی، اس کا معنی یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُرْكِبًا أَوْ عَلَى شَيْءٍ يَتَّقِي أَيَّامَ الْحَجِّ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے ذبیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہوگئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۚ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے بد چھین میرے بندے مجھ کو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا

إِذَا دَعَا ۚ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۸۶﴾

جب مجھ سے دعا مانگے تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ ایک راہ پر آئیں۔

## خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پچھلے تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر و نشر اور اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیان جملہ ترغیب دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّمَا شَرَعْتُ فِطْرًا دَعَا ۖ

مُسْتَجَابَةٌ (ابوداؤد طحاوی)

یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔

اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور ولے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور (تو میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں اور یا استثناء نامناسب درخواست کے منظور کر لیتا ہوں (ہر عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست ہے، سو جس طرح میں اُن کی عرض عرض کر منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے حکم ہونے پر اور رحمت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہو کہ وہ لوگ رشد و فلاح حاصل کر سکیں گے۔

**مسئلہ:** اس آیت میں (إِنِّي قَرِيبٌ) فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا مانگنا آسان اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، ابن کثیرؒ نے آیت کا شان نزول بھی ذکر کیا ہے کہ کبھی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہو تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور وہ تو بلند آواز سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔



أَحِلَّ لَكُمْ كَيْلَ الصَّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ مَا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہو کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مِمَّا كَتَبَ

سرمحلت کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہو

اللَّهُ لَكُمْ مِمَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ وَأَشْرُ بُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لئے اور کھار اور بوجہ تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصَّيَامَ إِلَى الْاِيلِ

سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک

وَلَا بَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں ہوئی ہیں اللہ کی

فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اس طرح بیان فرماتا ہو اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچے رہیں

## خلاصہ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں

سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا اور پہلے جو اس سے مانعت تھی وہ موقوف کی گئی (کیونکہ بوجہ قرب و اتصال

کے وہ تمہارے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہیں اور تم ان کے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہو، اللہ تعالیٰ

کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس علم انہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب

تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت نسمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

رجب اجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہو

(بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہو

اسی طرح یہ بھی اجازت ہو کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک

کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے)

تو پھر (صبح صادق سے) رات (آگے) تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے

کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

حکم پنجم اعتکاف اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (دشوہت کے ساتھ) مت ملنے

دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ) مسجدوں میں

(ہوا کرتا ہے) یہ سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (بچنا تو کیسا)

بچنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح

اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کے) واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس

امید پر کہ وہ لوگ احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

## معارف و مسائل

أَحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ

اس سے پہلے حرام تھی، صبح بخاری وغیرہ میں بروایت براہ بن عازب مذکور ہے کہ ابتداء میں

جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو انظار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ

اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب

چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرام کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاری

دن بھر مزدوری کر کے انظار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے

کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے بھوکے بچوں کی وجہ سے

ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا،

دو پہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہ شہرے کے بعد اپنی بیبیوں

کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی

جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات

میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ ذکر اٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے



کے بعد آخر شب میں حسری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

روزے کے لغظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن باتفاق امت اس جگہ اس سے مراد چھٹا شہرت احکام شرعیہ کے لئے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، قول رسول کریم ﷺ کی تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے، لہذا وہ احادیث اس آیت کے حکم کی قرار دیکر منسوخ کیا اس آیت میں پہلے حکم کو حکم ابی تشرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

تحقیق یتبیین نکھڑ الحقیظ الکاتبین، اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے تحقیق یتبیین کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کر دو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے بعد جو کھانا پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، حسری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرام کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پردائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اذان سنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک اہل اتم بکھڑا کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوع صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے اتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھانا پینا جائے تو معتاد نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن ام بکتوم جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ تشران کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا یقین پر اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نص تشران کی خلاف ورزی ہوا صحابہ کرام اور اسلاف امت سے جو افطار و سحری مسابقت کی روایات منقول ہیں ان سب کا عمل نص تشران کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ یقین صبح صادق سے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نص تشران کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے (اسی آیت کے اخیر میں) تِلَاقُ لَحْنٍ ذِکْرُ اللّٰهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَؤُہَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو چشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا لگے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقین نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھالی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔



امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلے اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

**اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی** کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ لغظ فی المساجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

**مسئلہ:** روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

**مسئلہ:** اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بھٹکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

**آخر آیت میں یَلْقَىٰ حَذْرُ اللَّهِ** فَلَكَ تَقَرُّ بَوَّهًا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور ہل انگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں باحتیاج اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (باطل)، اور تم کو معلوم ہے۔

## ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر آ جائے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

**حکم ششم، مال حرام سے بچنا** اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باحتیاج مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

۱۔ میں اسے لوگوں کا دوزخ میں سے ہے جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر چلے گا کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ



امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

**اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی** کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے۔ لغظ فی المساجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آباؤ مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

**مسئلہ:** روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

**مسئلہ:** اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بھٹکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

**آخر آیت میں یَلْقَىٰ حَذْرُ اللَّهِ** فَلَكَ تَقَرُّ بَوَّهًا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور ہل انگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں باحتیاج اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (باطل)، اور تم کو معلوم ہے۔

## ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر تا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

**حکم ششم، مال حرام سے بچنا** اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باحتیاج مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

۱۔ میں اسے لوگوں کا دوزخ میں سے ہے جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر چلے گا کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ



اور سورۃ نمل آیت ۱۴ میں ارشاد فرمایا۔

كُلُّوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا  
طَيِّبًا وَتَشْكُرُوْا فِعَمَّتِ اللّٰهُ اِنْ  
كُنْتُمْ لَآيٰةً تَعْبُوْنَ ۝

یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے  
ملال اور پاک اور شکر کرنا اللہ کے احسان  
کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

کسب مال کے اچھے برے ذرائع  
اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدار زندگی ہونے پر  
ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے،  
اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے

کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور منوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی  
دنیا بُرا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں  
نہیں، اور ہر بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور  
پورا عالم انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو  
رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا اختیار ہو  
تو جو لوگ اس کا قانون بناتیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے  
وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔  
اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہو کہ وہ بھی  
ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ قانونی نا انصافی انجام کار  
جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظام معاش ہی شریعت اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بنایا، اگر وہ حشر و وحی الہی  
دنیا میں قائم کر سکتا ہو، اسے ہی اس کے مستفاد اور وہی ایک ایسا معقول فطری و جمیع قانونی جو ہر قوم و ملت  
اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور اس میں عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانون الہی میں قابل  
اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے  
ہوا پانی، خورد و گھاس، آگ کی حرارت اور غیر ملوک جنگلات اور غیر آباد زمینیں جی جنگلات کی پیداوار  
وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں  
کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدل کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں  
ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت  
کا قانون جہاں ہے، اور پھر انتقال ملکیت کا جہاں اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ کوئی  
انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو جمع و افراد میں  
مقبول کر دے، انتقال ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا  
وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو  
ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال  
نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی فوجت آئے۔

یہ اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی  
ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعت اسلام میں جتنے معاملات ہل یا  
فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہ مذکور ہیں کسی وجہ سے  
خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے،  
کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ  
میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ  
کے لئے مضرب ہیں، ان کے نتیجے میں چند افراد پلتے پڑتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے،  
ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف  
ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر مادی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَكُنْ مِنَ الْاَخْسَارِ  
بَيِّنَاتُ الْاِثْمِ طَلِيلٌ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابل  
غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں آمْنًا اَلْكُفْمَ آیا ہے جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جس  
میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کہیں دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور  
کر دو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال  
سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچاؤں گا اس کا اس وقت بھی  
ایسا ہی احساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں  
کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے  
مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف و حقیقت  
اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اس شیا ضرورت میں ملاوٹ  
کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے  
کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ  
ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ



کر کے زائد حاصل کرنے، دوسرا آدمی وہ ہے اس کی جیب نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہوا یہ بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہو، چوری اور ڈاکہ بھی جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام مروج فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ منکرین کی رضا مندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی خدمت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی ممانعت مذکور ہو، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہو، خواہ کھانی کو باپس کر دیا دوسرے طریقے کے ہستال سے، مگر محاورات میں ان سبب کے ہستالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پر لینے کے لائق نہ ہو۔

**شان نزول** آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام میں سے دو صحابہ کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، معتزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گولہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کر کے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت ان کو یہ آیت سنائی: **إِنَّ أَوْلَىٰ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ يَمْلِكُ اللَّهُ يَخْطُبُ إِلَيْهِمْ وَأَيُّهَا زَيْدُكُمْ قَسَمْتُ لَكُمْ**، جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی، درود المعانی

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلولے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: **وَلَا تَكُونُوا يَدُوعًا إِلَىٰ الْحُكَامِ لِيَأْتَاكُمْ بِأَمْوَالِ الْبَاطِلِ بِأَلْسِنَةٍ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی معاملہ کی بناء پر اس چیسز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ  
إِلَىٰ وَتَعْلَىٰ بَعْضُكُمْ أَنْ يَكُونَتْ  
الْعَدْلُ بِحُجَّتِهِ مِنْ تَعْلَىٰ فَاقْبَضُوا  
لَهُ عَلَىٰ تَعْلَىٰ مَا أَسْتَمُ مِنْهُ فَتَعْلَىٰ  
فَقَضَيْتَ لَهُ بِبَيْنِ بَيْنِ حَقٍّ آخِيهِ  
فَلَا يَأْخُذُ بِهِ قَائِلًا أَقْطَعُ لَهُ  
يَقْلَعُهُ بَيْنَ النَّاسِ (رواه البخاری  
ومسلم عن ام سلمة)

”ببین میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زبان رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو زیادہ کچھ حقیقت حال تو مجھ کو معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہوتا اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی معاملہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کرے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص جھوٹ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور عظیم و خیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فیخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فیخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلولے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

**مال حلال کی برکات**  
اور حرام کی نحوست  
حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اپنا بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاق حمیدہ اور



اعمال صالحہ کا صدور شکل ہوا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ مَنَعُوا آلَكُمْ الْخَبِيثَاتِ  
وَأَعَمَّتُوا أَصْلَابَهُنَّ لَئِي لَا يَمَازُجَنَّ  
عَلَيْكُمْ (۵۱: ۲۳)

”یعنی اے گروہ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں  
کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال  
کی حقیقت سے واقف ہوں“

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال صالحہ کا صدور وجہ ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کر ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرما دیجئے کہ میں مستبول الدعاء ہو جاؤں جو دعا کیا کروں قبول ہو کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا، لو، تنجیب الدعوات ہو جائے گا، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مال حرام کما لے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی چیز سے بڑے عمل کو نہیں پسند دھرتے، ہاں اچھے عمل سے بڑے عمل کو دھرتے ہیں۔

مشرقی ہر انسان کا پنج ہم سنا اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا تَزَالُ قَدْ مَا خَلَقَ يَوْمَ آفِيَا مَسِيحًا  
خَلَقَ يَسْأَلُ عَنْ أَمْرِهِ عَنْ عَمَلِهِ وَفِيْنَا  
مَا كُنَّا وَنَحْنُ مُشَابِهَةٌ فِيْنَا أَبْلَاكَ  
وَعَنْ تَالِيَةِ أَمْنٍ اَلْتَسْبِيْهِ وَفِيْنَا  
اَلْنَعْمَةُ وَعَنْ عَمَلِهِ مَا ذَا عَمِلَ  
فِيْنَا (البيهقي، ترويض)

”قیامت کے روز محمدؐ میں کوئی بندہ اپنی  
جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے پکار  
سواں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے  
اپنی عمر کس کام میں فنا کی اور میرے یہ کراہی  
بولی کس نفل میں براد کی، تیسرے یہ کہ اپنا  
مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے  
یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعت مہاجرین، پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق فیس اللہ تعالیٰ ہے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلنے لگے تو ان پر طاعون اور وبا پڑے اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کئے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر انجس دشمن مسلط فرما دیتے ہیں، جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے ارباب اقامت دار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو

عہ معنی روایات میں ہاں لکھا ہے اس میں مال کے دو سوالوں کا ایک ایک اشارہ ہے



اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دینے میں مدد دیتا ہے، روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے۔  
اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں  
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ كُلِّ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ مَا وَكَّلَ

تجہ سے پوچھتے ہیں حال تھے چاند کا کہہ دے کہ میادقات مقررہ ہیں لوگوں کو واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبُرْيَانِ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مِنَ الْتَقَىٰ وَ

بیکر نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

اَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا سَوَاءٌ لِّلّٰهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿١٤﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَفْقَهُوْا تِلْكَ اٰيَاتِ اللّٰهِ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو بیشک

اللّٰهُ لَا يَحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ ﴿١٥﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو، اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور

اٰخِرُ جَوْهَرٍ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِشَّةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچنا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہو

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ حَرَامٌ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

فَاتِلُوْكُمْ فَاَقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ ﴿١٦﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مار دو یہی ہے سزا کا فسردوں کی۔

رَبُّ اٰیَاتٍ اٰیَاتِ لَیْسَ الْبِرَّ الْغَنَمُ بِلَا عِلْمِ الْغَنَمِ بِلَا عِلْمِ الْغَنَمِ

ابواب البر کا بیان ہو گا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورہ صدر در آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے محکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہو گا۔

لغاست: اہلہ، ہلال کی جمع ہے، قمری مہینہ کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، مواقیت، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منہیات وقت کے آتے ہیں (ذاتی)

## خلاصہ تفسیر

حکم ہفتم، اعتبار حساب (یعنی آدمی، آپ سے ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی)

حالت را اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ کی تحقیقات کرتے ہیں

قمری درج و غیرہ آپ فرما دیجئے کہ فائدہ اس کا یہ ہو کہ وہ چاند اپنے اس گھٹنے اور

بڑھنے کے اعتبار سے لڑ دیا یا سہولت (آلہ مشناخت اوقات ہیں لوگوں کے اختیاری معاملات

مثل عدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ)

کے لئے۔

حکم ہشتم، اصلاح رسم جاہلیت (بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی

ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع

جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل

کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں

کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی

شخص حرام (چیسروں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے

اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ،

اور (اصل الاصول تو یہ ہو کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) امید ہے کہ تم راہیں

میں کامیاب ہو۔

حکم نہم، قتال کفار (رذی فعدہ سلسلہ ہجری میں حضور صل اللہ علیہ وسلم اوائے عمر کے

قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے آئے وقت تک مکہ معظمہ میں

کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صل اللہ علیہ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ

کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ







مُنْجِسَةً لِّغَيْرِ مُبْتَلًى لِّتَبَيَّنَ الْفَاسِقُونَ  
وَلَقَدْ لَعَنَّاهُ وَرَدَّخَطْبًا عَنْهُ وَالْيَهُودُ  
وَالنَّصَارَى ۝ (۱۲: ۱۹)

اسی میری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے رکما ذکر فی روح المعانی

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعلق ہے، خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شہر برأت وغیرہ جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں کیونکہ اس آیت میں بھی مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ قَالُجِجَ فَرَاکَر بِلَادِیَا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا فنی بردیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادت اسلامی کا ذریعہ اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہو، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، بشرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات، روزہ، حج وغیرہ میں غلطی لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا، اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ: لَقَدْ لَعَنَّاهُ وَرَدَّخَطْبًا عَنْهُ وَالْيَهُودُ وَالنَّصَارَى ۝ (۱۲: ۱۹) اس آیت سے یہ مسئلہ بھی محل آیا کہ جس چیز کو شریعت اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان

لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آجوشرما ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام دیا جائز قرار دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہو گئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔

## حکم نہم جہاد و قتال

اس پر ساری امت کا اتفاق ہے کہ ہجرت مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیات قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگزر کی ہدایتیں تھیں، ہجرت مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتال کفار کا حکم آیا، وَقَالِ الرَّسُولُ بَنُو إِدْرِیٰ وَغَیْرَہٗ اَوَّصِدِیْنَ اَکْبَرُ شَیْءٍ اَیْکَہٗ رَدِیْتُ یَہِیْ ہُوَ کہ قتال کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے، اَوَّصِدِیْنَ بَلَدَیْنِ یُفْقِرُتُوْنَ بِمَا کُنْتُمْ تَظْلِمُوْنَ (۲۹: ۱۲) مگر اگر حضرت صحابہ و تابعین کے نزدیک پہلی آیت سورۃ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہو اور صدیق اکبر نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی ہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہو کہ مسلمان صرف ان کافروں سے قتال کریں جو ان کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہب ہی شغل میں دنیا سے یکسر ہٹ کر رہنے ہوئے عبادت گزار ماہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہو، جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ اَلَّذِیْنَ یَبْقَیَ تِلْکَ الْکُفْرُ مِیْنِ دَاخِلِیْنَ (منظہری، قرطبی، جصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدین اسلام کو بوقت جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:



تَعْلٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم  
وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ الْیَسَّارِ وَالْقَبِيْلَیْنِ

تین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں  
اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

اور ابوہریرہ میں بروایت ابن عباس کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ  
ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ کسی بڑے ضعیف  
کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (منظہری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیان کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی،  
اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو  
بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں قَوْلًا تَعْتَدُوا کا بھی جہور مغسّرین کے نزدیک ہی مطلب ہے کہ  
قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوا الْمُکْمِلَیْنَ لِقَوْلِهِمْ قَاتِلُوا الْمُکْمِلَیْنَ خِیْثُ أَنتُمْ بِحَرْبٍ خلاصہ تفسیر  
میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے جب صلح حدیبیہ  
کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے  
لئے سفر کا ارادہ کیا جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس  
سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال  
بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت  
دیدہ کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے کہ جہاں پاؤں کو قتل کرو اور اگر قدرت  
میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقابلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ  
عفو و رگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی  
خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا بڑا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْقَتْلَ  
أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بڑا کام ہے، مگر کفار مکہ کا  
اپنے کفر و شرک پر چل رہا تھا اور مسلمانوں کو اوائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت  
و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ قتل  
سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو اوائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز  
ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کردی گئی وَلَا تَقْتُلُوا ہُمْ عِنْدَ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی تَقْتُلُوا کُفْرًا یَّہِیْءُ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے  
اس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کس شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اس  
آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت  
میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء جہاد قتال کی ممانعت صرف مسجد  
حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد ضروری  
ہو اسی طرح ابتدائی جہاد قتال بھی درست ہے۔

فَإِنْ أَنتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَفُوٌّ رَّحِیْمٌ ۝۱۱ وَ قَاتِلُوا مَنِیْکُمْ لَا تَكُوْنُ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہو، اور لاواں سے یہاں تک کہ

فِتْنَةٌ وَ یَكُوْنُ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَإِنْ أَنتَهَوْا فَلَا عُدَّ وَ اِنْ اِلَّا عَلٰی

نہ باقی رہے فساد اور حکم رہو خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظَّالِمِیْنَ ۝۱۲ الشُّہْرُ الْحَرَامُ بِالشُّہْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ

ظالموں پر، حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابلہ) حرمت والے مہینہ کے اور ادبے کفر میں بدلہ ہے،

فَمَنْ اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاَعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اَعْتَدٰی عَلَیْکُمْ

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ السَّاقِیْنَ ۝۱۳ وَ اَلْفَقُوْا فِی

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہو پرہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِّیْلِ اللّٰهِ وَلَا تَلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی الْاَیْمٰنِکُمْ وَ اَحْسِنُوْا ۝۱۴

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

إِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۵

بیشک اللہ دوست رکھتا ہو نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر | پھر اگر بعد شروع قتال کے بھی وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز نہ آجائیں



اور اسلام قبول کر لیں، تو ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے گزشتہ کفر کو بخش دے گا اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر ہر باری رکھے، فرادہ گئے اور اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار جو کہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، یا قتل اس واسطے، ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور ان کا (دین و خالص) الشریعہ کا ہو جائے اور کسی کا دین و مذہب کا خالص اللہ کے لئے ہو جانا معروف ہے، قبول اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں، اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے ستم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہو کر لی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو قبول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ ہے، لہذا ان پر سزا سے قتل کی سختی نہ رہی اور مسلمانوں کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو کیونکہ حرمت والاہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہو سکتا) ہے جو جن (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (جو یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کر کے (زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ اسے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں حد قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاورے، اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایت و رحمت سے، ان ڈرتے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

**حکم دہم انفاق فی الجہاد** اور ستم لوگ دہان کے ساتھ مال بھی خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں جہاد میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جین یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور محالیت کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ ملین تباہی ہے (اور رجو) کام دکر (اچھی طرح کیا کرو) مثلاً اس فتح پر خرچ کرنا بادل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کی تشاخرچ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کر لے والوں کو۔

## معارف مسائل

مسئلہ جاری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے یہ بیعت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں، ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی توہیت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھل آیت میں درج کیا گیا کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہو دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو ان چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالت دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی ان سے دفاعی جنگ کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداء اسلام میں بھی سلسلہ جاری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع آ دیدی گئی، مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بغیر مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

## دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَقِمْ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہار نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دیکھیں اور نہ ان کے لئے کوئی نصاب اور مقدار







الْحَيِّجَّ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَزَوَّدُوا فَإِنْ خَيْرٌ

جائز کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ لے لیا کرو بیشک بہتر

الزَّادِ الْقَوِيُّ وَاتَّقُوا يَا وَلِيَّ الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فَانْهَ زَادُكُمْ كَابْتِنَا بِسُؤَالٍ مِنْهُ اور مجھ سے ڈرتے رہو اسے عقائد، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَاذَّاءَ أَفْضَلُمْ مِنْ عَرَفْتُمْ فَاذَّكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب ملوات کے لئے لو تو عرفات سے زیادہ کرو

اللَّهُ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۝ وَادْكُرُوا هَذَا بَيْنَكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کر سکتا ہو اور بیشک تم تھے

مِنْ قَبْلِهِ لَيْسَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے نادان ، پھر ملوات کے لئے پھر جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَأَسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ۝ فَاذَّاقْضِيكُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ہر بات، پھر جب پوئے کر چکو

مَنْ سَأَلَكُمْ فَادْكُرُوا وَاللَّهُ كَذِكرِكُمْ أَبَاءَكُمْ وَأَشْدَّ ذِكْرًا

اپنے حج کے کام کو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلْقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَئِكَ لَهُمْ صِيبٌ

آخرت میں خوبی اور بچاؤ ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ

اپنی کتاب سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو نعمتی کے چند

مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ

دونوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا وہی دہی میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رو گیا

فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ لَيْسَ الْاَثْمُ وَاللَّهُ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ لَكُمْ لَيْسَ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہڑتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جانی لو بیشک تم سب

تَحْشَرُونَ ۝

اسی کے پاس جمع ہونگے۔

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور رجب حج یا عمرہ کرنا ہر تو اس، حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کے واسطے

پورا پورا اور کیا کر دو کہ اعمال و آداب بھی سب بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو پھر

اگر دس دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیا جائے

تو اس حالت میں یہ حکم ہے کہ قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو روزی کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع

اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر مشد

ہو، اور بال کشا دینے کا بھی یہی اثر ہے، اور یہ نہیں کہ فوراً رک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام

کھولنا درست ہو جائے، بلکہ اپنے سروں کو احرام کھولنے کی غرض سے، اس وقت تک مت

منڈاؤ جب تک کہ (رو) قربانی کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا، اپنے موقع

پر نہ پہنچ جائے اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور عدد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا کہ

وہاں اگر خود نہ جائے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے جب جانور ذبح ہو جائے اس وقت

احرام کھولنا جائز ہوگا، البتہ اگر کوئی تم میں سے رکھے، بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ زخم یا درد

یا جو دوا وغیرہ کی تکلیف ہو اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت

پڑے (تو اس کو اجازت ہو کہ وہ سر منڈا کر) قدیم (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ مخواہ)

دو تھے سے یا چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں (غیر است

د کے طور پر) دیدیتے سے یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ

فہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جا رہا ہو) تو اس صورت میں حج و عمرہ



کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص (جو شخص عمرو سے اس کچ کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا) یعنی ایسا ہیج میں عمرو بھی کیا ہو) تو نقطہ اس پر واجب ہے کہ جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرو کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں رکھ کر آخر ان ایام کا نوین تاریخ ذی الحجہ ہو) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے ٹھکانے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکے خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہو کر (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملنا ہر ایک کو درست نہیں) بلکہ خاص (اس شخص کے لئے) (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قریب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور ان سب احکام کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلافت نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ریبا کی اور مخالفت کرنے والوں کو سزا دے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج و کذا چند مہینے ہیں جو (مشہور) معلوم ہیں (ایک مثال) و سر ازی تعدہ تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی غرض بات (جائز ہے اور نہ کوئی بے حکمی) (درست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (و تکرار) (زیبا ہے) بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں رگداری (ہے) بھار ہٹا ہے اور اے ذی عقل لوگو! ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہوا) لیجانا مصلحت (بھوت) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تھامی قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (دھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات میں ٹھہر کر وہاں سے واپس آئے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) اگر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی نادانقت تھے، پھر اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور کمال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں قربانی رسوں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، لیسنا اللہ تعالیٰ معاف کر دے اور ہر بانی فرمادیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی توبہ عادت تھی کہ حج سے فایز ہو کر مٹی میں جمع ہو کر اپنے آباد و اجداد کے مفارقت و فصال بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پر سے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بہتر) ہے، بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تا ستر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعا مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر و ارباب طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے (فرماتے ہیں) سو بیٹھے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دیتا ہو) دنیا میں دیدیجئے (و یوں) سوان کو جو کچھ ملنا ہو گا دنیا ہی میں مل رہے گا، اور اسی شخص کو آخرت میں (جو انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بیٹھے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اور پر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دو دنوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر و ارباب) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے) جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو، اور (مٹی میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں یا چوبیس تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر) دسویں تاریخ کے بعد (دو دن میں) مکہ واپس آئے (میں) تعیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) (دو دن میں) واپس مکہ میں (تاخیر کرے) (یعنی بارہویں کو نہ آئے) بلکہ تیرہویں کو آدمی اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرتے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔



## معارف و مسائل

**احکام حج و عمرہ** | ابراہیم علیہ السلام کے بیان کا سلسلہ نصف سورۃ بقرہ سے چل رہا ہے ان میں گیارہ ہواں حکم حج کا ہے، حج کا تعلق چوکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ یعنی کعبہ سے ہے اس لئے اس کے متعلق کچھ مسائل قرآن کے بیان میں ضمنی طور پر سورۃ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک **وَلَا جَعَلْنَا الْكِبَيتَ شَأْنًا** سے شروع ہو کر **وَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَمَسُّوا كَبَابَ الْكَبِيتِ** تک ذکر میں آئے ہیں، پھر بحث قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۱۵۸ **إِنِّي الْغَفَّارُ الْكَرِيمُ** میں مغفروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۹۶ سے آیت نمبر ۲۰ تک **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ** سے شروع ہو کر **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ** تک آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماع امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائض اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے۔ ہجر کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوہ احد کے سال میں سورۃ آل عمران کی اس آیت سے ہوتی ہے: **وَذِيْقُوا مَلَأَ النَّاسِ حُجَّ الْكِبَيتِ** (آیت دہن کش) اسی آیت میں فرضیت حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔ مذکورہ صدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ**، باتفاق مفسرین قصہ مدیبنہ میں نازل ہوئی، جو سترہ برس واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں بلکہ پہلے بتلانی جا چکی ہے بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔ عمرو کا حکم اور چونکہ سورۃ آل عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہوا اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کرے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا عام نقلی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہو یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کرے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت عمارؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپؐ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے، (قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح) اس وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ،

مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہی آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں **وَأَن تَحْضُرُوا** سے فرمایا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے | یہ آیت چونکہ واقعہ مدیبنہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرامؓ عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، اٹھارہ گھنٹہ کے بعد مکہ میں داخل ہوئے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا منہ سے ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ** میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک تحريم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حسد و حریم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرا دیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحت مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں با شتر اک علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرو کی قضا کی ہے اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ احرام میں سر منڈاننا یا بال کٹوانا منوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے توجہ نہ کرے، مگر حالت احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالت احرام میں بال منڈالنے پر | **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ** کا ترجمہ میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں بخود ہی پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہو تو ایسی صورت میں بال منڈاننا بعد ضرورت جائز ہے، مگر اس کا ذیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حد و حریم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور



نہیں ہی مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے انٹی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو اسلام سے پہلے عربیہ جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حدیث میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اٹھارے میں جمع کرنا منع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اٹھارے کے دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدیث میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ عین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے لگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، وَلَنْ تَكُنْ أَهْلَهُ تَحَاضُّرِ الْقَمْعِ لِحَرَامِہِ کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قریب و جا رہیں حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اٹھارے میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج و عمرہ کو اٹھارے میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکر ادا کریں اور یہ کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے، بکری، اگائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے خارج ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیاری ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر ایام البقیۃ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرائے (جصاص)

تمتع و ستران | اٹھارے میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں قرآن کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ لے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لغتی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں قَعْنَ قَمْعِ اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلافت و رزی | آخر آیت میں اذل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اور کوتاہی موجب عذاب ہے | اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَنَّٰ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ، یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اذل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کاموں اور ساختیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔

احکام حج کی آیت میں سے | اَلْحَجَّۃُ اَشْهُرٌ مُّكْرَمٰتٌ، اَشْهُرٌ شَہْرٌ کِی جمع ہے جس کے معنی ہیں دوسری آیت اور اس کے مساں | مہینہ، پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دنوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ معین نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیت عرب کے لیکر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو امامہؓ و ابن عمرؓ منقول ہے (منظری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (منظری)

قَمْعٌ مِّنْ فِیْہِیْنَ الْحَجَّۃِ فَلَا تَرْتَدُّ وَلَا تُسَوِّیْ وَ لَا تُجْعَلُ اِلَّا فِی الْحَجَّۃِ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں



ہر چیز کو لازم و واجب ہو، وہ تین چیزیں ہیں: رفت، فسق، جدال۔

رفت ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کنایہ کا مضائقہ نہیں۔

فسق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول بھی اور ناسرمانی کو فسق کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسق کی تفسیر مخطورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی مانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرے بڑی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی پٹے پٹے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالت احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک مخطورات احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو فسق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفت سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سبک زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے مخطورات احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مسببلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوف عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جبرانہ بھی گناہ سے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو خلافت ذق کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیت عرب کے لوگ مقام وقوف میں باختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقع ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقات حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لآجذک الیٰ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوف فرض عرفات میں اور پھر وقوف واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف مخطورات احرام کا بیان ہوا اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزیں کہ منع کر دیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ تشریح کیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح اہم جدال و غلات ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالت احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبتیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی بیاہنی اور اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفت، فسق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں مبتلا رکھنے کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و منیٰ، عروقات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفت کی حرمت کا بیان فرمادیا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لآفسق کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا والی ہو جائے، اس لئے لآجذک الیٰ کا حکم دیا گیا۔



بلاغت قرآن

**بلاغتِ قرآن** اس آیت **فَلَا تَهْتَفُ وَلَا تُنْكِرُ وَلَا يُجِدَ الْكَافِرُ لِفَيْهِ حَسْرَةً** کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نفی اور مانعت کرنا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لا ترفضوا ولا تفسحوا ولا تعجدا لہا کہا جاتا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصویب نہیں۔  
**وَمَا تَلْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ**۔ محظورات و منوعات احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہ نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ قیامت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، تم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہو اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

ذَرِّوْنِي فِي حِلِّائِ خَيْرِ الْمَوَاقِفِ۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سرو سامانی کے ساتھ تکل بکھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے مستدر کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترکیب اسباب کا نام توکل رکھنا جالت ہے۔

سفر حج میں تجارت یا مزدوری کرنا ایسا ہر  
 قیسن علیہ السلام محتاج ان تبتعثوا فضلہ من تریکھ، یعنی تم پر اس میں کوئی  
 گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ دوزی کمالو اور  
 اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو، واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے  
 جس طرح تمام عبادات و معاملات کو منج کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامیل  
 کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی  
 بیہودگیاں کرتے تھے، منی کے عظیم جہتنامہ میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، سناٹس ہوتی تھیں،  
 تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو  
 ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مست جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ آیا ہم  
 حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کمالینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں  
 اس کی مطلقاً حرمت و مانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

اس آیت اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ پہاڑے اونٹ سچ کے لئے کرایہ پر لے جاتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور سچ کرتے ہیں، کیا ہمارا سچ نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ کو یہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہو ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا أَجْزَلًا مِنْ غَيْرِكُمْ، اُس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا سچ صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دورانِ حج میں کوئی بیع و شہار یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور منہاجت بنالیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سیٹھا مقصد نہ ہو، فَصَلِّاٰ مِّنْ تَرٰ بِكَحْمٌ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے لَقِيْنِيْ عَنِ الْجَنَّةِ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور ہرکاتب حج جیسی عمل ہوئی پختہ نہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہو، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کرنی یہ اخلاص کے بالکل متافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے، کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدیکا وقوف

قرآن مجید میں قیل لہ لیس البضائین۔ ”یعنی پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یا ذکر درجں طرح تم کو بتلا رکھا ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناداقت تھے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ عرفات



سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظ جامع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے جس کے حدود اور بجز معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوال آفتاب مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور ذبیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی درجہ بتلائی جاتی ہیں، ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شمار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ پہاڑ شمار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء و دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت کے دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔

آیت کے جملہ **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَلَّةِ** میں شاید اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو اپنی راستے اور قیاس کو اس میں دخل نہ کیونکہ راستے اور قیاس کا اختصائی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اس روز اس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہو کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَلَّةِ** سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لہذا عبادت اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف کچھ خصوصیت اور اضافے کر لیتے ہیں اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں

اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اپنی جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی راستے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی نہیں، اور چند رسول کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہے، **ثُمَّ اِذْ يَخْتَفِرُ امِنْ خِيَتِ الْاَفَاقِ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ**، اِنّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، افسوسنا اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

اس جگہ کا شان نزول یہ ہے کہ قریش عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سائے عرب میں ان کا اقتدار مسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیاز شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدود حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدود حرم کے اندر ہے، اور عرفات سے خارج ہے، یہ پہاڑ کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جاتا کرتے تھے، اور درحقیقت وہ اس جگہ پہاڑ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔ ازل تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک شکریہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباس حرام اور پھر قیام و مقام کی ایک کچھ کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالت احرام میں یہ امتیاز ہی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسان مساوات کا ذریعہ بہت | اس ارشاد قرآنی سے اصول معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی بہتری عمل صورت | قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تعزین ملتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو بھی ہر باگروے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مسدود تقویٰ اور اطاعت خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں



معارف فراویں اور اپنی رحمت فراویں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح بتائی میں | ہر نئی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی  
فصول اجتماعات کی ممانعت | ہر ایک قویہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف  
وقرانی سے فارغ ہو کر جب مٹی میں قیام کرتے تھے قرآن کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی  
تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں  
کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی اغوار و فضول  
چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور  
مٹی میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور مخصوص  
ان کے جھوٹے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ  
بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی  
ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ  
کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ساتھ نہ آئیں گے  
ان کو غلبت جانتا جاتے۔

علامہ ازہری ج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت  
کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سادقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہو  
اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد ج  
میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں  
کامیاب فرمایا اور ذرائع ج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضایہ یہ ہے کہ اور  
زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں  
ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے ذکر کرتے تھے، جن کا کوئی نفع  
دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے  
بھی آخرت کے لئے بھی، ابکل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے  
قائم کریں اور آباء و اجداد کے ذکر کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضول  
اجتماعات میں فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے  
کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے  
بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آیت یا آیت ہوتا ہو

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، مائل ہو، یا آیت یا آیت کی جگہ یا آیت یا آیت کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو  
کہ بچپن میں اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے،  
انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے  
باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر نثر بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت  
کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ خود عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز  
مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین | جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ  
دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال | دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گزاریں، اسی طرح کچھ  
لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں مشغول تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی  
تمام دہائیں صرف دنیاوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت  
کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ  
وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے،  
ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سر لختہ حج بھی  
انہوں نے محض دنیا اور دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ  
کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں  
اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں  
جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراضِ دنیویہ میں  
ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ  
بھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ ان کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسمِ حج اور مقامات مقدسہ  
میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے  
صرف کرتے ہیں، اور اگر ہلکے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دو تہند لوگ  
یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے  
ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی و تجارت میں برکت  
اغراضِ دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور فرائض پڑھ کر یہ بھی سمجھ گئے ہیں  
کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت حضرات



زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات و دیرہوں کی مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہو، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم و خبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ وظائف و نوافل اور دعا و درود سے اوج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذاب جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ حسنہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی حسنہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت و نیروی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، احسان و محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی حسنہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون عیدتر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اور حالت طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا مومنوں سے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگتے کہ عبادت جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیال خام ہو، انسان اپنے وجود اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریات دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگے کہ نہ بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگا ہو، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللَّهُ سَيَرِيعُ الْفِتَابِ، یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں ان آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور ان پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

مٹی میں دو باہن دن کا قیام آٹھویں آیت ہو اس جگہ احکام حج کی آخری آیت ہو اس میں حجاج کو ذکر اللہ اور ذکر اللہ کی تاکید کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، قَدْ أَكْمَلَ اللَّهُ فِي آيَاتِهِ مَثَلًا لِّذِي

یعنی اللہ کو یاد کرو گشتی کے چند دنوں میں ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔ آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ مٹی میں قیام اور ہجرات پر کنکریاں مارنا تکبیر کی ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیس تیس یا پانچ ذی الحجہ تک مٹی میں قیام اور ہجرات پر مٹی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجاتے کہ ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اس طرح دوسرے لوگ بارہویں یا پانچ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیسری تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، کہ قَسَمْتُ لَّكُمْ تَعْقِلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَفْئَمَ عَلَيْكُمْ وَتَنْ تَأْخُذَ فَلَا أَفْئَمَ عَلَيْكُمْ، یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن مٹی میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

حج یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب سے پہلے مٹی سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی ری واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب مٹی میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی ری کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی ری میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوال آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

مٹی سے واپس آکر اس میں حجاج کو اخصت پار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دو دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص



کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ وحیقت جی اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے: **إِنَّمَا يَتَّقِ اللَّهَ مِنَ الْمُنْعِقِينَ (۲۰۳)** یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں، اور جو شخص جی سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور جی کے اندر بھی بے پردائی سے کام لیتا رہا، جی کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا جی کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا جی فرض ادا ہو گیا، ترک جی کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام جی جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام جی میں جب کہ اعمال جی میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام جی میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے جی پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت جی کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان جی سے فانی ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص جی کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ جی مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے جی سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محنت سے فانی اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا جی مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ جی میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فراموشی کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگرچہ کر لے والے اس کا دھیان نہیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں جی سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔

ایک ترک بزرگ جو مولانا جی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ جی کر گئے اور فانی ہو کر داپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جی سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج درازی کرتے تھے، جی کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ جی ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام جی کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ جی ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح جی سے پہلے اور جی کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح جی کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا عَنَّا وَتَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفَعْلِ وَالنِّيَّةِ**۔

**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللَّهُ**

اور دیکھنا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گولہ کرتا ہو

**عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَكْدُ الْخَصَمِ ۚ وَإِذَا اتَّوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ**

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

**لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ**

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

**وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ**

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

**وَلَبِئْسَ الْبِهْلَاءُ ۚ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ**

اور بے شک برا ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

**اللَّهُ وَ اللَّهُ رُكُوفٌ بِالْعِبَادِ ۚ**

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر



کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ وحیقت جی اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَّقِ اللَّهَ مِنَ الْمُنْعِقِينَ (۲۰۳)** یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں، اور جو شخص جی سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور جی کے اندر بھی بے پردائی سے کام لیتا رہا، جی کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا جی کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا جی فرض ادا ہو گیا، ترک جی کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام جی جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام جی میں جب کہ اعمال جی میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام جی میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے جی پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت جی کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان جی سے فانی ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقاضی کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص جی کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ جی مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے جی سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محنت سے فانی اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا جی مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا اس کی مقبول ہے، ورنہ جی میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فراموشی کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگرچہ کر لے والے اس کا دھیان نہیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں جی سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ کیا کرنے جی نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔  
ایک ترک بزرگ جو مولانا جی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ جی کر گئے اور فانی ہو کر داپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جی سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج و زاری کرتے تھے، جی کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ جی ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام جی کے ختم پر تعمی کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ جی ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح جی سے پہلے اور جی کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح جی کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَقِنَا غَمًّا عَنَّا وَتَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَافْعَلِ وَالنَّيَّةِ**۔

**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللَّهُ**

اور دیکھنا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گولہ کرتا ہو

**عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَكْدُ الْخَصَمِ ۚ وَإِذَا اتَّوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ**

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

**لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ**

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

**وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ**

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدہ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

**وَلَبِئْسَ الْبِهَادُ ۚ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ**

اور بے شک برا ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

**اللَّهُ وَكَوَفَّ بِالْعِبَادِ ۚ**

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر



**ربط آیات** اوپر کی آیتوں میں دمار لگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی گئیں، ایک کافر کفر مستکر آخرت ہو، اس نے صرف دنیا مانگ لیا ہے، دوسرا مؤمن کہ معتقد آخرت ہو، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اہل آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

**خلاصہ تفسیر** اگر کوئی شخص تھا افسوس بن ستر بن، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہیں کھاکھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و ایذا رسائی خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو شخص و نبی غرض سے ہوتی ہے، دیکھنا اسلام سے مسلمانوں کی طرح قربے غصہ و حسد کے ساتھ رہوں گا، اس کی نصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنا اعتبار بڑھانے کو، اللہ تعالیٰ کو گمراہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر، حالانکہ وہ بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں، وہ (آپ کی) مخالفت میں رہنا ہی ہے، اور جس طرح آپ کا مخالف ہو اس طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہو چنانچہ جب (آپ کی مجلس) پہنچے پھرتا ہے تو اس کو ڈر و صوب میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) نساد کرے اور (کسی کی) کھیت اور مویشی کو تلف کرے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا، اور اللہ تعالیٰ نساد کی باتوں کو پسند نہیں فرماتے، اور اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہو کہ جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو راہ زیادہ آواز کر دیتا ہے اس کو غرور گمراہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بڑا جھکا ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

## معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ ان مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے بے مثال شہدائیاں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت حبیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت حبیب رومی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیرھے سب کمال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قسبیلہ قریش تم سب سچے ہو کہ میں تیرا اندازی میں تم سب زیادہ ماہر ہوں، میرا تیرکبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم رفع کا سودا چاہتے ہو تو میں نہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا سستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت حبیب رومی نے صبح سلم انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فرمایا

رَبِّيعُ النَّبِيِّ اَبَا بَيْحُي رَبِّيعُ النَّبِيِّ

تمہارا بیوہ بیوہ بیوہ، تمہاری بیوہ بیوہ بیوہ

اَبَا بَيْحُي

دیکھا

اس واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرام کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا نشانہ نزول بتلایا ہے (منطری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

لے ایمان والو داخل برجائز اسلام میں پورے اور ملت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۖ فَإِنْ تَرَكْتُمُ مِّنْ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاءَ تَكْمَلُ الْبَيْتِ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۖ هَلْ

تم کو صحت حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آدھے ان پر اللہ ابر کے ساتھاؤں میں اور فرشتے

وَقُضِيَ الْأَمْرُ إِلَى اللَّهِ تَرْجِعُ الْأُمُورُ ۖ

اور طے ہو جائے قعدہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام



## رابط آیات

اور پھر غلصہ کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے نظر اور افراط ہوا کہ اس سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہودیہ تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کار و روز معظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں بھی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، ہمیں کا حاصل یہ ہو کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

## خلاصہ تفسیر

لے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو رہے نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رسمہ کر دو اور دایہ خیالات میں پڑ کر شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہو رہا کہ ایسی ہی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو مسرور دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلائل (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، پھر بھی مراکتبہم سے نفرت کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینے اور کچھ دنوں تک سزا دینے تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں کسی حکمت و مصلحت سے کہیں سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا، اور یہ سائے جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سوائے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

## معارف و مسائل

اَذْكُرُوا فِي الْيَوْمِ كَذٰلِكَ، سلم بالکسر بافتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری اسلام، اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کاذلہ۔ جمیعاً اور عامۃ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں قائل واقع ہوا ہے جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اَوَّكُمُوكَا کا قائل مسترار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی اسلام کا قائل ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعت اہلہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلام بجا لاد کر ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں یا دل و دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر رہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کر دو بعض میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظام حیات ہر تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو بچے دل سے قبول نہ کر دو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مصلح نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سائے خواہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ ۱۔ اس میں آن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گو با دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی نہیں سمجھتے، نہ ان کے معلوم کرنے یا سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ ہم ازکم محقر سالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامت کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔



اور یہ واقعہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے ساتھ ان میں ان کے پاس آجائیں قیامت میں پہلے آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا مشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے معنوں کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

یوحنا بن اسرائیل سے کس قدر عنایت کہ ہم نے ان کو نشانیاں بھیجی ہوتی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةً اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ

فریفتہ کیا کہ کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنسے ہیں ایمان والوں

اٰمِنُوۡا وَالَّذِيۡنَ اتَّقَوْا فَرَقَهُمۡ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَزَنُّ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّكْسِبُ غَيْرَ حِسَابٍ ۝

دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

رابط آیات | اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضعہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے،

پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت

پر سزا دی گئی: خلاصہ تفسیر | آپ (علیہ السلام) بنی اسرائیل سے (دُعا) پوچھے (تو یہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے

بزرگوں کو) کتنی واضح دلیل دی تھیں مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ

اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گرا ہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی بھیجتیں ہنساؤں اور اُٹلی،

چاہتے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی، اور مثلاً

حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہو تو اسراۓل کے لوگوں پر رکھتے مگر شہادت نکالے آخر پہلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً

درایم شکاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان ماننے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً حق و سلوی نازل ہوا شکر کرنا چاہئے تھا، مانتہ سرائی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہو گیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پہ پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غیبت سمجھنے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، اعلیٰ ہندو بہت سے معاملات اسی سورۃ الفرقان کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں، اور دہارا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائل و اضمح) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بہاتے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اٹا گراہ بتا ہی) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصل علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو

جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں

رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر

ہنستا ہے، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور چھلے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ

باستہزا پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ دنیوی معاشی کفار کو آراستہ پہر پہن

معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک

سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ رک حالت، میں ہوں گے قیامت کے روز کیونکہ کفار جہنم میں

ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ

روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں پس اس کا مدار قسمت

پر ہے نہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بڑا

معزز ہو اور بڑی عزت ہی جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل

سمجھا جو قوی ہے)۔

## معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی

حقیقت قیامت کے روز انھیں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے

فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں

دعا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا

جب اس کی طرف غصہ کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ



کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔

(ذکر الحدیث القریبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ

تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اناری اُن کے ساتھ کتاب بھی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس پر

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑا اولا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لَمَّا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِآيَاتِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى

اسی ہی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جسکو چاہے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۲﴾

سیدھا راستہ۔

ربط آیات

اور یہ دین حق سے اختلاف کرنے کی ملتِ حُکْمِ دُنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مذمت سے ہیں قصہ چلا آ رہا ہے کہ ہم دلائل واضح دین حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دُنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر

راہِ راستہ میں (سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے) کیونکہ اول دُنیا میں حضرت آدم علیہ السلام صبح اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی تھی ان کو

دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے ایک مدت اسی حالت میں گذر گئی، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہوا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد

اعمال و عقائد میں اختلاف کی نسبت آگئی، پھر اس اختلاف کے رفع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی دے دے (منانے تھے اور) نہ ماننے والوں کو مذاہب، ڈراتے تھے، اور ان پیغمبروں کی ہمدردی جماعت کے ساتھ (آسانی) کتابیں بھی

تھیک طور پر نازل فرمائیں اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا اس غرض سے تھا کہ

اللہ تعالیٰ ان رسل و کتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ

(مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں کیونکہ رسل و کتب امر واقعی کا اظہار کر دیتے ہیں اور امر واقعی کے متین

ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہی، اور ان پیغمبروں کے

ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار رکھ کر اپنے سب

اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع

کر دیا، اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو اول

وہ کتاب ملی تھی یعنی اہل علم و اہل فہم نے کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے

ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلافات بھی کیسے وقت کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح

پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے)، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف، یا یہی

ضدِ اضدی کی وجہ سے (اور اصل وجہ ضدِ اضدی کی حُکْمِ دُنیا ہوتی ہے، حُکْمِ مال ہو یا حُکْمِ جاہ) پس

مدارِ ملت مخالفت حق کا وہی حُکْمِ دُنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں، پھر یہ اختلاف کفار کا

کبھی اہل ایمان کو مضرب نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف نہیں

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ

تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلا دیتے ہیں۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور

عقیدہ و خیال پر تھے جو ملت حق اور دینِ فطرت تھی، پھر انہیں مزاج و ذائقے کے مختلف خیالات

و عقائد پیدا ہو گئے، جن میں یہ بہت سی از کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو

واضح کرنے اور صحیح راہِ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں

اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں

میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام

کے متبع ہو گئے، جن کو مومن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام

کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، امامِ راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "أُمَّة"



قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ و غیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں،

اول یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اول کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلافات جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اسی کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افراد انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دراحتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدہ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کھنڈر و ضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفتقرین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورہ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے،

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً  
فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْ لَا حُجَّةٌ سَبِقَتْ  
مِنْ رَبِّكَ لَفُتِحَتْ بَابُ غَيْبَاتِنَا  
فَأَخَذُوا بِعُلُوقِ رَبِّهِمْ فَبَدَّلَ

جملہ لوگوں کا ایسا فیصلہ کر دینا کہ جن سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔

اور سورہ انبیاء میں فرمایا:

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً  
وَرَأْسُكُمْ كَذَلِكَ ۚ وَرَبُّكُمْ

اسی طرح سورہ ممتحن میں فرمایا:

وَأَنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً  
وَأَنَّكُمْ تُكْفَرُونَ ۝ (۵۲:۲۳)

یہ ہماری جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمہارا  
رہنما ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے ہو

یقیناً یہ ہماری جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں  
تمہارا رہنما ہوں، اس لئے تمہارے ہی ذریعہ رہو

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دین حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ یہ دین حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفتقرین صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالم ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَللّٰهُ يَزِيدُكُمْ۔ یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بیشک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افراد سالانہ ایک ہی عقیدہ حق پر قائم تھے جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہو جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ حواء کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پہلی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور اپنی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ شیع شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزرگوار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدت عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب مسلم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ وحدت عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بددعا سے دنیا میں طوفان آیا، اور جب سب لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب سلمان موحد اور دین حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے لیے ہی تھے جن میں سارے انسان ملت واحدہ اور امت واحدہ بنے ہوئے دین حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے، فَبَدَّلَ اللَّهُ الْبَشَرِ مَثَلًا ۖ بَعْثْنَاكَ إِنَّا قَدْ خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نَارٍ وَنُفُوسٍ  
وَأَنزَلْنَا مِنْكُمْ أَلْفًا مِّنَ النَّاسِ لِيَتَّبِعَكُمْ بَنِي آدَمَ ۖ فَخَلَقْنَاكُمْ فِي مَا تَخْتَلَفُونَ فِيهِ ۚ لِيُظْهِرَ لَكُمْ آيَاتِي وَلِيُنَبِّئَكُمْ يَوْمَ تَلْقَوْنَ فِيهَا  
اللَّهُ تَعَالَىٰ فِي تَغْيِيرِ رُءُوسِهِمْ ۚ لِيُظْهِرَ لَكُمْ آيَاتِي وَلِيُنَبِّئَكُمْ يَوْمَ تَلْقَوْنَ فِيهَا  
فَبَدَّلَ اللَّهُ رُءُوسَهُمْ ۚ لِيُظْهِرَ لَكُمْ آيَاتِي وَلِيُنَبِّئَكُمْ يَوْمَ تَلْقَوْنَ فِيهَا  
فَبَدَّلَ اللَّهُ رُءُوسَهُمْ ۚ لِيُظْهِرَ لَكُمْ آيَاتِي وَلِيُنَبِّئَكُمْ يَوْمَ تَلْقَوْنَ فِيهَا



یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امتب واحد اور ملت واحد ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اس پر تفسیر راجح کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاء اور کتا میں سمجھی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے پیچھے کی ملت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتا میں بھیجے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اور صرف امت واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں کہ قرآن کریم احوال ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تالیف کی کتابوں کے سائے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاق کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے :  
يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ إِنَّ اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو حیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جلول کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے، لہذا یہاں اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے انبار کی تھی کہ ان اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں ساری انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دین حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آتے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت تھی، ان یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راوح حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَجَعَلْنَا الذِّبْنَ یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دین حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی غرض خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف مقامات و خیالات میں سے صیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

رسول اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اولیٰ وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیات الہیہ بھی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی استنباط یا التباس کی گنجائش نہ تھی، مگر ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جاتیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرے اگر وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت پر لگا دیا اور جس نے انبیاء و رسول اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے :

تین اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا پھر تم میں سے کچھ  
کافر و منکر ہو گئے کہ ایمان و اسلام ۵

فصلۃ معنوں آیت حمان الناس اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ کا یہ ہر کہ پہلے دنیا کے سب انسان دین حق پر قائم تھے، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی فوہبت آگئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں القباس ہوئے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتتاہیں راہ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دین حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات و نسخہ اور آیات و نیات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کر لی۔

## مسائل

مسئلہ : اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں دنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دین حق کی ملت واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر ان کو اسی ملت واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آتا کہ جب لوگ اس راہ حق سے ہٹ گئے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی پہلے خود دوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہو اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا



اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بہاریوں سے بچنے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصول علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کر لے والا ہو، اور وہ نسخہ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن بھیجے گئے، اور کئی کتابوں میں تحریر ہو کر جو پچھلے انبیاء تک تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ ادھر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نبی اور نبی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ انتظام فرمادیا گیا کہ قرآن کریم کے تحریر ہو کر محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ لے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دین حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں مشائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور دہلی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہو کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دور میں نہ بڑ جائے کہ انبیاء اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دین حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دین حق پر سب جمع ہو جائیں۔

**مسئلہ:** دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بناء پر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا در قوی نظریہ عین منشاء قرآنی کے مطابق ہے، آیت **فَبَنَیْکُمْ کَافًۢرًا وَّمُؤْمِنًا مِّنْکُمْ مَّوَدَّیْنًا** اس پر شاہد ہوا اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس در قوی نظریے کی اصل بنیاد و حقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداء آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدہ حق اور دین حق کی پیروی پر تھی، ارشاد قرآنی **لَا تَجِدُ اُمَّةً ذَاتَ اِلَٰہٍ سِوَ اللّٰہِ** بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقاد صحیح اور دین حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدت قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

**مسئلہ:** تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور و خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تشدد نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عداوت اور انبیاء کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مومنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور محنت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلائے رہیں، اور شاید اس مناسبت سے اہل آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات، ہر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

**اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ**

کبائتم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

**الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَآءُ وَ**

لوگوں کے جیسے جو تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

**رَزَزُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰی**

بھڑ بھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی

**تَصْرَافُ الْاٰرَآءُ نَصَرَ اللّٰہُ قَرِیْبًا**

اللہ کی مدد، مگر رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

**رابط آیات** اور ہر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مومنین کے ساتھ اختلاف اور مخالفت کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو سہ تنہا کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مومنین کو انواع و اقسام کی ایذائیں اور شکار پیچھے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

**خلاصہ تفسیر** دوسری بات مسلوں کا یہ خیال ہو کہ جنت میں (بے مشقت) جاد جہنم ہو گئے، حالانکہ ابھی کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ ستم کو ہنوز ان

مسلمان لوگوں کا سا لحاظ واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان پر مخالفین کے سبب ایسی ایسی سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں



ہوئیں کہ اس زمانہ کے پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد و موعود کب ہوگی (جس پر ان کو جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد و بہت (نزدیک رہنے والی) ہے۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مستلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، اولیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَشَقُّ النَّاسِ بَلَاءَ الْأَشْيَاءِ

لَقَدْ أَلَامَهُنَّ مَا لَمْ يَلَامُنَّ

سب سے زیادہ سخت بلائیں اور تعیشیں

انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، ان کے بعد جو

ان کے قریب تر ہیں۔

دوسری بات یہاں قابل نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ روکا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں سنرایا، اس لئے حالت خطر میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیج جائے، اور ایسی دعا کرنا تو مکمل یا منصب نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاج و زاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء امت اس کے سبب زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُ مِّنْ خَيْرٍ قَلِيلًا

تجھ سے پوچھنے ہیں کیا چیز خرچ کریں کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سوا ماں باپ کے لئے

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ وَالْمَلَائِكِينَ قَائِمِينَ السَّيِّئِينَ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور بیہوشوں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝۱۱۵

کرو گے تم بھلائی سودہ ہے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

## خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ثواب کے واسطے کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرمادیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا اور جو سائیک کام کرو گے (خواہ براہ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

## معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و نفاق کو چھوڑو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی حالت و فراموشی اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البرکات جاری ہے اس میں داخل ہیں اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہ راست عرش رحمت سے براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت قُلِ اللَّهُ يُفَقِّهُ فِيمَا يَشَاءُ ۝۱۱۴ میں صراحتاً حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاضی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکن میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورۃ بقرہ میں



میں ایک سورۃ مائدہ میں ایک سورۃ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابہ کرام کی طرف سے ہیں، سورۃ اہزاب میں دو اور سورۃ بنی اسرائیل سورۃ کہف سورۃ لقہ سورۃ نازعات میں ایک ایک یہ کل تیرہ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرہ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات مجھڑت سوال ذکر کرتے تھے (قولی) متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کا استفادہ یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر اپنی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا، وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ حکمت ان حالات و واقعات میں خود کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شان نزول یہ ہے کہ عربین جو حج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا مَنَعَكُمْ مِنْ أَمْوَالِنَا أَنْ تُنْفِقُوا (اگرچہ ابن السکون مظهری) یعنی ہم اپنے اموال کیسے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عربین جو حج کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصروف کیا ہو کہن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اس سوال پر مشتمل ہے اس کا شان نزول ہر دو آیت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اتفاقاً فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزو ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، اس کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزو کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جزو یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظ متشراتی میں دونوں احزاب پر نظر فرمائیں، پہلے جزو یعنی کہاں خرچ کریں کے متعلق ارشاد ہوا کہ مِمَّا آفَطَظْتُمْ تَحْتَ يَدَيْكَ إِلَى الْيَوْمِ وَالْآفَاقِ يَتَيَّنُونَ لَكَ الْغُلُوبَ وَالْأَشْيَاءُ، یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق مال باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافریں۔

اور دوسرے جزو یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَنْفَعُكُمْ اور تَحْيِيْرُ قَاتِ اللّٰهِ يَوْمَ تَحْيِيْرُهُمْ، یعنی تم جو کچھ بھلائی کر دے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کر دو، بلکہ کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کر دے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پائے گا۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصروف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصدقات بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد دلی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا ثَلَاثَ اَنْفَاقٍ، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

**مسئلہ اول:** یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی معشر پر اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصاب مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقات نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مقصد والدین کو بھی مشرار دیا گیا ہے، حالانکہ مال باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

**مسئلہ دوم:** دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ مال باپ اور دوسرے احوال و اقارب کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجب اجر و ثواب اور اتفاقاً فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔



مسئلہ: ہمیری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفل صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگ میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرض خواہ کو ادا نہ کرے اور نفل صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دیگر حضرات نے بحکم و جہل مسترار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کر لے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد و تشریحی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بُری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں اور شاید تم کو چل لگے ایک چیز اور وہ بُری ہو تمھارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تم سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ

اس میں لڑنا کیسا، کبہ سے اس میں لڑائی بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو والہ سے

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ

اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بھلا ناقل سے بھی بڑھ کر ہے اور کفار تو ہمیشہ تم سے

يَقَاتِلُوكُمْ مَّعَشَىٰ يُرِيدُونَ كُفْرًا إِنَّ اسْتَطَاعُوا أَحَدًا

لڑتے ہیں تم سے یہاں تک کہ تم کو پھر دین تمھارے دین سے اگر قابو پاویں اور جو کوئی

يُرِيدُونَ كُفْرًا فَوَلَّيْنَاكَ حَبِطًا

پھر تم میں سے اپنے دین سے بھر مر جادے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے منافع ہوئے

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اللہ کی راہ میں وہ امید دار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

ہیربان ہے۔

## خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیت جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو ملے گا (معلوم ہوتا)

ہو، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور واقع میں وہ

تمھارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور واقع میں وہ

تمھارے حق میں ربا (عش) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم

(پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے بُرے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کر دو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی

کو اجمالا مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودہواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام (حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں

اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر

ان کے اٹھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا جب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جادوی الاخریٰ

کی تیسری سمجھتے تھے، اور در جب اشہر حرم میں سے ہے کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے

شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار تشریف لے گئے بھی حاضر ہو کر اعتراضا سوال کیا،

اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے)۔



لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عدل) قتال کرنا جرم عظیم ہے مگر مسلمانوں سے یہ نفل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے بسبب نفل سے ایسا ہو گیا یہ تو تحقیقی جواب ہے، اور الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح نہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کر زارین مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حق کو گناہ اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بیت رکھ چھوڑے تھے، اور بچائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے، اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دس کرمو منین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا جس سے فوجت ہجرت یعنی ترک وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پروازی کرنا ہے) اور ایسی فتنہ پروازی کرنا اس (قتل خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہو گا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (عدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس نفل سے دین کی مراحت ظاہر ہے)۔

**انجمل ارتداد** اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہو گا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

**وعدۃ ثوابک اخلاص نیت** حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے ماہ خدا میں جو دین کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہو کر رہتے ہیں، اور تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو، اور اللہ تعالیٰ (اس نفل کو) معاف کر دیں گے اور ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

## معارف و مسائل

**بعض احکام جہاد** مسئلہ:- مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کَتَبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ، یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر ملک پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ منسبینین کے طور پر ہر مسلمان پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمان کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے تو باقی مسلمان سبکدوش بھی جاتے ہیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ ہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مِمَّا جِئَ اِلَیْهِ یَوْمَیْنِ اَقْبَیَا مَتَّحِیْہِ کَا یَہِ مَطْلَبُہِ کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود نہ ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی ہے، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُنُوْا عَلٰی جِهَادِہِمْ کَا یَہِ مَطْلَبُہِ  
تَعْلِیْل دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے در فوج  
بھلائی کا وعدہ کیا ہے

کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ الْجِهَادَ بِمَا تَزَوَّیْتُمْ  
وَاَنْتُمْ حُرٌّ عَلَی الْقَوَدِ یَوْمَ دَرَجَاتٍ  
وَوَعَدَ اللّٰهُ الْخَیْرَ (۱۱۲، ۱۱۳)

اس میں لیے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہو کر دوسرے جہاد میں شریک نہ ہوں ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض میں ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ ختم یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت تھی، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

اَوَلَمْ یَکُنْ عَلَیْکُمْ فِیْ ہٰذَا حَرْبٌ مِّنْ قَبْلِ ہٰذَا  
چھوٹی جماعت اس کام کیلئے کہ وہ دین کی مسجد پر جہاد

اَوَلَمْ یَکُنْ عَلَیْکُمْ فِیْ ہٰذَا حَرْبٌ مِّنْ قَبْلِ ہٰذَا  
طَائِفَةٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ (۱۱۲، ۱۱۳)

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم علی پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جہی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔ نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں



اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر جادو، ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر بغیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن حکم یہ ہے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَعَلْنَا لَكُمُ الْغُرُوبَ وَآفَاقًا لِّجِهَادِكُمْ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ أَثَاقًا لَّكُمْ. (۲۸: ۱۹)

”اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو؟“

اس آیت میں اسی بغیر عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور ممانعت کرنے والی جماعت ان کی ممانعت پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا تمام آیات کے مطالعہ سے جہاد فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

**مسئلہ:** اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہوا و لا دو کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

**مسئلہ:** جن شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس قرض کفایہ میں حصہ لینا درست نہیں، ہاں اگر کسی وقت بغیر عام کے سبب یا کفار کے نزعہ بے پشت جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے نہ شوہر کی اور نہ شتر خواہ کی، اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانشمندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیمل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضریا مضی کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیاری و عقلمندی سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے نتائج پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر آئیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضرتیں یا کسی چیز کو نہایت مضرت سمجھ کر اس سے چھیننا کر رہے ہوتے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔

خوبش را در دم در سوالی خویش

اس لئے فرمایا کہ جہاد قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا بلکہ سرسرفیع اور دائمی راحت کسا مان تھا۔ آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اشہر حرم اشہر حرم میں قتال کا حکم، یعنی چار جہینے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہو اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آتی ہے، مثلاً وَمِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الْيَمِّنُ الْكَافِرَةُ اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منها اربعۃ حرم ثلاث متوالیات و رجب مضمر۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباح قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت غیر منسوخ قرار دیتے ہیں مگر جہود فقہاء کے نزدیک اور بقول جصاص عام فقہاء اصحاب کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کوئی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں یعنی نے فرمایا کہ آیت کریمہ قَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَافَّةً (۲۱۶: ۱) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی تَبْطِغُوا وَتَبْطِغُوا تَمُوتُوْهُمْ (۵: ۹) کو ناسخ قرار دیا ہے، اور لفظ حیث کو اس جنگ زمانے کے معنی میں لیا ہے، کہ مشرکین کو جس مہینہ اور جس زمانے میں پاؤ قتل کر دو اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اشہر حرم ہی میں اوطاس کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بناء پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصاص نے فرمایا وہ قول فقہاء الامصار۔ روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۃ برأت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمت قتال کے منسوخ ہونے پر اجماع اقت نقل کیا ہے، بیان القرآن، مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہر حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے، جس کو آیت السیف کہا جاتا ہے، یعنی اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ حِدَّةٌ اِلَیْهِ اَشْهُرٌ مُّسْتَقَرَّةٌ فِيْ کِتَابِ اللّٰهِ یُؤْتِمِرُ تَحِلُّیُ الشُّهُورِ قَاتِلُواْ اَرْبَعَةً حُرُمًا (۲۱۶: ۱) یہ آیت قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اتنی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہر حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات



متذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت و ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحُرَامُ بِالشَّهْرِ الْحُرَامِ** الآیہ - (۱۹۴:۲)

توحید صریح ہو کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

**انجام ارتداد** آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحُرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتِلُّ أَحَدُهُمُ فِي الْإِيمَانِ** و **الْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

**مسئلہ** دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بنی بنی نکاح سے بھل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے روزخ میں داخل ہوتا ہے۔

**مسئلہ** اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں روزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

**مسئلہ** لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

**مسئلہ**، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جہاد قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام دلا دے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام عیس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

**يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ**

تجھ سے پوچھتے ہیں علم مشرب کا اور مچھڑے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

**لِلنَّاسِ وَآثَمُھُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِھُمَا**

بہن لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

## خلاصہ تفسیر

**پندرہواں حکم** لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی رہتی ہیں جاتی ہیں اور لوگوں کو روک دیتے، فائدے بھی ہیں اور روزہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

## معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور مچھڑے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

## حُرْمَتِ شَرَابِ اور اُس کے متعلقہ احکام

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ



متذکرہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت و ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الْأَشْهُرُ الْحُرَامُ** بالشہر الحرام الآیہ - (۱۹۴:۲)

توحید صریح ہو کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جاتے۔

**انجام ارتداد** آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتِلُّ أَحَدُهُمُ فِي الدِّينِ** وَالْآخِرَةِ یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

**مسئلہ** دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بنی بنی نکاح سے بھل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالیت اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے روزخ میں داخل ہوتا ہے۔

**مسئلہ** اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں روزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

**مسئلہ** لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

**مسئلہ**، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جہاد قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام دلا دے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام عیس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

**يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ**

تجھ سے پوچھتے ہیں علم مشرب کا اور مچھڑے کا کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

**لِلنَّاسِ وَآثَمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا**

بہن لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

## خلاصہ تفسیر

**پندرہواں حکم** لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی رہتی ہیں جاتی ہیں اور لوگوں کو روک دیتے، فائدے بھی ہیں اور روزہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

## معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور مچھڑے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

## حُرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ



علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جو کھیلے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر ان پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت مفاسد اور خرابیاں ہیں ان کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادیۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبیعت خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی حشراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑی ہوتی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سبکے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرف انسانی کا اصل اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بڑے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بڑے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، مگر اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ تو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں بلکہ مفاسد دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سبب گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۃ قل یا یٰٰہیٰ انکھبرون کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دو سرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٰہیٰ اَنتَ الَّذِیْ یُنِیْ اَمْنُوْا اِلَّا تَقْرَءُوْا  
الْفُصُوْلَ وَ اَمَّا کُمْ فَسُکَّانِی (۲۲۱)

تین ایسے ایمان والے تھے جن کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ۔

اس میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی جن حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو چھوڑا تھا اسی آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو قطعاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی مانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقات نماز کے شراب کی حرمت مطلقاً پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقات نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عبید بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا دور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعرو شاعری اور اپنے اپنے مفاحشر کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی بھو اور اپنی قوم کی مدح و ثناء تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور اونٹ کے جھڑکے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر مار دی، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اَللّٰهُمَّ یٰٰہِیْ اَنْتَ الَّذِیْ یُنِیْ اَمْنُوْا اِلَّا تَقْرَءُوْا اَمَّا کُمْ فَسُکَّانِی، یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے، اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورہ مائدہ کی منسل نازل ہو گئی جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰٰہیٰ اَنتَ الَّذِیْ یُنِیْ اَمْنُوْا اِلَّا تَقْرَءُوْا  
وَالْمِیْسِرَ وَالْاَلْغَاصَ الْاَیُّمَیْ  
حَقَّی الْقَاطِنِ فَاَجْزِبُوْہُ عَنْکُمْ  
تَقْلِیْحُوْنَ اِمَّا سَابِغِیْ لَیْلَیْ  
اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنِکُمْ اَعْنَ اَوْ  
اَلْبَغْضَآءُ فِی الْخَمْرِ وَالْمِیْسِرِ

تین ایسے ایمان والے ہیں کہ شراب اور جوئے اور کھیل اور قمار کے تیرے سبب گھبراہٹ میں شیطانی کام ہیں، اس سے بالکل الگ ہو کر رہو، اگر تم راج ہو، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب و جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں بغض اور مداومت پیدا کر دے



وَيَسْتَكْفُرُ كُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَتَحِينَ الصَّلَاةَ  
فَقُلْ أَنتُمْ مُنْتَهُوْنَ (۹۱:۵)

اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے۔  
سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔

### حُرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، پھر احکام شریعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اعتبار میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود مستران کریم نے فرمایا: لَا يَكِلُكَ اللَّهُ تَعْسَالًا لَّكَ وَشَقًّا (۲۸۶:۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی مانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر ادھر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی چھٹی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب کا پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ پھوڑنے کی چیز ہے، مگر پھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو ادھر پر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیا۔

شریعت اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور مگراں ہوتا، علماء نے فرمایا: نِظَامُ الْعَادَةِ آمَنٌ مِنْ نِظَامِ الدِّينِ صَلَاحُهُ مِثْلُ جِسْمِهِ جِسْمٌ كَادِرٌ دَرْدٍ چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادت مستحضر کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی بڑائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں منوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ ہاں جس طرح ابتدائے تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا، اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی مانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت وعید و عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ ام الخبائث اور ام الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی جیسے سے گھٹے

گناہ کا مرکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ دو ایسی نساتی ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، پھوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو بہہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف لربانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ علی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔ صحابی میں تعین حکم کا پیشال جنڈا فرمایا اور صحابہ کرام نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھر نہیں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت پہا دیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گھلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دُور جام کے ساتی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ، بن جراح، ابی بن کعب، ہبیل، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑنے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سب توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب ہوں ایک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی زد کا پانی، اور مدینہ کی گھلیوں میں عرصہ ملازمت یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بُو اور رنگ مٹی میں بکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب، کردہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمایا سب دار صحابہ کرام نے بلا تا مل معسرہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تمیز لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور بانی دوسرے صحابہ کرام کے حوالے کر کے چاک کر دیا، ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک مِثَم سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلان حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابی نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی مصلحت کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آ رہے تھے اعلان حرمت



سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبت خدا و رسول نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرام کی حیرت انگیز رعبے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم اپنی اور فرمان نبوی نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور مچھ سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام  
ملکی سیاستوں کا فرق عظیم  
مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمت شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشر کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، ان کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغض اور نفی دنا پاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرین صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستوں میں ترمیم کر کے امتناع شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے ارباب سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعت قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکہ کے حالات و معاملات کا یہ عظیم منسحق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں خود کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعت اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکر آخرت کے کیما دی نئے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسول کی آواز پر اپنی جان و مال آبر و سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں سکی زندگی کے پورے دور میں یہی انفراد سازی کا کام رہا سنتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جان نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکر آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ پے میں فکر آخرت سمائی ہوئی تھی۔ کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس فوجہ کیما کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ  
اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈال جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجہ ہیں، آخر میں چند نفی حناطی بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنی انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی وہ جسمانی اور قوت کے اعتبار سے ٹھیک سے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ



شراب بگرا اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، بیل کی پیاری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں بیل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدمی اموات مرض بیل میں ہوتی ہیں اور آدمی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جبکہ وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود وقت مافکہ کو بھی ضیعت کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی قوت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جز بدن بنتی ہے اور نہ اس کا خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت کم ہو جاتی ہے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے جس سے دفنی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعہ ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ نیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کے شرابیں یعنی وہ رنگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں روح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھا پا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور نفیس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار سیل تک قوت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر دیرینہ طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت دور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعت اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۃ مائدہ میں نص صریح کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُزَيِّدَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ (۱۰۵)**

”یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور تجربے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے“ شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر دیتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہو اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ ام الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: **وَيُضِلُّكُمْ كَثِيرًا ذِكْرَ اللَّهِ وَغِنَى الصَّلَاةِ (۱۰۵)**۔ یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قیس بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ام الخبائث ”یا اثم الفواحش“ ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ قول ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آرمے شراب خانے بند کر دیے جاتیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آرمے شفا خانے اور آدھو جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لفتح عبیدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب التجوہر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب ”تخاطر و سوانح فی الاسلام“ میں لکھتے ہیں: ”بہت زیادہ ہسلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بچ کئی گئی اور وہ دھماکا



تو ارجح سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الہیہ اثر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ ان کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل دغوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دودھ چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک انگریز قانون دان بتام کہتے ہیں کہ :

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکہ لگ گیا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ جس ہے، شیطانِ عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس آئم الخبائث سے باز آ جاؤ،

فَهَلْ أَنتُم مِّنْهُمْ هُونٌ - (۱۱:۵)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اور پر آچکا ہے سورہ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے :

وَمِنْ شَرِّهِ الشَّيْءُ الَّذِي تَتَذَكَّرُونَ	اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ
الْأَعْنَابُ سَخِيحٌ وَرَنٌّ يَمْشِي	کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو،
مَنْعَرًا وَرَنًا قَاحًا، إِنِّي فِيهِ	بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل
ذُلٌّ لِّالَّذِينَ لَا يَتَّقُونَ يَتَّبِعُونَ الْهَوَا	جو قتل رکھتے ہیں۔“

پہلے آیتوں میں حق تعالیٰ کی ان نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے دودھ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا کہ ہم نے دودھ پلایا، اس کے بعد سنسرایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور صنعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اس دخل کے نتیجہ میں وہ طرح کی چیزیں بناتی ہیں، ایک نشہ آور چیز جس کو غریب شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزقِ حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت نعت ہونے سے نہیں بچل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کو نسا استعمال حلال ہے کو نسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزقِ حسن“ رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جھوڑے پھل کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، رزقِ المعانی، قرطبی (جصاص)

یہ آیات اتفاق امت کی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نازل آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان مام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پیا اچھا نہیں، بعد میں صراحت شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (ذہا ملخص مانی الجصاص والقرطبی)

۱۵۔ بعد مامانے اس کے معنی سکر یا بے نشہ نمیز کے ہیں (جصاص، قرطبی)، مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲۔



## حرمت قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کر نیوالے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوتے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جو اکیلے ہوتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پوتے اونٹ کی قیمت اور اگر نا پڑتی تھی، گوشت سب فقرائیں تقسیم کیا جاتا تھا اور استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوتے میں چونکہ فقر کا فائدہ اور جو اکیلے والوں کی تفاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعث فخر سمجھے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو بخوس اور مخوس کہتے تھے۔ تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوتے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام المسترآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاذ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعب والجنین، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہو، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے ٹکڑوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا انکھاطرۃ من الکھتارۃ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔ (روح البیان) ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کسب جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاشری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا نادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں دشامی، ص ۲۵۵ جلد ۲ کتاب الخطر والاباحۃ، مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر نادان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، سب میسر اور قمار اور جو اکیلے گا، معنی حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاشری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب العام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے اعادیث صحیحہ میں شرط نفع اور جو سر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مال کی حاجت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی حاجت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نزد شیر (جو سر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرط نفع میسر یعنی جوتے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شرط نفع تو نزد شیر سے بھی زیادہ بڑی ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مگر جب سورۃ روم کی آیات غُلِبَتِ الرُّومُ نازل ہوئی، اور مسترآن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسری سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط پھرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غلب آئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور متعارف سے ہمیشہ آپؐ نے جہتنباب کیا، اور خاص خاص صحابہؓ کرام بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کسی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے یہوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کسی بُت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی پیروی اور اہل بیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کسی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ بھوٹ بولنا دناہیت اور زالت کی بات ہو



اس لئے کبھی بھلاست میں بھی بھٹ نہیں بولا (روح السببان)

قمار کے سامنے اور اجتماعی نقصان (تارمین جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جاتے تو بیٹے بیٹے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجتماعی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رد بارے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح بھید حالت میں رہتی ہے اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی افلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسائی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خوشخوار و درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جہانز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بگھٹی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسبے مادہ محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش ہی رہتی ہے کہ بیٹے بھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر در چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن نئے نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طسریقے بنگلنگ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تقوڑا تقوڑا رہ رہ کر جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو در چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی برابری کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے مام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹڈ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمایا ہے، اِنِّیْ لَا یُکُوْنُ ذُوْ لِقَابَیْنِ الْاَغْنِیَا وَیُنْکَدُ (۵۹: ۵۹)، یعنی مال نے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار میں جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے،

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یَّوْثِقَ  
بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَا فِی  
الْاَمْرِ دَیْنِیِّ وَیَصُدَّ کُمْ  
عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَتَعِنَ الصَّلٰوۃَ (۵۹: ۵۹)

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے  
کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض  
و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز  
سے روک دے ۵۹

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے پھلے بڑے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریقہ ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو



قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

تو لوگوں کے مال باطل طریقہ پر مت

یَا بُنَايِلِ - (۲: ۱۸۸)

کھاؤ۔

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دعتہ بہت سے گھر بار ہو جاتے ہیں، لکھتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان معیشت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملے کئے ہوتے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جاتے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر رہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھا کر اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جائے۔ یہ مختصر فرست ہو قمار کے مفسدہ کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہو بلکہ اس کے سب متعلقین اہل دعیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا:

وَأْتِمِزُوا آخِرَ يَوْمٍ تَغْيِيهِمُ، یعنی شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد | اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضریت بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دنیا کی کوئی بھری سے بھری چیز بھی منافع سے خالی نہیں، نہ ہر قاتل میں سانپ اور بچھو میں، ورنہ دلوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، دھوکہ، فریب، وغیرہ تمام جرائم میں کوئی ناسمجھ ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل دہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فائدہ تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ انکی

مضر فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور قمار کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مضر اور دینی و دنیوی مضریتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضریت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضر بھی پہنچتی ہے تو مضریت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضریت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۚ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہے جو کچھ اپنے خرچ سے اس طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۸﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ

تمہارے واسطے حکم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّتِي تُقِيلُ قُلُوبَهُمْ تَحِيْرًا وَانْ تَحَالِفُ لَهُمْ

اور تم سے پوچھتے ہیں انہوں کا حکم کہہ دے مسوازان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ غلط ہو تو وہ

فَاَحْوَاؤُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمَصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

تمہارا بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خراب کرنے والے اور سوار کرنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْتَدْتُمْ لَآلِئًا ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ

تم پر مشقت ڈالنا، بیشک اللہ زبردست جو تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَآئِمَّةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَا تُحِبُّوهُنَّ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور ایسے مؤمنی مسلمان بہتر ہے مشرک بیوی سے اگرچہ وہ تم کو بھل گئی،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور ایسے غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُشْرِكٍ وَلَا تُحِبُّوهُنَّ ۚ وَلَكِنَّ يَدَّ عَوْنٍ إِلَى النَّارِ ۚ وَاللَّهُ يَدْعُو

سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے



إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم کو لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

تصیحت قبول کریں۔

## خُلاصہ تفسیر

۱۹ سُوہواں حکم، مقدار اتفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخری تکلیف میں پڑ جائیں، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو۔

۲۰ سُوہواں حکم، مخالفتِ تمیم رچو نکہ ابتداء میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی تمیموں کا حق دینے میں پوری جستیا طہ تھی، اس لئے یہ دعید سنائی گئی کہ تمیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگکے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کر لے گئے کہ ان کا کھانا بھی الگ بکولتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھانا تو کھانا بچتا اور سترتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ تمیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور تمیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا اور لوگ آپ سے تمیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ راصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے (تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلاف مصلحت ہے، زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ وہ (بچے) تمہارے (دین) بھائی ہیں اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں اور اللہ تم مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یشیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی

تیک یہی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس معاملہ میں سخت قانون معتر کر کے، تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس کو مقرر فرمایا کہ وہ) سخت دالے بھی، میں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

۱۸ اور نکاح مت کر دو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ مسلمان اٹھارہواں حکم مناکحت کفار نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزادی بی بی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر عورت بوجہ مال یا جمال کے، تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت درجہ تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزادی کیوں نہ ہو) گودہ رکافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے، تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وہ ان کافروں کے بڑا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے مانعت نکاح کا ہے یہ ہے کہ یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں) جانے کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے) حاصل کرنے کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ہر طور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمایا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور سختی جنت و مغفرت ہو جاویں)۔

۱۷ فوائد زبانِ اقرآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اپنی کتاب سمجھ جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عورتانگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقدہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد سوائے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہوا سے نکاح درست نہیں لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

۱۶ مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں اسے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جائے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح کو جاتا ہے جیسے آجکل بہت آدمی اپنے مذہب کے نادانانہ سنس نے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیے ہیں لوگ واپس پر واپس کو پیا آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔



## معارف و مسائل

**مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے** آیات مذکور میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یکجہلیت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور شرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریب محبت و مودت کا لازمی اثر ہے کہ ان کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت ان کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرمادیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ** (۵۰)، اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام ان غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات شریعہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مصادی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں مشرک بنک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا، بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ نقطہ ضعیف ہوتی ہے اور پھر شوہر اس پر ماکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی قوا احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو جائیں وہی اسلام قبول کر لے تو اس کا مقتضایہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں بحث کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچے گا، اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، غار کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ **عقل مند تریاق بیعتین دزہر گہاں** غور و اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت ہو جائے گی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو کم زور دیندار ہونے کا موقع میسر نہ آئے، اور جب غیر مسلم مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو یہ غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب غیر مسلم عورتی عراق دشنام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اندیشے



کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ مشرمان اُن کو اس سے رکب دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیا نہ بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی در کتاب الآثار (علامہ محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہودی و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مفکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا استرار خود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب حدیث و فاع میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاردن اعظم کی دور میں نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلاتے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی توہمت عیسائی یا یہودی کہی جاتی ہے اگر ان کے مالا کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ علمت نکاح کا استرانی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُذِنَ لَكُنَّ بِهِنَّ مَا لَمْ يَأْتِ الْكِتَابَ سے مستثناء میں داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِيِّ قُلْ هُوَ أَذَىٰ فَأَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور جو سے بچتے ہیں حکم حیض کا کہہ دے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے چھٹ

الْمَحْضِيَّ وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّىٰ يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہوا ان کے جب تک پاک نہ ہوئیں پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاذبان کے

مِنْ حَيْثُ أَمَرَ اللَّهُ مَا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ

پس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں تو بہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِينَ ۝ نِسَاءُ كُفْرًا لَكُمْ فَأْتُوا حُرِّمًا لَكُمْ

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کہتی ہیں سو جاذ اپنی کہتی ہیں جہاں سے

سَلَّمْتُمْ زَوْقًا مَوْلَا أَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

اس سے ملتا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

## خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع | وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ (الی قول) وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ اور لوگ

کی عزت اور پاکی کی شرائط | آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ

فرما دیجئے کہ وہ (حیض) اللہ کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے سے

علحدہ رہا کرو اور اس حالت میں، ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض) پاک نہ ہو جاویں

پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں کہ ناپاکی کا شک شبہ نہ رہے) تو ان کے پاس

آ جاؤ لیکن ان سے صحبت کرو جس جگہ سے تم خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے)

بقیسا اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں تو بہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت

حیض میں محبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر تو بہ کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک سات رہنے والوں سے (جو

حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے مہنیات سے بچتے ہیں، اور حالت پاکی میں اجازت

محبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو اس لیے کہ تمہاری بیوی

تمہارے لئے (بمنزلہ) کمیت کے ہیں جس میں لطف بجائے تم کے اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے)

سو اپنے کمیت میں جس طرف سے چاہو آزاد اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح

بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کر دہ سے ہو یا پیچھے

سے یا آگے پیچھے کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کمیت

کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کمیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت

نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے

اپنے لئے کھلا اعمال صالحہ کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو

کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے

ایمان داروں کو جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جائے کافین رکھیں جوئی

کی خبر سننا دیجئے کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی۔



وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشان اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور رکوع

بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۸﴾

میں سلوک کرنے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی قسم نہ کھاؤ کہ تم بینک کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لادو)

لَا يُؤْخَذُ كُمْ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤْخَذُ كُمْ

بیش پکڑنا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑنا ہے تم کو ان قسموں پر

بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۹﴾

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۹، بھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار دیگر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار دیگر نہ فرما دیں گے اس بھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار دیگر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً بھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی ہمت دی

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کے لئے ہمت ہر چار مہینے کی پھر اگر

كَأَوْ فَاَوْ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۰﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

اہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا ہنس رہا ہے، اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دیجئے کہ

فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۷﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۷، ایلا رکا حکم اللہ تعالیٰ (الی قول) سمیع علیہ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہمت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کریں تب تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چرک اب باقی کے حقوق ادا کرنے کا اس پر وقت فراہم کرے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو دوبارہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَسْرَاحِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس وقت میں اگر چاہیں

إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۱، مطلقہ (الی قول) إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے ان سے صحبت یا خلوت چھوڑ چکی ہو



وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصَلُّوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشان اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری اور رکوع

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾

میں سلوک کرنے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۸، ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی قسم نہ کھاؤ کہ تم بینک کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لادو)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْ اَیْمَانِكُمْ وَلَٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمُ

بِیْمَانِكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ فُلُوْا بِكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۹﴾

بیمانگاہی تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن بھڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۹، بھڑتی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار دیگر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار دیگر نہ فرما دیں گے اس بھڑتی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار دیگر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً بھڑتی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی ہمت دی

لَّذِیْنَ یُّؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَابِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے ہمت ہر چار مہینے کی پھر اگر

فَاَوْوُوا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

اہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا ہنس رہا ہے، اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دیں تو

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِیْمٌ ﴿۴۱﴾

تو بیشک اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۴۱، ایلا رکا حکم الَّذِیْنَ یُّؤْلُوْنَ (الی قول) سَمِيعٌ عَلِیْمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی ہمت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کریں تب تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چرک اب باقی کے حقوق ادا کرنے کا اس پر وقت فراہم کرے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو دوبارہ گزرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْبٍ وَلَا یَحِلُّ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال

لَهُنَّ اَنْ یَّكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْ اَسْرَاحِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنْنَ

ہیں کہ چھار رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ اَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا

اللہ پر اور پہلے دن پر اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے واپس لینے کا اس وقت میں اگر چاہیں

اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِاَتْمَاعِهِمْ وَنِفِّهِمْ وَلِلرِّجَالِ

سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو

عَلَیْهِمْ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۲﴾

عورتوں پر فضیلت ہے، اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۴۲، مطلقہ وَالْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ (الی قول) اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی مدت یا زائد مدت تک ان عورتوں میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت چھوڑ کی ہو



ان کو جین آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، تین حیض ختم ہونے تک (اور اس کو عذرت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ صل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عذرت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (جو اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ ان کو طلاق رجعی ملے ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے بلا تجدید نکاح) پھر نکاح لینے کا حق رکھتے ہیں اس عذرت کے اندل اور اس کو نکاح لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، مگر رجعت تو ہو ہی جاوے گی اور یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق (مردوں پر) جو کہ دفعی وجوب ہیں، مثل اپنی کے حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور راجعی بات ضرور ہے کہ مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ تو ہر دست رحاکم) ہیں۔

دادر، حکیم رحیم، ہیں۔  
مسائل متعلقہ آیت (۱) اگر غلبہ شہوت سے حالت حیض میں صحبت ہو گئی، تو خوب تو بہ کرنا از بیان العشر آن واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔  
(۳) نفقہ قسم کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ کل گئی، یا کھلی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زیادہ آگیا جو اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم کل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم کل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اس واسطے نفقہ کہتے ہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر منسخر مایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو نفوس کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی الذکور میں ہر درجہ اولی کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی نفقہ کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو نفوس لئے کہیں گے کہ مواخذہ نہ رہی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لفاظ لغو نفوس کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہو منعقد کھلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اول، دوم اور سوم کو شرع میں ایلا کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ ادا کرنا باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حنبلہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

## معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و درجات پر ایک ایک جانب آیت  
وَلَقَدْ مِثْلُ الَّذِي نِيَّ عَلَيْهِمْ بِالْمَعْقُودِ مِنَ الْآيَةِ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی دکر تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف | اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدل نظام کا مقتضی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے ادنیٰ پنج یا انحراف انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا بھر کے دور پیریں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقاء اور تعمیر و ترقی میں عہود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی



چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی ہن جاتی ہیں۔

فترآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ای دو لون چیسروں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ ان کے فوائد و عزائم زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے۔ دولت کا صحیح مقام اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے اس کا بیان اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے اور تقریباً ہی مضمون سورۃ نسا کی آیت میں اس طرح آیا ہے۔

الزَّكَاةَ ۖ قُلُوبُهُمْ عَلَى الْبُغْيِ يَتْلُو	"یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے
فَقَضَلْنَا مِنْهُمْ لِقَاءَ الْعَذَابِ ۖ وَ	کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر اور
يَتْلُو آتُونَ إِلَيْهِمْ ۖ (۲۲:۲۲)	اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال

اسلام سے پہلے معاشرہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت میں عورت کا درجہ کی حیثیت مگر طوطی استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوبازوں کی طرح اس کی خیر و فردخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی سیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے ادبیا جس کے حوالے کر دیتے رہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود مگر طوطی اشیاء کی طرح مالی وراثت بھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیسر پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ مالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ تمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں اب بھی اگر اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، آدمی کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں روح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دینے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہنا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سستی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے مششہ میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ تسرار داد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو مرن کر بدن کے گرد گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں غفلت وانش سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جاتیے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لئے ہونے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک مسترادی تھی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا کہ کون کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادا، حقوق پر دردمندان پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور عورت کو اس کے حقوق مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت و نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی تھی جس کو اسلام نے مثایا ہے، اسی طرح ان کو کھلے ہمارے چھوڑ دینا خواہ مال کا بہت بڑا سبب ہے اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود مشغول بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متعل ہے اور نہ مگر بلو کانون کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃ اس کے سپرد ہے وہ اس کا متعل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطۃ عظیم ہے جس سے دنیا میں نساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہوتا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ



ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق و واجبات کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ  
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي حَيَاتِهِمْ يَرْجُونَ (مائدہ ۹۰) اور دوسرے لفظوں میں  
یہ کہ مردان کے نگران اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ  
عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہ انحطاط  
میں جاہلیتِ آخری کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی  
صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چشمک را حاصل کرنے اور کراہی  
کی سبب مسلسل جاری ہے جس کے نتیجے میں غمخیزانِ عالم ہو گئی، دنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر  
بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جاہلیتِ اولیٰ کو مات دیدی، عرب کا مشہور مقولہ کہ  
”أَلْبَاهِنُ رَمَاهُ بِطَلْعِ أَوْ مُكْتَسَبٌ“ (دین جابل آرمی بھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی  
حد سے زیادہ کرنے سے باز آتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار  
نہ تھے اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ فردوں کی سیادت و نگرانی جو فردوں عورتوں اور پوری  
دنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا بخرا بھی گردن سے اُٹا رہا جا رہا ہے جس کے نتائج بد فواید  
آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں  
ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دنیا میں قیام امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے  
نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ ان پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چٹھے سے پھوٹ  
رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ  
فساد و خون ریزی اور باہمی جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے  
زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے ہمار آزادی نکلتے گی، مگر آج کی دنیا میں نفس پرستی کے  
غلبہ نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیر کیا ہوا ہے خواہشِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ  
تدبیر کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ  
وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، کہ وہی دنیا و آخرت میں سرمایہٴ سعادت ہے۔

مسئلہ: اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ مسلمان حکم نے زوجین کو ان کے ذمہ  
عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ  
عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ  
کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہٴ حقوق کا قضیہ ہی دنیا  
میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق میں اور عورت کے فرائض ہی مرد کے  
حقوق میں، جب فرائض ادا ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آج کل دنیا کے سارے جھگڑے  
یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل  
اس کا نتیجہ مطالبہٴ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آج کل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں زوجین  
میں، اور دوسکرا بل معاملہ میں چلی ہوئی ہے، قرآن کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رخ کو یوں بدلا  
ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں  
مساہلت اور عفو و درگزر سے کام لے، اگر اس شرابی تعلیم پر دنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور  
خانہ دانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تقرب دنیا میں نظامِ عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا  
دنہی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں۔ نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ ان پر لازم کیا جائے، اس کا بیان  
آیت ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں  
سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام ترمذار ایمان اور عمل صالح پر ہے، وہاں  
درجات کی ترقی و تدریج ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے امورِ آخرت میں  
یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسب تصریح آیات  
در روایات ایسا ہو گا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق  
ہو جائیں گی، ان کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

شرآن مجید میں احکامِ شرعیہ اور اعمال کی جزاء و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ  
حسب تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل  
طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغہ مذکر  
کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے  
قوانین میں بھی صیغہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانونِ مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے  
اس کا ایک سبب تو وہی منسوق ہے جس کا ذکر شرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں



ہر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمین ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے ان کو خیال پیدا ہوا تو اتم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی۔  
 اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ  
 مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجات جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں، یہ روایت لسانی ہنسبہ احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جا بجا مردوں کا ذکر ہے عورتوں میں سے ازواج مطہرات کا بھی مستقل ذکر ہو کر مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت اعلیٰ مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، اور دنیا کی جزائر و سوا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ بھی مضمین اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے۔  
 مِّنْ عَمَلِكُمْ صَالِحَاتٍ  
 ذِكْرًا ذُنُوبَكُمْ وَأَن تَكُونَ مِنَ الْخَالِفِينَ  
 خیرۃ طیبۃ (۹۴: ۱۶)  
 اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لِّكُلِّ شَيْءٍ مَّخْرَجًا  
 "میں جو مرد و عورت ایک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔"

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لِّكُلِّ شَيْءٍ مَّخْرَجًا  
 ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خدا داد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، مگر عورتوں کے حقوق کی ہوتی چاہئے، کہ وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مبالغہ نہ کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مثل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد و عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض قطعاً مجزا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

اور ایسی ہی جگہاں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تفصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان فہم حقوق و فرائض کو کیا سمایا ہے، کیونکہ مہم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْعُرْوَةِ اور بڑھاکر آپس میں پیش آنے والے جگہوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو مشرقاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عروت کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو اس کا حاصل یہ ہوا کہ مرد و عورت کے حقوق اور ان کو ازیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پڑی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی، بے اتھالی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْعُرْوَةِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا ذَلِيلًا يَّتَجَاوَى عَلَيْهِمْ ذَرْبُ جَنَّةٍ اس کا مشہور مطلب مفہوم تو یہی ہے کہ حقوق طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے فردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ میں اشارہ فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے ان کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے ان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

الْطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيمٍ بِإِحْسَانٍ وَلَا

طلاق جس سے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بحسن و احسان اور تم کو

يَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَتَخَفَا

روا نہیں کہ لیسو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاندان و عورت دونوں ڈریں اس

أَلَا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں حکم اللہ کا پھر اگر تم ڈرو اس بات کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں اللہ کا حکم



فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کہہ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے جو شوہر سے اس کی مرضی سے اس کے متوجہ ہو

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ مَحْضِيَّتِكَ زَوْجًا غَيْرَ ۚ فَإِنْ طَلَقَهَا

دی دینی تیسری بار تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی غرض سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ لَمَّا أَنْ يَقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَ

دوسرا خاوند تو کہہ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يَبَيِّنُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

## خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دوسرے طلاق دینے کے بعد دوبار اختیار نہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے (خواہ وہ)

کر رجعت نہ کرے، عذرت پوری ہونے سے (اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور تہا سے یہ بات معلوم نہیں کہ (میں نے اس کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لیا (اگرچہ وہ یہی) اسی (مال) میں سے (کہیں نہ ہو جو تم نے دی ہو) ان کو دیا تھا اگر (ایک صورت البتہ حلال ہے)

وہ (یہ کہ کوئی) میاں بیوی ایسے ہوں کہ دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ

ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے مگر تم کو دینی میاں بیوی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس حال کے لینے دینے میں جس کو دے کر

عورت اپنی جان چھڑاتے، (بشرطیکہ ہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خداوندی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلو اور جو شخص خداوندی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقیں کے بعد حلال

پھر اگر دو طلاقیں کے بعد (کوئی) تیسری طلاق (دی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ

عذرت کے بعد نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عذرت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ

دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خاوندی ضابطہ کو قائم رکھیں گے اور یہ خاوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

## معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے مسائل میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہو، جیسے اور مسلمانانہ نظام

بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملہ

و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء

میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا

معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی مشترک بھی اختلاف و عکبار بھی نہ کرے

اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی

شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مستحسن ہیں۔

۱۱م عظیم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت

کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھنے، طلاق کا حاصل نکاح کے



معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہیے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا اہل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد و فتنہ کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بڑی طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، نہ وہ جن کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقیت کی صورت میں اول اہتمام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی آیت **مَنْكُم مِّنْ أَهْلِيهِ وَبَيْنَكُمْ مِّنْ أَهْلِيهِمْ**، ۲۳۰ میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جائے اور دلوں میں زیادہ بے حد پیدا ہو جائے گا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتاً فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جائے عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم پہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم مشرع کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے اطلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزاد اختیار تو دیا، مگر ازل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

ابغض الحلال الى الله الطلاق  
یعنی حلال چیزوں میں سے مکروہ زیادہ مبغض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالت ہلم میں بھی، جس طہر میں صحت و ہستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا **فَطَلِّقُوهُنَّ رِحْلَةَ بَعْضِكُمْ**، ۲۳۱ یعنی طلاق دینا ہر تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوتی تو موجودہ حیض کی عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حل رہ گیا ہو تو عدت وضع حل تک طے نہ ہو جائیگی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہو کہ غصہ فرد ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے ازل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دوسری عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس کو



حکم یہ دیدیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا: اِنْ طَلَّقَ الرَّجُلُ مَرْءًا یعنی طلاق دوہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ چمک دکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَ الرَّجُلُ مَرْءًا ثَلَاثًا یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی بھوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا: وَلَا يَجُوزُ لَكُمْ أَنْ تُخَالِفُوا مَوَدَّتَهُمْ فِي شَيْءٍ یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لینے، البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَ الرَّجُلُ مَرْءًا ثَلَاثًا یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی، تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے)

میں دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مر جائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا ثَلَاثًا علیہما أن یتکثر اجتماعا کا یہی مطلب ہے۔

میں طلاق اور اس کے یہاں مسترآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت احکام کی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظ آیت اِنْ طَلَّقَ الرَّجُلُ مَرْءًا کے بعد تیسری طلاق کو حرج (اِنْ) کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا ثَلَاثًا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، درجہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اِنْ طَلَّقَ الرَّجُلُ مَرْءًا کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے میں طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ و تابعین سے عدت طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں جماعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہؓ نے اسی کو طلاق بہتر طریق قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیمؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہؓ کرام طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین جہن پورے ہونے دیتے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائے



مگر مؤثران کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، انطلاقاً خلافاً سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مؤثران ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں بھی کہ کوئی شخص کسی کو دو دفعہ الگ الگ دفعہ دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہریں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحق ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا بغض کر دیا ہونا ثابت ہوتا ہے، آم نسا نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ:-

ان خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاثاً تطليقات جميعاً فقام غضباً ناثراً قال اي لعجب بكتاب الله وانما بين اظهر كبر حق قام رجل وقال يا رسول الله الا اخذت رضائي كتاب الطلاق، ص ۹۶	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کھینچ لیا گیا ہے، حالانکہ میں تمھاری درمیان موجود ہوں اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کروں!
---	--

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیم نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے (ذاد المعاد) اور جوہر نفی میں علامہ دارقطنی نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حجر نے مؤلفون فرمایا ہے۔

اس بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ خلاصہ یہ کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک بغوض و مکروہ فعل ہے، اگر مجبوری اس وقت دام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے میں تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی ہیں، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقا، نکاح کے لئے کافی ہو گا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اس وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دے تو اس نے قطعاً نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہی رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد ہر اضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی کہ **يَتَعَنَ ذِي الْاَرْثِ يُخْتَارُ**، اس میں کائنات کے ہر ذوق کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اس کا یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزار کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **اَوْ تَتَّبِعُوا طَرِيقَ الَّذِي سَلَكَتُمْ** فرمایا، تسریع کے لئے کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی



ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔ امام حدیث ابو داؤد نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَنْسِيْ بِكُمُ الْيَحْسَانَ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا چہرہ علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جاتا کہ عدت کے اندر رجعت ذکر کرے، اور جس طرح اِمْتَنَانٌ کے ساتھ بِتَعْرِؤٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت شرعی کی کہ رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو جس سلوک کے ساتھ روکا جائے وہی طسرح تَنْسِيْ بِكُمُ الْيَحْسَانَ کے ساتھ یا يَحْسَانَ کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا نسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور محنتِ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فریغ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتَّحُوْنَ عَلَيْكَ الْمَوْسِعُ قَدْ رُفَا  
وَعَلَى الْمَعْتُوْرِ قَدْ رُفَا (۲۳۶:۲)

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سائے اختیار شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلا ضرورت ختم کر دینے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔ اگر کسی نے غیر محسن یا غیر مشروع طریقہ سے اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتل ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا اتفاق مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے بھل ہی جاتا کہ اس طرح تمام معاصی اور جبرائیم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ

اپنے سائے اختیار طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اس لئے جہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ انہما بخصب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہرہ محمد سرزاد صاحب کی کتاب عمدة الاثر بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

عمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اور پر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعتی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آئی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث عمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم يرده النبي صلى الله عليه وسلم  
بل امضا كما في حديث عويسر  
العجلاني في اللعان حيث مضى  
طلاقه المشلاش ولم يرده  
وتحذيرين ابن ابي طبع مصر  
از عمدة الاثر

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً  
~ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق



فَنَزَّوْجَتِ فَطْلَقَ فَنُفِلَ الْمَنْبِي  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَصَلَ  
لِلْأَوَّلِ قَالَ لَاحِقِي يَذْوَ عَيْلَتَا  
كَمَا ذَا قَبَا الْأَوَّلِ

صحیح بخاری، ص ۲۷۹، ج ۲  
صحیح مسلم، ص ۲۶۳

دی اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا  
تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق  
دی یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا  
کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟  
آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا  
شوہر اس سے بچہ نہ کرے لطف اندوز نہ ہوگا

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؟  
اتفاقی روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروع حدیث  
فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی مترادف دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین  
طلاق دی گئیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو  
نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہیبت نہ ہو جائے، تو اس کے  
طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر غلامانیؓ کی ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فَلَمَّا خَرَفَا قَالَ عُوَيْمِرُ كُنْتُ بَشَرًا  
عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْ أَسْكُنَهَا  
فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ  
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
دعیم بخاری، فتح الباری، ص ۳۰۱، ج ۲  
صحیح مسلم، ص ۱۵۲۸

پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ  
ہو گئے تو عویمر نے کہا اے اللہ کے رسول میں  
اس پر مجبوت ہونے والا ہوں گا، اگر میں نے  
اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویمر رضی اللہ عنہ  
نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے  
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دے۔

اور ابو ذرؓ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت ہبل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَالْفَنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
مَنْعَةً قَالَ سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ هَذَا  
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدَ ذَلِكَ

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے فہم  
فرادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا  
سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول  
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا  
پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

الْمُتَلَا حِينَئِذٍ أَنْ يَفْتَرِقَ بَيْنَهُمَا  
ثُمَّ لَا يَجْعَلُ حَالَهُنَّ أَبَدًا دَابِدًا وَدَابِدًا  
ص ۲۰۱، طبع اصم المطابع

بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان  
تفریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی  
جمع نہ ہوں؟

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں  
کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک  
طلاق دینے سے شرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں  
طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار  
اور اس پر اشکال جواب دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک  
اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث  
میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ  
الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَابْنِ بَكْرٍ  
وَسُنَّتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَا  
الْمُتَلَاثِ وَاحِدَةً فَقَالَ عُمَرُ  
الْمُتَلَاثِ إِنَّ النَّاسَ قُلَى مُتَجَلِّوْا  
فِي أَمْكَانَتِ الْهَمِ فَبِهِ أَمَّا فُلُو  
أَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ

تبعث ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت  
ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت  
کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا  
تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ  
نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسا معاملہ  
میں جس میں ان کے لئے ہلکتی تھی تو مناسب رہو گا  
ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو آپ نے ان پر نافذ کر دیا

(صحیح مسلم، ص ۴۴۷، ج ۱)

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی سے  
اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا  
ہے، زر قانی شرح مظاہر میں یہ الفاظ ہیں:



والجہود علی وقوع الثلاث بل  
یحییٰ ابن عبد البر الاجماع  
قائل ان خلافہ لا یلتفت الیہ  
وذرقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷ (۳۳)

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالك والوحيفة  
واسمٰن وجماہیر العلماء من  
السلف والخلف یقیم الثلاث  
وقال طائفة وبعض اهل الظاہ  
لا یقیم بنی ثلاث الا وحده۔

(شرح مسلم ص ۱۳۷۸)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں منسرایا:

فخطب عمر بن الخطاب  
جميعا وفيهم اصحاب رسول الله  
صلی الله علیہ وسلم رضی الله  
عنہم الذین قد علما ما تقتضی  
من الذل فی زمن رسول الله  
صلی الله علیہ وسلم فلم ینکرو علیہ  
منہم منکروا لہدین فحہ دافع  
(شرح معانی الآثار ص ۲۸۹)

اور جہود امت میں طلاق کے واقعہ پر  
پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع  
نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شانہ ہے  
جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ،  
امام احمدؒ اور مسند و طحاوی کے جماہیر علماء  
نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہونے پر اور  
طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے  
ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے؟

نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے  
ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں  
میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ  
بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا  
علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے  
نے اسے زد نہیں کیا، اور کسی زد کرنے والے

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ و تابعینؓ مسترد ہو گئی کہ تین  
طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر  
اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بعض  
دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد  
روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر  
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جسد کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا،  
کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا  
تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ منسرایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں  
تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض  
ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیے ہیں، ان میں  
صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے،  
کہ فاروق اعظمؓ کا یہ منسردمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت  
کے متعلق منسردمانا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق  
کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے  
نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے  
مکر رکھا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے  
ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی،  
اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید  
کے لئے یہ الفاظ مکرر ہوئے تھے تو آپؐ اس کے علنی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی  
طلاق منسرد دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ  
انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عربی عام میں تین  
طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا منہم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری  
نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے  
ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں  
مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتہ سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ  
عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہو



بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انہوں نے علف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر عین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، ان سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بڑی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوگوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انہوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی  
امور کانت لهم فیہ اناة فلو  
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے  
معاملہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،  
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کریں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہو، واللہ الموفق والبعید

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی ختم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ ان پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کچھ نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت شعراء اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا النِّعَمَ الَّتِي عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اناری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ الَّتِي يُعَلِّمُكُم بِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ



بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکانہ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انہوں نے علف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر عین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، ان سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بڑی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوگوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انہوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی  
امور کانت لهم فیہ اناة فلو  
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے  
مسائل میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،  
تو مناسب یہ تھا کہ ہم اس کو نافذ نہ کریں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہو، واللہ العزیز العلیم

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی ختم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ ان پر زیادت کر دو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کجا نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت شعراء اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا النِّعْمَتَ الَّتِي عَلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اناری تم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ الَّتِي يُعَلِّمُكُم بِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ



عَلَيْكُمْ ۖ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبَعْنُ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْصِلُوهُنَّ  
 جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر جیسے اپنی عدت کو تو اب نہ رد کو ان کو

أَنْ يَتَّكِنَ آُرَ وَاجِهِنَّ إِذَا تَرَاَصَّوْا بَيْنَهُمْ بِالسَّعْرِ وَبِذَلِكَ  
 اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ ماضی ہو جاوے آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَمَ آَزَكُ  
 اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارا دیکھو

لَكُمْ وَأَظْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بڑی سخنیں اور دہشت انگیز کی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸، عورتوں اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم کو مکلف رکھنے کی ممانعت

ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت رد کو اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص یہاں

برتاؤ کہے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھینچ دینا، اور حق تعالیٰ کی جرم پر نصیحتیں بیان کرنا، اور صرف کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر اس حیثیت سے مازل فرمائی ہے کہ ان کے

ذریعہ تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹، عورتوں کو نکاح ثانی اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں سے منع کرنے کی ممانعت

تو تم ان کو اس امر سے مت رد کو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے طلاق کر لیں، جبکہ باہم سب رضا مند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس ضمن سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے

اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ مفید اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

### معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی وہ آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دشمنات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکورہ اصول و ذرائع میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ حبی نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایت عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاروں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں

بالکلیت عدت کا لفظ دونوں جگہ ملتا ہے، قاعدہ لاکر اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ رجعت کے لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی

نہتیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، بعض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے اور صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار احوال کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے حصہ ناراضی کو دل سے نکال کر خیر معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا

پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر سستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیت مذکورہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ جِبْرًا رَّا يَعْتَدْنَ ذٰلَ یعنی عورتوں کو اپنی

نکاح میں اس لئے نہ رد کو کہ ان پر ظلم کر دو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۃ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے، وَأَشْهَدُ وَأَذْهَبُ عَذْلٍ وَمِنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ بَيْنَهُ (۲۱۶:۵)، اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرنا، پھر اگر

گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا دروغی گواہی دو۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کر دو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس میں کوئی فائدہ نہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس

گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت کا قاعدہ نہ جاری کیا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی

غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا کہ رجعت کر دو تو اس پر



وہ مستہرگواہ بنالو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عذت کی ہمت اور غرور و فکر کا دقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قلع تعلق ہی برقرار رکھنا، تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہو کہ دشمنی اور انتقامی ہڈی بھرک اٹھیں، جن کا اثر و دشمنوں سے متعدی ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہو، اور طرفین کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے مختصر طور پر قریشی ارشاد فرمایا گیا کہ اَوْ مَن مِّنْكُمْ يَمْلِكُ بِمَنِّهِ اَنْ يَّخْلُقَ كَمَا يَخْلُقُ اور قلع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود مسترآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا، وَلَا يَجْعَلُ لَّكُمْ اَنْ تَاْخُذَ وَاِيْمًا اَنْتُمْ يَخُفُّونَ شَيْئًا، یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہو اسامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد ایک آیت میں ارشاد فرمایا، وَلَا تَمْلِكُنَّ مِمَّا لَمْ يَخْلُقْ وَلَآ تَكُنَّ مِمَّنْ يَحْكُمُ عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲۳۱) سب طلاق دیا ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، اُن پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں، فائدہ پہنچانے کی تفسیر و رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاق اور حسن معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فیج معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حسن سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے اگر طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا ہر خوش دل کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب صحیح و واجب ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور تحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا اے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیسریز عرفاً جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا، وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ، یعنی جو شخص ان حدود و خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بدایں دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے

پنداشت بستمگر کہ جفا بر ما کرد

بر گردن دے بماند و بر ما بگذشت

مسترآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرہبانہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا کہ جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف آخرت کا حساب لایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ [دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، وَلَا تَجْعَلُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا، کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہو کہ نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیئے ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائے گا نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح (آخر جہا بن مرد و یہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں،







فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو کوئی کسی پر زور نہ بردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقیں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کر لیں، یا ایام عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو یا مخصوص اُن لوگوں کو جن کا ان مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بھترہ استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے ہم پر مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدہ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا نَزَّاهُنَّ عَنْكَ الْفَاحِشَةُ اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ما قلہ باللہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضایا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذَلِيقَ يَوْمَ يَخْرُجُ مِنَ الْكَاۤفِرِ مِمَّنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، یعنی یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، اس میں اشارہ نہرا دیا گیا کہ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکام الہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد نہرا دیا کہ ذَلِيقَ يَوْمَ يَخْرُجُ مِنَ الْكَاۤفِرِ، یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پائی اور صفائی کا ذریعہ ہے، اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاتقہ بالغہ جو ان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالتا ہے، تیسرے اگر خدا نخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبال آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قاتل تک فتنہ پہنچائے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبال آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا، اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار

اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے روکنا ہی تمہارے لئے پائی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد نہرا دیا کہ ذَلِيقَ يَوْمَ يَخْرُجُ مِنَ الْكَاۤفِرِ، یعنی تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جاننے میں تم نہیں جانتے، اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت و غیرت کا تحفظ، یا یہ کہ ان کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تمکبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب واقف ہیں، اُن کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقان امور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جن میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو سمجھتے پھرتے ہو مگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہو گئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روز قیامت کے صاب اور جہنم کی سزا سے ڈرا کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفسد اور انسانیت کے لئے مضر ہیں ان کو مبتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم کا یہ اسلوب اور طرز بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے بھی اِنَّ اللّٰهَ تَجَبَّرُ بِمَا تَعْمَلُونَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ، وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظام حیات اور ہر شعبہ زندگی پر حاوی قانون



ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی اداساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مرتبہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی سرکشی کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کرنا انھوں نے ایک قانون بنادیا، اور مشالہ کر دیا جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا اٹھاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دوسری بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سے بچنے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ فشر آئی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا تھا۔

فشر آئی نظام حکومت کا یہی مستیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے، دوسری طرف تربیت ترغیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جسرم و سزاکے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوتی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا بسکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے وال چیز دراصل خوف خدا اور خوف حساب آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلا دیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

أَنْ يُمْلِمَ الرِّضَاعَةَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِشْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ

کرے دودھ کی دلت اور لڑکے والے لین باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا

بِالْمَعْرُوفِ لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدٌ بَوْلًا

موانع دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی غنائش کی موانع، نہ نقصان دیا جائے ان کو اس کے بچہ کی

وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِرَدٍّ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ

دج سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے لین باپ کو اس کے بچہ کی وجہ اور ارادوں پر بھی یہی لازم کہ پھر اگر باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرْضَاهُ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَادَ ثَمَرَانِ

پھر اگر باپ دودھ سے رضاعت لین اپنی رضاعت اور مشورے سے تو ای پر کچھ عشاء نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ دودھ

تَسْرِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنَّمْتُمْ

پلاؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ عشاء نہیں جب کہ حوالے کر دو جو تم نے دینا شہر یا سنا

بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

موانع دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان لے کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳ رضاعت | اور امیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلا یا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی

کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے لئے ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا

جائے اگر اس کی برداشت کے موافق کسی ماں کو یہ نہیں ہو پھانا چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور کسی کے بچے کی تکلیف دینی

چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریق مذکور کے (بچہ کی پرورش کا انتظام) اس کے دھرم قرابت

(دار کے) ذکر ہے جو شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ کچھ لوگ) اگر دونوں (ماں اور باپ) دو سال تک (یا)

دودھ پھر دینا چاہیں، یہی رضاعت ہے اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی کسی مصلحت ضروری سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں پتے کو مضر ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور ماں کا دودھ پلانا چاہو

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ ان کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا ہے کیا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

### معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلے اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے



ذکر کئے گئے ہیں کہ عرّا طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے مسئلہ احکام بیان فرمادیتے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہرہ و مشورہ اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فرقہ پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔ مثلاً آیت کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا، وَالَّذِينَ اسْتَأْذَنُوا فَارْحَمُوهُمْ اُولَٰئِكَ هُم مَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ پھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے۔

دودھ پلانا ماں کے اول یہ کہ دودھ پلانا دیا نہ ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی عذر یا ناراضی کے ذمہ واجب ہے سبب دودھ نہ پلانے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جبکہ اس کے اپنی نکاح میں ہو، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدت رضاعت دو سراسر مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مبالغہ نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اگر تین مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا با اتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے وَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ اِنْ رَزَقَهُنَّ رِزْقًا مِّنْهُنَّ فَاتَّعِزَّ بِمَوْلَاهُمَا وَلَا يَحِلُّ لِمَوْلَاهُمَا الشَّيْءُ الَّذِي يَحِلُّ لَالِئِهِمَا، یعنی ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برواشت نہ کر سکے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ وَالَّذِينَ استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالَّذِينَ جہز کر کے اَلْمَوْلُودِ لَهُ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، لَا يَحْزَنُ وَالَّذِينَ عَنْ تَوْلِيدِهِمْ كَالَّذِينَ وَلَدُوا، مگر یہاں والد کی جگہ مَوْلُودِ لَهُ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طریق بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ اور مشفقانہ

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچے کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں باپ کی مستاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بچے والے کے حقوق کا لحاظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا اور ماں کا نان و نفقہ و ضرورتا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضروریات زندگی باپ باپ کے ذمہ ہیں کے ذمہ ہے، اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ ضرورتاً خود جیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا (منظری)

زوج کا نفقہ شوہر کی حیثیت چوتھا مسئلہ اس پر توافق ہے کہ بیاہنہ دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ طلاق کے مناسب ہونا چاہئے یا زوج کی واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے خصائص کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخجی کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم (فتح القدیر ج ۲ ص ۲۲۲)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تَحْزَنُوا وَالَّذِينَ عَنْ تَوْلِيدِهِمْ كَالَّذِينَ وَلَدُوا، یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں عداوت نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوائے گا،

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور لَا تَحْزَنُوا وَالَّذِينَ عَنْ تَوْلِيدِهِمْ كَالَّذِينَ وَلَدُوا، یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں عداوت نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوائے گا،



تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلَاؤُ ذَا لَكَ بِتَوْلَدٍ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک سباج میں ہے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کی ماں دودھ پلانے کی اجرت تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت سے قوجب تک اس کے سباج یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا مان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچاتا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی آٹا کا دودھ پلاوے۔

قیم بچے کے دودھ پلانے آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قیم بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ پھڑکے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گذارہ ہے، مثلاً اگر قیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں، اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک ہتائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو ہتائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے نابالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور قیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث لَا ذَنْبَ رَجُلٍ ذَكَرَ كَيْفَ يَحْيِي خُلَافَتِهِ، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت ہے تو قیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے زائد بھی ہو سکتی ہے اسی طرح قیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا**، یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی مشروط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو سختہ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت آخر میں ارشاد فرمایا گیا **وَإِنْ أَرَادَتْكُمْ أَنَّ تُسَلِّمُوا وَلَدَكُمْ كَمِ** کا دودھ پلانے کے احکام **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا أَنْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی آٹا کا دودھ پلاؤ تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ہوا اجرت معسرہ کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اس کو معسرہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ نہیں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی آٹا سے پلاوے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی جائے، اس میں مال مشول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد قرآن نے اپنے مخصوص اذکار اور اسلئے کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہا ہے، اور وہ تمہارے دلوں کے غمی ارادوں اور نیٹوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ حق سزا ہوگا

**وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنكُمُ الدِّينَ** اور جو لوگ مجاہدیں تم میں سے اور چھوڑ جا دیں اپنی عورتیں تو چاہئے کہ وہ عورتیں انتظام میں کیلیج آہو







لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ  
 کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگا یا ہو اور نہ معتسر کیا ہو ان کے  
 فَرِيضَةٍ ۖ وَمَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرُهَا وَعَلَى الْمَقْتَدِرِ ۚ قَدْ رُكِبَ مَا  
 لئے کچھ ہوا اور ان کو کچھ خرچہ دو مقدور دالے پر اس کے موافق ہو اور تنگی دالے پر اس کی موافق جو خرچہ کر  
 بِالْمَعْرُوفِ وَفِ حَقِّهَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝ (۳۷) وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ  
 قاعدہ کے موافق ہو لازم ہو تنگی کر لے والوں پر اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور  
 أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا  
 ٹھہرا ہے تمہیں ان کے لئے ہر قیاس لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم معتسر کر چکے تھے عمر یہ کہ درگزر  
 أَنْ تَعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدُ الْبَيْتِ وَأَنْ تَعْفُوا أَخْرَبُ  
 کری عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہو کہ نکاح کی بین خاوند اور تم مرد درگزر کرو تو قریب  
 لِلْقَوَىٰ ۚ وَلَا تَسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۳۸)  
 ہو یہ ہر گاہی اور نہ بھلاؤ احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

### خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۷ طلاق قبل الدخول کی صورت | طلاق قبل الدخول کے سنی یہ ہیں کہ زوجین میں ایک جان اور خلوت  
 میں ہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان | صحیح ہے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے اس کی دو صورتیں ہیں یا  
 تو اس نکاح کے وقت ہر معتسر کی مقدار متعین نہیں کی گئی یا مقدار ہر متعین کر دی گئی پس پہلی  
 صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ (الای قولہ) حَقَّ عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝  
 میں تم پر دہرا کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا  
 ہے اور نہ ان کے لئے کچھ ہر معتسر کیا ہے (سو اس صورت میں ہر اپنے ذمہ مت سمجھا اور (دراصل)  
 ان کو ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے اور تنگ دست  
 کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے  
 خوش معاملہ لوگوں پر دینی سب مسلمانوں پر کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا پڑوں کا دینا ہے۔  
 اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے، وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ (الای قولہ) إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ  
 بصیرت اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگادو اور ان کے لئے کچھ  
 ہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا ہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہو  
 (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں) ایک صورت تو یہ کہ وہ عورتیں  
 (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری  
 صورت) یہ ہے کہ وہ شخص رعایت کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق رکھتا اور توڑنا، ہر  
 زمین خاوند پورا ہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی ہر اور اگرنا ہوگا  
 اور (الای) تمہارا (اپنے حق کو) معاف کر دینا بہ نسبت وصول کرنے کے (تقریبی سے زیادہ قریب  
 ہے) کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تعوی کی بات ہو  
 اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو، بلکہ ہر شخص دوسرے کے  
 ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے (بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے  
 ہیں) تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کر دے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو  
 دیں گے (بیان القرآن)

### معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ (الای قولہ) إِنْ أَلَّ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بصیرت کے  
 لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ہر معتسر  
 نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ ہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت  
 یہ ہے کہ ہر بھی معتسر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آدے، اس میں جو ہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا،  
 یہ حکم شرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ ہر متعین نہ کیا،  
 اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں ہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں  
 رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے  
 کہ ہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی  
 کہ ایک جوڑا پٹریے کا دیدے، دراصل شرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی  
 البتہ یہ بتلادیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحبِ بیت



اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؑ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطالعہ عورت کو بیس ہزار کا علیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدرے (قرطیں)۔

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا ہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت مجھ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے ہر کا نصف مرد کے لئے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیار ہی بات ہے، جیسا کہ آیت: **إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفُوا إِلَيْهِ يَحْتَدُّ عَلَى الْيُكْحَانِ** سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مرد کے پورا ہر دینے کو بھی معاف کئے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ ہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کر لے، اور معاف کر لے کر افضل اور اقرب بالتقویٰ قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعین نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) **أَلَّذِي يَحْتَدُّ عَلَى الْيُكْحَانِ** کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی: **وَلِي عَقْدَةِ النِّكَاحِ الزَّوْجُ**، یعنی عقدہ نکاح کا مالک شوہر ہے، یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جبہ عن شوقل ہے، اور حضرت علیؑ اور حضرت ابن عباسؓ بھی (قرطیں) اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق دی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

**حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝۳۹**

خبردار رہو سب نمازوں سے اور پنج والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

**فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمْنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا**

بہر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

**عَلَّيْكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۴۰**

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

## خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ نمازوں کی حفاظت کا بیان | اس سے آگے جیسے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان مندرجہ اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصامحتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہو، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اتلاف سے درگاہ الہی سے دوری ہوتی ہے، جس کے لازم میں سے حق و عہد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہو اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

**حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ** والی قول، تاکہ نہ ٹکڑو نہ اٹکڑو، حفاظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہو اگر اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی نہ ہو) یا نہ ہو اور گورکوع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو، پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جانا نہ کہ تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی اولیٰ نماز) اس طرف سے کر دو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

## معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ پنج والی نماز مرد نماز عصر کے بعد اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور عاجزی کی تفسیر حدیث میں سکوت کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صبح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)



وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے لئے

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے مگر سے بھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

کر دیں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

وَلَمَّا طَلَّقْتَ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقَّاعًا لِّلْمُسْقِينِ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے فائدہ کے موافق لازم ہر ہر کاروں پر اسی طرح

يُمَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۳﴾

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

## خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے

ذمہ لازم ہے کہ وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (ذات و نفقہ

اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکال نہ جا دیں ہاں اگر چاہیں

دس دن کے بعد یا وضع حل کے بعد عدت گزار کر (خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں،

اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز کریں) جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ

زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہارا

مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلَمَّا طَلَّقْتَ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (الای قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ اور سب طلاق

دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں معسر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا

ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ معسر ہو نا واجب کے

درجہ میں ہو یا استیجاب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

## معارف مسائل

(۱) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الای قولہ) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

وفات زدوں کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن

مقرر ہوئے جیسا کہ اقبل میں آیت يَكْتُمْنَ بِالْأُنْثَىٰ اَرْبَعَةً اَشْهُرًا وَعَشْرًا سے معلوم ہو چکا ہے

مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا،

اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں معسر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی

وصیت پر تھا جیسا کہ آیت کُتِبَ عَلَيْكُمُ اِذَا خَلَصْتُمُ (۱۸۰:۱) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے

یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک

اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے

اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے

دارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا

حق درختہ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی

مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا عورت

کے لئے بھی اور جو منہج کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل

ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ

سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلَمَّا طَلَّقْتَ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (الای قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ

پہلی آیات میں بھی آپکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا جن کو صحبت خلوت

سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ

تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق و ایان رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے

سوائے جس کا مہر معسر رکھا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر معسر

نہ اور قاعدہ سے مراد یہ تفصیل ہو جاتے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت

کما جائے گا، اور حقا کو واجب کے معنی میں نہ لیں گے اور علیٰ الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ بعض تاکید کے لئے

ہوگا مگر درجہ استیجاب ہی ہیں (بیان العسکران)



نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے ہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر اقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَالُوا إِنِّي نَسِيتُ اللَّهَ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑوا اللہ کی راہ میں

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک سب کو سنتا جانتا ہے۔

## خلاصہ تفسیر

دائے مخاطب، کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سوائے اللہ کے

ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے والے ہیں لوگوں کے حال پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اس واقعہ پر غور کر کے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں رجاء کرنے اور نہ کرنا لوگوں کی باہمی سننے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے

## معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب مبلغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے

تاریخ ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں اور بزدلی سے جان بچانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلب صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہو کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت دیوار، طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت فرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، اس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنادیا، ان کی لاشیں حسب دستور محل مٹھیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حسرت قبیل بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو بھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب کریں۔

ایہا العظام البالیۃ ان اللہ

یا مریک ان تعجبی

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا پر قتل

بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب

عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطلع ہیں، مگر ان کریم نے آیت اَعْطٰی سُلٰیْمٰنَ سُلٰتٰنًا

شہ قہدی (۵۰-۱۰۰) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو

اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی، مولانا ردی نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان

کو یہ آواز دو۔

ایہا العظام ان اللہ یا مریک

تین لے ہڈی اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہو کہ



ان تکلمی لحنًا وعصبًا وحبلًا | اپنا گوشت ہیں لڑا اور شے اور کمال درست کرنا  
یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہڑ دھا پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ایک شکل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ  
اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے۔

اہتما الاصل ان الله يامر ان  
ان تخرج كل روح الى الجسد  
الذي كانت تعمده  
یعنی اے ارواح تمیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے  
کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر  
رجات ان سے وابستہ تھی۔

یہ آواز دیتے ہیں ان کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چاروں طرف  
دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا مَبْهَمَاتُكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ۔

یہ واقعہ ہمارے دنیا کے ظالموں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر محبت  
قائمہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا غواہِ جہاد سے  
ہو یا کسی دباؤ و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جبکہ  
یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور ایک سیکنڈ  
مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی  
وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو مفسران کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے مَسْرُومًا  
أَتَمُّ قَوْلًا إِلَى الَّذِينَ تَخْرُجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو  
اپنے گھروں سے بھڑت موت شکل کھڑے ہوتے تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں  
برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں أَتَمُّ قَوْلًا فرماتے کا کیا  
مقصد ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ  
أَتَمُّ قَوْلًا کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے  
کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویت قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی  
میں علم و ادراک یعنی أَتَمُّ قَوْلًا ایسے مواقع میں أَتَمُّ قَوْلًا کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ أَتَمُّ  
قَوْلًا سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہور ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ یہ واقعہ  
ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، أَتَمُّ قَوْلًا کے بعد حسرتِ اِلٰی  
بڑھانے سے اذروئے زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمًّا كُنُوتُ

اس کے بعد مفسران میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمًّا كُنُوتُ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی  
زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم  
ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مَوْتُوا، یعنی کہہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ  
اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بلا واسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں  
ارشاد ہے، اِلَّا اَمَّا اَدَّ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ (۸۲:۳۶)

اس کے بعد فرمایا ہے اِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے  
والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے  
فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امت محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنا یا۔

آخر میں غفلت شعرا انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَفَيَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ  
یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے  
ادراک کرنا انسان شکر گزار نہیں ہوتے۔

## مسائل متعلفہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوتے ہیں۔

۱۔ **مسئلہ اول:** یہ کہ تقدیر الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور جہاد سے یا  
طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ان میں قائم رہنا  
موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

۲۔ **مسئلہ دوم:** دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبا یا مرض طاعون وغیرہ  
پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
ان جگہوں پر اشارہ ہیں کہ ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا  
بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان هذا القسم عذب به الاسم  
فلم يكم فاذ اسمعتم به في الامم  
فلا تدخلوها واذ وقع بارض  
وامتدھا فلا تخرجوا فراسا  
(بخاری، مسلم، ابی حنیفہ)

یعنی اس بیماری طاعون کبیر اللہ تعالیٰ نے  
تم سے پہلے قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے  
سو جب تم سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ  
وبا یا مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر  
کسی جگہ میں وہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں سے  
ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ بھگو۔



تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا، سرحد شام پر جو تک کے قریب ایک مقام سترغ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملک شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عموماً کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عموماً نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بیت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اس مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ میں ملک شام میں اس وقت جانا چاہئے یا رہیں ہونا مناسب ہے، اس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
ذکر الوج فقال رجز و عن اسب  
عن سب به الام ثم بقى منه  
بقية في ذل المزمع و ياتي  
الاخرى فمن يبع به بارض  
فلا يقدر من عليه و من كان  
بارض وقع بها فلا يخرج ذراعا  
منه، رواه البخاري عن انس  
من ذين و اخرجه الاثمة بمثله۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقہ کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملک شام کے عامل و امیر و گورنر بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرمانے لگے، افراسام من قد رائدہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں! فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

فمن نفر من قد رائدہ الخ  
قد رائدہ الخ  
بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر  
کی طرف بھاگتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دراصل طاعون لاشعور ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی کی بھشتیں میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اس جگہ سے بخوبی موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کسی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلطی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ طبیعت پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ معتد در بھرا میں چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تقدیر الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اس بستی کے رہنے والوں کو بخوبی موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعیف، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا حشر کیا ہو گا، اول تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر ان میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دُفن کفن کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اڑ کر پھیلے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے۔



سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے ملنا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما فرأى أحد من الصواب فسلم  
(قربلی)

یعنی جو شخص وہاں سے بھاگتا ہے وہ بھی سلام  
نہیں دیتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ فحش بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وہابی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے مبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روى البخارى عن يحيى بن يعمر  
عن عائشة أنها اخبرته انه  
سألت رسول الله صلى الله عليه  
وسلم عن الطاعون فاخبرها  
النبي صلى الله عليه وسلم انه  
كان من ابايحه الله على من  
يشاء فجعل الله رحمة  
للمؤمنين فليس من عبد  
يقم الطاعون فيسكت في بلد  
صابرا يعلم انه لن يصيبه الا  
ما كتب الله له الا كان له مثل  
اجر شهيد وهذا تفسير لقوله  
صلى الله عليه وسلم الطاعون  
شهادة والمطعون شهيد

(قربلی ص ۲۳۵ ج ۲)

میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثناء | حدیث کے الفاظ میں فلا تخرجوا اخرار امته آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا بھگے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی! یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آپ ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وہاں پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے استفادہ ہوا کہ خوف موت چہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں چہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

الَّذِينَ قَالُوا لَا تَحْرُسُوا  
فَقَالَ لَهُمْ اَلَمْ نَأْمُرْكُمْ  
اَنْ قُادِسَكُمْ وَاعْتَنِ  
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

یعنی کچھ لوگ خود بھی چہاد میں شرکت ہوتے  
اور چہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانیوالوں  
کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے  
ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہمارے  
بات اس لئے قتل نہ ہوتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت کے  
بھانساں نہ ہوتے ہیں، تو ان لوگوں کی کیا فکر کرتے ہو تم خود اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو موت سے  
بھاگو، میں چہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہونے بھی آخر موت آئے گی۔

عماہد قدرت سے ہے کہ صحابہ کرام کے سب بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری چہاد ہی میں گزاری ہے، وہ کسی چہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے مگر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور چہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عھدا ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آگام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تھوڑا لایا گیا تھا، اگلی آیت میں چہاد و قتال



کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاں میں جانے کو موت یا جہنم کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔  
تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّه لَهُ آضَعًا

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر وہ نکال کر دے اللہ اس کو

کثیراً ۱۰۰ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ مَنْ ذَا الَّذِي يَرْجِعُونَ ۱۰۱

مکنا اور اللہ ہی سبکی کر دیتا ہے اور وہی کثرت کرے اور اسی کی طرف تم لوٹاؤ جاؤ گے۔

## خلاصہ تفسیر

جہاد و جہاد کا خبریں (کون شخص ہے) ایسا جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا یعنی اخلاص کے  
انفاق کی توفیق ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے) ثواب کو بڑھا کر بہت سے جتنے کر دے اور  
اس کا اندیشہ مت کر کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے  
وہی لکھ کر دیتے ہیں اور وہی (فراموشی کرتے ہیں) کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصل مدار نہیں اور  
تم اسی کی طرف (بعد مرے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت تک کام میں خرچ کرنے کی جہاد  
اور واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)

## معارف و مسائل

(۱) يَقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا قرض سے مراد نیک عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں  
خرچ کرنا ہے، اس کو قرض مجازاً کہہ دیا، اور نہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے  
قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے انفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا  
بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خیر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جائے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا  
بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جاتا ہے

اور ان کی حاجت برآری کی جاتے، چنانچہ حدیث میں مفسرین دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی  
ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ مَسَّ مَسْلَمًا بِقَرْضٍ مَسَّ مَسْلَمًا قَرْضًا

مَرَّةً إِلَّا كَانَ كَقَسَمٍ مَرَّتَيْنِ

(منہری بولا، ابن ماجہ)

یہ قرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو

دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے ۵

(۲) ابن عربی فرماتے ہیں اس آیت کو سنکر لوگوں کے تین فرقے ہو گئے، پہلا فرقہ ان  
بد نصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف  
محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت نَعْنَىٰ مَسِيحَ اللَّهِ  
قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سے دیا۔ دوسرا فرقہ ان لوگوں کا ہے  
جنہوں نے اس آیت کو سن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کر لیا، مال کی طرف زیادہ  
رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے  
کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنہوں نے فوراً ہی اس آیت پر  
عمل کر لیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دیدیا، جیسا کہ ابوالدرداء وغیرہ، جب یہ آیت  
نازل ہوئی تو حضرت ابوالدرداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور  
آپ سے پوچھا، اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے  
قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے  
ہیں کہ اس کے ذریعے تم کو جنت میں داخل کر دیں، ابوالدرداء نے یہ سن کر کہا، اللہ کے  
رسول! تم بڑھاتے ہو، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدرداء نے کہنا شروع کیا،  
میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری ملک میں کچھ نہیں، میں اپنی  
یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے ان سے فرمایا ایک اللہ کے راستے میں وقف کر دو اور دوسرا اپنے اہل و عیال  
کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو۔ ابوالدرداء نے کہا آپ گواہ رہے، ان دونوں میں سے  
بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں،  
آپ نے فرمایا اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کرے گا۔

ابوالدرداء اپنے گھر کے اور بیوی کو اس کی اطلاع دیدی، تو وہ بھی ابوالدرداء کے  
اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

كَمْ مِّنْ عَدُوٍّ لِّي وَدَاخٍ وَدَاخٍ لِّي كَمْ مِّنْ عَدُوٍّ لِّي وَدَاخٍ لِّي كَمْ مِّنْ عَدُوٍّ لِّي وَدَاخٍ لِّي







أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۵۵﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ

دکھ ہمارا پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی مومنوں کو جاوت کے ہاتھ کو اور ان کے

وَقَتْلَ دَاوُدَ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَا

اور داؤد کو اور دے جاوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا

يَسَاءُ ذُلًا لَّذَلِكَ النَّاسُ بِبَعْضِهِمْ مُبَغِضٌ لِّبَعْضٍ لِّفَسَادِ الْأَرْضِ

اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا اللہ کا ایک کو دوسرے کو خراب ہو جاتا ملک ۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۵۶﴾

لیکن اللہ بہت بھلا ہے جہاں کے لوگوں پر ۔

### خلاصہ تفسیر

**رابط آیات** مقصود اس مقام میں زیادہ تر غیب قتال کی ہے، اور پر کا قصہ اسی کی تحدید ہے، اتفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طاوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرایا، جس کا ذکر قبل کی آیت وَاللَّهُ يَبْغِضُ وَيُبْغِضُ میں آیا ہے، اگر فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے خست یار میں ہے۔

**طاوت اور جالوت کا قصہ** (اسے خطاب کیا تھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئے، تحقیق نہیں ہوا، جس سے پہلے

ان پر کا فر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دہائے تھے جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر اللہ کی راہ میں جالوت سے قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ ہم دُعا کا فروں کے ہاتھوں اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دہائی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے معترض ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو دین خلافت محکم کرنے والوں کو، خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب ہوا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طاوت کو بادشاہ معزز

فرمایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ

مستحق ہیں، اور ان کو کچھ الی وسعت بھی نہیں دی گئی، (کیونکہ طاوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے

دعوت میں، (فرمایا کہ اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی

مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جہاد میں اس کو

ریاضت ملے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جہاد

میں باہر امن ہے) کرمات و مخالفت کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو، اور (دوسرے) اللہ تعالیٰ

(اللہ الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے)

اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال و دنیا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کو شہر ہو

اور) جانے والے ہیں (کہ کون یا قت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے

یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری جہت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو

اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ)

بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لئے ہوئے) آجائے

میں میں سکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات اور تورات کا منجانب

اللہ ہو لگا ہوا ہے) اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام

چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے نے آدیں

اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لائے

والے ہو، پھر جب دینی اسرائیل نے طاوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے

لئے نکلیں ہو گئے اور طاوت فوجوں کو لے کر اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی

طرف، چلے گئے انہوں نے اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے ساتھیوں سے

ہمارا آپ حق تعالیٰ (استقلال و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے

(جوراء میں آدے گی اور تم شدت تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے افراط

کے ساتھ اپنی پیروی کا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل

حکم یہ ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی نصرت

ہے، طرہ وہ ہر راستے میں آتی و پیاس کی تھی شدت) سو سب لے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع

کر دیا، پھر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے راہنما کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے



چلو سے زیادہ نہ پایا ہوگا) سو جب طاہوت اور جو زمینیں ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، اور اپنے بیج کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعض آدمی آپس میں کہنے لگے کہ آج تو ہمارا بیج اتنا کم ہے کہ اس حالت سے ہم میں جاہوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ لشکر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رو برو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، (اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب (دیارِ عالمہ میں پہنچے اور) جاؤ اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو (دعا میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (طریقے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کی وقت) ہمارے قدم جمائے رکھتے، اور ہم کو اس کا فرقہ پر غالب کیجئے، پھر طاہوت والوں نے جاہوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طاہوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جاہوت کو قتل کر ڈالا (اور مظہر و منصور واپس آئے) اور اس کے بعد، ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطا فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا، آگے اس واقعہ کی مصلحت مآثر فرماتے ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں) وقتاً فوقتاً دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہاں والوں پر اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔

## معارف و مسائل

- ۱۔ اِذَا قَالُوا لِلنَّبِيِّ لَعْنُكُمْ اَبَعَثَ لَنَا طَائِفًا مِّنْكُمْ فِي سُبُلِنَا لِلدِّينِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عالمہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، اور جن نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔
- ۲۔ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الدَّابُّوْنَ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کی بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے دیکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جاہوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے ہیں وہاں اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو دویلوں پر اس کو لا کر ایک گیارہ فرشتے ہیلوں کو ایک کر طاہوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طاہوت کی (ادشاہت پر یقین لائے، اور طاہوت نے جاہوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بَشَعًا، اس امتحان کی حکمت اور توجہ احقر کے ذوق میں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جانے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اکثر جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا ملین کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان معسر رکھا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے وقت والی ملنے پر مضطرب کرنا دلیلِ استقلال کی اور اندھے بازوں کی طرح جاگڑا دلیلِ بے استقلال کی ہو آگے فرقہ مادہ ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور اذکار رفتہ ہو گئے، ہزاروں المعانی میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔ اھل ایمان جو امتحان میں پورے اترے، اور کائنات میں جو امتحان میں پورے اترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ تَتْلُوْهُ اَعْلٰیكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۵۱﴾

اے اے اللہ کی پس ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

## خلاصہ تفسیر

۱۔ کہ سورہ کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جن جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک مجزہ ہے جو آپؐ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

یہ روایتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم استدلال



تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ

یہ سب رسولانِ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ

کو کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دیے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے

الْبَيِّنَاتِ وَآيِدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا الَّذِينَ

کو مجیدہ صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبرئیل اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَ ثَمَرُ الْبَيِّنَاتِ وَلَكِنْ اخْتَفَوْا فِيمَهُمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف ہم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا،

مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتُلُوا أَنْتَ وَلَكِنْ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۵۷﴾

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

### خلاصہ تفسیر

بعض انبیاء اور امتوں کے کچھ احوال یہ حضراتِ مرسلین (جن کا ذکر ابھی آگیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً بعضے

ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلاد واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے فرمائی رہبر وقت یہود سے انکی مخالفت

کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں رکبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد

اس کے کہ ان کے پاس (امروں کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا متفقہ اتفاق ہو چکا ہے) قبول پر متفق رہنا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں اتفاق

نہیں نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں فوجیت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

### معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مگر نہ تسل دینا ہوا کیونکہ جب آپ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جسکو تِلْكَ الرُّسُلُ میں بھی فرمایا ہوا اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج و اندوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سننا ہی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان مام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَفْضَلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ اللَّهُ يَزِيْرُ مَا يَشَاءُ

انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔

لَا تَخْتَلِفُوْنِي عَلَىٰ مُوسَىٰ۔

مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔

اور فرمایا:

لَا أَقُولُ أَنَّ أَحَدًا أَفْضَلُ مِنِّي

یونس بن مثنیٰ

میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن مثنیٰ سے افضل ہے۔

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جو اب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت دواں نہ کرے کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔



وہ آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احد افضل من یونس بن مثنیٰ اور لا یتخیرونی علیٰ موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرام سے آپ نے اس کا اہلار بھی فرمادیا (منظہری)

(۲) وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گوبلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۃ شوریٰ کی آیت مَا كَانُوا يَنْشُرُونَ لِكَلِمَةٍ اَللّٰهُ اَعْلَمُ، جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

بَيِّعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۸۴﴾

کس میں نہ خرید و فروخت ہو اور نہ شافی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

### خلاصہ تفسیر

الغائی فی سبیل اللہ اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں کوئی چیز اعمال خیرہ کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی نہ کوئی چیز دے کر اعمال خیرہ کی خرید کرے گی اور نہ دے گی (دستی ہوگی نہ کوئی تم کو اپنے اعمال خیرہ دے) اور نہ بلا اذن الہی کسی کی کوئی سفارش ہوگی جس سے اعمال خیرہ کی تم کو حاجت نہ رہے، اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں نہ کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعات بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیت الہیہ و دنیہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو۔

### معارف و مسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیر بیان فرمائے ہیں جن میں سب کی تفصیل لکھ کر نامور اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خسر ہو

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی ہوسلت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور اتفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا، وَقَالُوا إِنَّا تَسْبِيلُ اللَّهِ الْخَيْرُ أَوَّلُ كَلِمَاتٍ تَحَاوَرُوا مَن ذِي الْأَلْنِ يَمْ يَكْفُرُ مَن اللَّهُ الْخَيْرُ مَن دُوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طاہرہ سے اول کی تاکید ہوئی تو اب أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ الْخَيْرُ دُوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ الغائی مال پر بیستے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی الغائی مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل پکے ہیں نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے بچھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ مَا

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا بھالنے والا نہیں پڑ سکتی اس کو ادھم اور نہ نیند

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا

اس کا ہی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اللہ

بِأَذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے درپردہ اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں

مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَهوَ

کر سکے کسی چیز کا اس کی معلوم نہیں ہے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہو اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۸۵﴾

اور گراں نہیں اس کو بھالنا ان کا اور وہی ہے سب سے بزرگ و عظیم والا

### خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو ادھم دیا سکتی ہے اور نہ نیند (دیا سکتی ہے)



اسی کے ملک میں سب کچھ (یعنی آسمانوں میں موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے جسے بدون اس کی اجازت گے وہ جانتا ہے ان تمام موجودات کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے اس کی کرسی راستی بڑی ہے کہ اس نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

## معارف و مسائل

آیت الکرسی کے یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات خاص فضائل مذکور ہیں مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات الفضل شریک ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد بن محمد) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے بچل جاتا ہے۔

انسانی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، شکم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب غلظت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کا مالک ہونا کہ ساری عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے والی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اس ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْعَلِيُّ الْقَبِيضُ** لفظ حق کے معنی عربی زبان میں ہیں زندہ، اس کے آگے میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **قَبِيضٌ** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیوم اور تمام مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کسی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اس بار صفات میں حتی و قیوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اہم علم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یا علی یا قیوم یا حتی یا قیوم کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ **لَا تَأْخُذُ بِهِ سَنَةٌ وَلَا نَوْمٌ** ہے، لفظ **سَنَةٌ** سین کے زہر کے ساتھ، اور نگہ کو کہتے ہیں، جو زہر کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور **نَوْمٌ** مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اور نگہ اور نیند سے بے غری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ ساری آسمانوں زمینوں اور ان میں ساری والی تمام کائنات کو تحائف اور سنبھالے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے ہمارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کا علم کے سامنے یہ ساری کلام نہ کہ مشکل ہیں، نہ اس کے لئے بھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور محکمی تعب اور ادھم اور نیند سے بالاتر ہے۔







## خلاصہ تفسیر

دین اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی کو کافی ثقیلہ کوئی موقع نہیں دیکھو۔  
ہدایت یقیناً عمر ایسی سے ممتاز ہو چکی ہے یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے  
واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے،  
اور جب اسلام کی غرضی یقیناً ثابت ہے، تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ  
غرض اعتقاد یعنی اسلام قبول کرے، تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تمام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں  
سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)

## معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کے  
ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تمام کر گرنے سے مامون رہتا کہ  
اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی  
طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسار نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات  
ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ  
دین میں زبردستی نہیں ہو، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر زور و غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام  
میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی  
زمینداری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے  
بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو نا پسند ہے جس کے دے پے کافریت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ  
فرماتے ہیں:-

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۱۳، ۱۵)

یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ  
تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم  
دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بھتہ اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔  
اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے  
رکھا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا کہ  
جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول  
کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم  
رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس  
کہا: اَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ "تین میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت  
میں اپنا مذہب کیوں چھوڑ دوں؟" حضرت عمرؓ نے پرسش کر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت  
تلاوت فرمائی: لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ مَيْمَنَ دِينِ يَمِينٍ میں زبردستی نہیں ہے:-

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری  
اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا  
ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان  
کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد و قتال آیت "لَا أَكْرَاهُ  
فِي الدِّينِ مَيْمَنَ دِينِ يَمِينٍ" کے معارض نہیں ہیں۔ (منظہری، مستطبی)

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَالَّذِينَ

اشد دھماکہ ہے ایمان والوں کا مکان ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان نکلتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۶﴾

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ قَوْلِهِ خَالِدُونَ ۚ وَاللَّهُ تَعَالَىٰ سَاحِقٌ ۖ إِنَّ لَوُغُونَ

کا جو ایمان لائے، ان کو دلفریب تاریکیوں سے نکال کر ایسا بھار نور (اسلام) کی طرف

لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیطان ہیں (انسی یا جنتی) وہ ان کو نور (اسلام) سے

نکال کر ایسا بھار کفر کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر

خستیار کر رہے) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا

بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی غلطی ہے۔

## معارف مسائل



أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ  
 كِبَارًا دَبَّحَا تو نے اس شخص کو جس نے چمڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اس وحی کی دی تھی اور

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ  
 اے اسکو سلطنت جب کہا ابراہیم نے میرا رب جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں ہی چلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالنَّمِيسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا  
 کہا ابراہیم نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو اے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ  
 مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

### الظَّالِمِينَ ۝

بے انصافیوں کو۔

## خلاصہ تفسیر

و اے مخاطب، کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا یعنی مزدکا جس نے  
 ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں دینی توبہ وہ خدا  
 کے وجود ہی کا مستکر تھا اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی دینی چاہئے توبہ تھا کہ  
 نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لانا اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ جہت  
 اس وقت شروع ہوا تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب میں)  
 فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ چلاتا ہے اور مارتا ہے یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے  
 وہ کوڑے معزز چلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں میں  
 بھی چلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جسکو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جسکو چاہوں قتل سے معاف  
 کر دوں یہ چلاتا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بالکل ہی بعیدی عقل کا ہے کہ اس کو چلاتا  
 اور مارتا سمجھتا ہے حالانکہ چلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے اسی طرح مارنے کا  
 معاملہ سمجھو اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ چلائے اور مارے کی حقیقت سمجھ گاہ نہیں اس لئے اس ضرورت  
 سے دو سکر جو اب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو ایک ہی دن، مغرب سے نکال (دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب  
 نہیں آیا اس کا معقنی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، گو وہ اپنی گمراہی پر جا رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی  
 اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

## معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و  
 سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت  
 مناظرہ اور مجاہدہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے،  
 دے اس شبہ کا یہ ہو کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا  
 اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص بغیر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا  
 اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ  
 اس جھڑپ کو دیکھ کر مجھ سے مغرب ہو کر ان کی راہ پر ہوں، اور اسی جہت میں سلطنت جاتی رہے،  
 یہ جواب تو اس لئے دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوَ كَآلَئِیْ مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنِیْ یُحْیِی

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گذرا وہ ایک شہر پر اور وہ گر چڑھا اپنی چھتوں پر بولا کیوں کر زندہ کرے گا

هَٰذَا إِلَٰهُ اللَّهِ بَعْدَ مَوْتِنَا ۚ قَامَتِ لَهُ مِائَةٌ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ

اس کو اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے تئو برس پھاڑا اس کو کہا تو کہنی

كَمْ كُنْتُ ۖ قَالَ كُنْتُ یَوْمًا أَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَّيْسَ بِمِائَةٍ

دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا تئو برس

عَامٍ ۖ فَالْظُّرُّ إِلَىٰ طَعَامٍ مَّكٍ وَشَرَابٍ لَّمْ یَسْنَنْ ۖ وَالْظُّرُّ إِلَىٰ حِمَارٍ ۖ

اب دیکھو اپنا کھانا اور پینا، سٹر نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدے کو

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَالْظُّرُّ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَیْفَ نُثْبِتُ ۖ هَٰذَا سَمِ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کی واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم انکو کس طرح اٹھا کر چڑھائیں



تَكُونُهَا لَحْمًا نَّجِسًا لَّكَ اللَّهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

بہر آن پر پہناتے ہیں گوشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ بیک

قَدِيرٌ

اللہ ہر چیز پر قادر

## خلاصہ تفسیر

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ نَارٌ تَنْزِلُ، اَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ  
 کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی  
 حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چیتوں پر گر گئے تھے، یعنی پہلے چھین گریں  
 پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مریز  
 گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو  
 زمین اس کے مردوں کو، اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو  
 یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے چلانے کا جو خیال غالب ہوا  
 تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام  
 کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے  
 ہو گا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جائے  
 سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی جان قبض کر کے اس کو  
 سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت  
 اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (تاکہ یہ سو  
 مدت قلیل ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر  
 اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا  
 نہیں مڑی مٹی کی ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے  
 (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر کہ گل سسٹر کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو  
 تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو  
 (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ  
 ہونے پر استدلال کر سکیں) اور اب اس گدھے کی، ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض  
 یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے (پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی  
 تو بے ہمتی و جوش میں آکر) کہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ  
 ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوْمِئًا ثُمَّ قَالَ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلاؤ مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مرگ، فرمایا یا تو یہ یقین کر

قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تمہیں ہر جاؤ تیرے دل کو فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے

فَصَمِّرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ

پھر ان کو جلانے اپنے ساتھ، پھر رکھ لے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو جلا

يَا تَيْنِكَ سَعْيَاكَ وَأَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

چلے آؤں گے تیرے پاس دڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا

## خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کے واقعہ کو یاد کر دیجئے ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ  
 اے میرے پروردگار مجھ کو یہ (دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو) قیامت میں (مثلاً) کس کیفیت سے  
 زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں  
 ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ  
 آدمی کو اس کا مشبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان  
 یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام  
 سے اس سوال کے جواب میں اول (ارشاد فرمایا کہ کیا تم راس پر یقین نہیں لاتے، انھوں نے  
 جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس عرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے  
 قلب کو (معتق صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمال  
 سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو،



اُن کی خوب شناخت ہر جادوے (پھر سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پر دو سمیت ان کا قہر سا کر کے اس کے کئی حصے کروا دینی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو اور (پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس زندہ ہو کر) دوڑ دوڑ کر چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

## معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی درخواست یہ ہمیشہ اقصیٰ ہے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ حیات بعد الموت کا مشاہدہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مژدوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرت کا ملکہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر جادو ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرت کا ملکہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہد میں آتے رہتے ہیں اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں کہ یہ کیسے اور کس طرح ہو گا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور اطمینان میں غلغلہ نامداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو مسکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی کہ ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و غدشات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر اُن کو پاس رکھ کر بلا لیں کہ وہ ایسے بل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پردوں سمیت اُن کا خوب قہر سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز پر مختلف پہاڑوں پر اس قہر کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر اُن کو بلا لیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی پر سے پڑا خون سے خون، گوشت سے گوشت جل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑنے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم قیامت کے روز اس طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایکے م سے ان میں جان ڈالوں گا، قرآن کے الفاظ میں يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَىٰ، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اُن کو نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اُن کو آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس وقت میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلایا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کہہ ہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعید میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت اپنی مشیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود چلن کے تحت لعل گوشتوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشو و نما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت بدست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گھائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہونے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کہیں کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھیلے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جز و بنتی ہیں وہ کس کس گوشتہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ



اور نظام محکم نے ایک انسان کے بدن میں جم فرمادیے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریسرج) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظام محکم نے اس کے بدن میں جم فرمادیے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، کوئی دوسری مرتبہ پھر ان کا جم فرمادینا اس کی قدرت کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جم فرمادیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات آیت مذکورہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،  
**جوابات** اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان لائے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بناء پر نہ تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کبھی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہوا جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام الطینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور الطینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور الطینان سکون قلب کا نام ہے، بعض اوقات لفظوں سے غائب کسی چیز پر یقین کا مل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

**دوسرا سوال** یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** یعنی کیا آپ کو یقین نہیں؟ فرمائیے کہ کوئی موقع نہیں رہتا؟  
 جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

ابنی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بتلی فرما کر انفراد پر رازوں کی زد سے نکل جائیں۔

**تیسرا سوال** یہ ہے کہ اس سوال ابراہیم سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر الطینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و الطینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے الطینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ الطینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو الطینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ الطینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ الطینان ہو جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام الطینان ہو جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ الطینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ الطینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس الطینان میں حضرت خلیل اللہ اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرماتے ہیں وہ سب کے لئے معتمد الطینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرنا الطینان خاص بخشا گیا۔



الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ بین اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالنبی کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہو کہ جیسے ایک دانہ اس سے آگیا

سَبْعَ سَنَائِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ

سات بائیس ہر سال میں تتر تتر دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَتَّسَعُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۱۱۱ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

پا ہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کر کے پیچیدہ نا احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۱۲

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمیں ہوں گے

قَوْلٌ مُعْتَرِفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ تُتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہرستانا اور اللہ بے پروا

غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝۱۱۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ

ہو نہایت غفل والا، اے ایمان والو! مت مٹاؤ اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالَّذِي كَانِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا کہ اللہ

الْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ

پراور قیامت کے دن ہر سوا اس کی مثال ایسی ہو جیسے صاف پتھر کے اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسات آئی

وَأَبِلَ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ

زور کا سینہ زور چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب میں چیز کا جو انھوں نے کایا اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝۱۱۴ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

نہیں دکھاتا، سیدھی راہ کا فردن کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ كَبُرَتْ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے ایسی ہو ایک بارغ ہو بلند زمین پر

أَصَابَهَا وَابِلٌ فَانْتَأَتْ أَكْطَاهَا ضَعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطَلُّ

اس پر پڑا زور کا سینہ تر لایا وہ بارغ اپنا پھیل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر مینہ تو پھواری کاں ہے،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۱۵ أَيُّدُكُمْ أَمْ أَنْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہر دے اس کا ایک بارغ

مِن تَخْيِيلٍ وَأَعْيَابٍ تُجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے بہریں اس کو اس بارغ میں اور بھی ہے

الشَّجَرِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعُفَاءٌ مِنْ أَصَابِهِ ۝۱۱۶

طرح کا میوہ ہو حاصل اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد میں ضعیف تب آ پڑا اس بارغ پر

إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

ایک بجولا جس میں آگ تھی جس سے وہ بارغ جل اٹھا، یوں سمجھانا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۱۱۷

تاکہ تم غور کرو۔



## خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (یعنی اللہ) ایسی ہے جیسے ایک راہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں ہمیں (اور) ہر بال کے اندر ستودہ لے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ السنو فی خدا تعالیٰ چسکو چاہتا ہے (بعد اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ السنو فی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جائزے والے) بھی ہیں (اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے عمل کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ قیامت کے دن، ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور راگرسائل بدتمیزی سے قصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا اور جزا اور جزا بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچا یا جائے اور اللہ تعالیٰ بخود غنی ہیں کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچا یا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ (بھی) ہیں اے ایمان والو ہم احسان جتلاتے ہیں یا اذرا پہنچا کر اپنی خیرات کے ثواب بڑھنے کو برباد مت کر دو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر مراد اس سے (تقریباً) نبی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھوس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو جیسا تھا ویسا ہی بالکل صاف کر دے (اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے) اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مغفود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو قیامت کے

روز ثواب کے گھر میں جنت کا) راستہ نہ بتلا دیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچانے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے پیدا ہو کر) پس ان لوگوں کے نفعات و صدقات کی حالت (مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی نیلے پر ہو کہ اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ بارش لطافت ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا میٹھ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور مرقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو ریزوں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور اس باغ کے درختوں کے) نیچے ہنریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پالا گیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں رکمانے کی قوت نہیں اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس دھیر معاش صرف وہی باغ ہوا) سو ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر اس سے وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کارآمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہو گا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدد قبول ہو گا اپنی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہو گا کہ ہمارے احسان جتلاتے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سو جا کر (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کر دو)۔



## معارف و مسائل

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۱۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۃ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۱۱ سے ۲۸۳ تک کل ۷۲ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح مامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے جس میں آج کی دنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا توڑ عمل اشتراکیت اور اشتالیست کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند و مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔ ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلق احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سود کی کاروبار کی حرمت و مانعت اور قرض اؤ صار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اور رکوع گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا ہے اس کے بعد ایسی شراائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہو جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک ان نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں دوسرے ان نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایتاء الزکوٰۃ، ان الفاظ تشریحی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ و خیرات اور رخصتے انہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر جاری ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایتاء الزکوٰۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرت اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و تبرعات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی چھ میں کرنا ایک مثال یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیزوں و دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بولے، اس دانہ سے گہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

میسج و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گئے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب ستاسو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی لیکن تشریح کریم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کا ششکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا

ہو جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کا ششکار بھی کا ششکار ہی کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو



کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔  
دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیست اور صالح ہو، بدعتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس نادانقت کا شکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جاتے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کریں اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی عین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کر لے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے ان پر خرچ کرے، محض جیب نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مستحسن طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ ان پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہو، اور نہ گزشتہ پر کوئی بوجھ و غم۔

قبولیت صدقہ کی منفی شرائط | اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت قَوْلُ مَعْرُوفٍ میں بھی صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلے آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب غلہ پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلائے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و حلیم ہیں، ان کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاق الہیہ کے تابع ہو کر غفور و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اس مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برادر نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا عدم ہے، اس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھائے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوسے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیت صدقہ و خیرات کی یہ مشروط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلانے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برادر کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مومن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہو کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ لَا يَذُوقَنَّ ثَوَابَ اللّٰہِ کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ ریاء کاری، اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور دنیا آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہوتی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں بخل پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو و چنداں اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ٹیلے پھوٹا بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاص نیت اور رعایت شرائط مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب خیرات آخرت ہے۔



چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو جو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے پھریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گجولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جو ان کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدی شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمالے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور دکھ کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہو گا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبَتُمْ رِزْقًا

اے ایمان والو! خرچ کرو کسبتی چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَكُمْ مِنَ الْخَيْثِ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

بم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد ذکر و غنہ کی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم



چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو جو کھجور اور انگوروں کا اس کے نیچے پھریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گجولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جو ان کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدی شدتِ جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہو تاکہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور دکھائی اتنا بڑھ جائے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جملانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہو گا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبَتُمْ رِزْقًا

اے ایمان والو خرچ کرو کسبتی چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَتَّبِعُوا الْغَيْبَ مِنْهُ تَنَفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد ذکر و غنہ کی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم



بَاخِذْ بِهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِيَ وَافِيَهُ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۱۲۸﴾

اس کو بھی نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کرجاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہی و خیروں والا ،

الْكَافِرُ يُعَذِّبُكُمْ بِالْفَقْرِ وَيَا مَرْكُومًا بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعْلَمُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بھائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۹﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کثافتش والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے کچھ جس کو

يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ مل ہے اس کو بڑی غول مل اور نصیحت دی قبول کرتے ہیں

إِلَّا أُولَ الْأَلْبَابِ ﴿۱۳۰﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کر دے تم خیرات یا قبول کر دے کوئی مٹت تو

تَذَرُّهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ اللَّهُ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۱۳۱﴾ إِنْ تَبَدَّلَا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کر کے دو

الْقَدَّاتِ فَنِعْمَ هُنَّ وَإِنْ تَخَفَوْهَا وَتَوَلَّوْهَا الْفَقْرَاءَ فَهَوَّ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بہتر ہو تمہارے حق میں اور دور کر دے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَيْرٌ ﴿۱۳۲﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا مِنْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

خوب خبر داتا ہے تیرا نہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جس کو چاہے ،

وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُسْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کر دے تم مال سوا پہنچاؤ واسطے جب تک کہ خرچ کر دے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللَّهُ وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِيُؤْتِيَكُمْ وَالْإِكْمُ وَأَنْتُمْ لَا تظْلَمُونَ ﴿۱۳۳﴾

میں اور جو خرچ کر دے خیرات سوہری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِنَفْسٍ أَوْ لِلنَّاسِ أُمْحَصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا

خیرات کی فقیروں کیلئے ہے جوڑ کے ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْأَرْضِ مَنْ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

تک میں سمجھے ان کو نادانقت مالدار ان کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے ان کی

بِسِيمَتِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُسْفِكُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

ان کے چہرے سے ، نہیں سوال کرتے لوگوں سے پٹ کر ، اور جو کچھ خرچ کر دے گا ان کی چیز وہ

اللَّهُ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۳۴﴾ الَّذِينَ يُسْفِكُونَ أَمْوَالَهُم بِالْأَيْلِ وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے ، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا أَوْ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو ان کے لئے ثواب ہر ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈرہی ان پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۳۵﴾

اور نہ وہ غمیں ہوں گے ۔

مُحَلِّصَةٌ تَفْسِير

اے ایمان والو ذریعہ کام میں خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور ( عمدہ چیز کو )

اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے کام میں لانے کے لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی ( ناکارہ ) چیز

کی طرف نیست مت لے جا یا کر دے اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ ( دوسری ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارا )

حق واجب کے عمن یا سوغات میں دینے لگے تو تم بھی اس کے لینے والے نہیں ، ہاں مگر چشم پوشی

( اور رعایت ) کرجاؤ ( تو اور بات ہے ) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ( جو ایسی

ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں ) تعریف کے لائق ہیں ( یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے

دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے ) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے ،

کہ اگر خرچ کر دے یا اچھا مال خرچ کر دے تو محتاج ہو جاؤ گے ) اور تم کو بڑی بات ( یعنی بخل )

کا مشورہ دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے ( خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر )

اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا ( یعنی جو کہ ایک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے



اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سب کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ وسعت دالے ہیں وہ سب کچھ دے سکتے ہیں، غریب جاننے والے ہیں ریت کے موافق غمزدہ دیتے ہیں اور یہ سب مصلحتیں بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ ان کا فہم جسکو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں اور رچ تو یہ ہے کہ جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی کہ جو نہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں، اور نصیحت دہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانگتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی بقیہ اطلاع ہے اور بے جا کام کرنے والوں کا رقیامت میں کوئی ہمارا ہی (حمایتی) نہ ہو گا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تم بھی ابھی بات ہے اور اگر ان کا اخفاء کرو اور اخفاء کے ساتھ، فقیروں کو دید و سب اخفاء تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، اگرچہ کہ بہت سے صحابہ کفار کو بائیں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دوا درازا ہتمام کئے جاویں) لیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ کا کام ہے، جس کو چاہیں ہدایت پر لے آریں، آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں، اور اے مسلمانو! جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لازم سے ہے اور یہ ہر حاجت مند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جائے) اور دین (جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو د آخرت میں مل جائیگا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے) اور عوض ہر حال میں ملے گا پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے، اسلام اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے (وہ لوگ مطلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلے پھرنے کا رعبہ (امکان نہیں رکھتے) اور (ناواقف ان کو بالدار خیال کرتا ہے) ان کے

سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو ان کے طرز و ریسٹ سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فرقہ و فائدہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے پست کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی ان کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ پست کر ہی مانگتے ہیں) اور ان لوگوں کی خدمت کرنے کو جو مال خرچ کر دے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی ثواب اطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے ان کی خدمت کا فیض زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلا تخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیص حالات) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (نیابت کے روز ان کے رب کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) ان پر کوئی خطہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ معلوم ہوں گے۔

## معارف و مسائل

اس سے قبل کے رکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اس سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَتُنْفِقُوا رِيشًا** (یعنی غریبوں کی خدمت میں) شان نزول سے طیب کے معنی عمدہ کے لئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے لےتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ سے طیب کی تفسیر حال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بنا پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی، اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بڑی بھی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ **مَا تَكُنْتُمْ** اور اخراجنا اس کے موجود ہونے پر اور **لَا تَكُنْتُمْ** (یعنی نہ تھے) غرض، عمدہ کئی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو یہی نہیں وہ اس مانعت سے بڑی ہے، اور اس کی وہ بڑی ہی مقبول ہے لفظ **مَا تَكُنْتُمْ** سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جاتا رہے، بقولہ علیہ السلام۔

تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پارٹر  
حصہ ہے، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے  
سے کھاؤ۔

أُولَٰئِكَ مِنْ طَيْبِ الْمَكْسُودِ  
تَكُونُوا مِنْ أَمْوَالِ أُولَٰئِكَ كُمْ  
هَيْثُ شَاءَ (مشرقی)

عشر ارضی کے احکام | بات کی طرف سے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے



علوم سے امام ابو حنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل و کثیر پیداوار پر عشر واجب ہو، سورہ انعام کی آیت اَنُؤَاتِحَقُّہُ یَوْمَ حَصَادِہٖ (۱۱۱:۷) و جو پ عشر میں بالکل صریح اور واضح ہو، عشر و خراج شریعت اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہو کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہو فرق یہ ہے کہ عشر فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض بھی کہا جاتا ہے، اور خراج خالص ٹیکس ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو عشر کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام خراج ہے، عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں یہ بھی فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مالی پر زکوٰۃ سال بھر گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی سپید اوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے لیکن اموان تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی، عشر و خراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتب فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب نظام الاراضی میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَلَّذِي يَخْلُقُ مِثْلَهُ الْفَقْرَ (ال قولہ) وَمَا يَدْرُ اِلَّا اَدْوَالًا اَلْاَلْبَابُ، جب کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سُنا کر بھی اسکی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدۃ الہی سے اعراض کر کے وعدۃ شیطان پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہ کہ شیطان کی توہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو دور کنارا رہا! اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بخٹے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں اسبکے ظاہر و باطن نیست و عمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر

اَيُّوْنِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ لَفْظِ حِكْمَتِ قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں تفسیر بحر محیط میں اس جگہ تمام اقوال مغیرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تین ہیں، مگر آخر میں فرمایا

کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، احکام یا کسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے بحر تحطی میں آیت بقرہ اِنَّهُ اللهُ الْمَلِكُ وَالْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۲۵۱:۲) حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:

وَالْحِكْمَةُ وَضَعُ الْأُمُورِ فِي

مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ وَكَمَالِ

ذَلِكَ إِنَّمَا يَعْصَلُ مِنَ الشُّبُهَاتِ

”حکمت کے اصل معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے

کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت ہی ہو سکتا ہے۔

اس لیے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت کی گئی ہے و

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ لفظ حکمت جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام امشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔

اسی مہنوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کہیں جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں حل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین کہیں اصابت رائے اور کہیں خشیت اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں، اور اس الحکمۃ خشیۃ اللہ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت یَعْلَمُکُمْ هَٰذَا لَکِیۡتُمْ فَاِنَّکُمْ لَمِنَ الْخٰتِلِیۡنَ (۲۱۶) میں حکمت کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؓ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیر نظر آیۃ الحکمۃ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط، ص ۳۲۰، ج ۲)

اور ظاہر بھی قول ہے، اور ارشاد قرآنی وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا  
 سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دیدی گئی اس کو  
 جبر کثیر دیدی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَا أَفْقَرُ مِنْ نَفَقَةٍ رَالِي قَوْلَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَقْصَارٍ کسی قسم کے خسر چ  
 کرنے میں سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں  
 کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو یا اتفاق میں رہا،  
 باطل ہو یا اتفاق کیسے اس پر احسان جتلانا ہو، یا احلال یا عمدہ مال نہ ہو، اسی طرح نذر کے علوم میں سب  
 نذریں آگئیں، مثلاً عبادت مالہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے اتفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں  
 یا عبادتِ بدنیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفاء کیا گیا ہو یا نہ



کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزاء دیں گے، یہ اس لئے سنایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنائی۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ رَاقِيَةٌ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعْيَكُمْ ۚ بظاہر آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سبب اخفاء ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے، کہ ریا سے اجد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد ان فضیلت اخفاء سے آیت میں انفضلیت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی مارض سے شلوار بچہ بہت یا امید اقتدار وغیرہ سے اہلکار کو ترجیح ہو جائے تو انفضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں، چنانچہ عَمَلُكُمْ فِي مَتَابَعَةِ كُفَّارَةٍ مَسِيئَاتٍ اچھے اخفاء کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں نیچے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس کو کہ تمھارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمھارے لئے فائدہ عظیم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ مَنَاسِتٌ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعْيَكُمْ ۚ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیت بھی تمھاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا حرام ہے۔ (منظری)

مسئلہ: حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔  
مسئلہ: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

يَلْفُظُونَ مِنَ الْغَنِيِّ ۚ وَاللَّهُ يَتَعَلَّمُ سَعْيَكُمْ ۚ (القول) ۚ فَإِنَّ اللَّهَ يَتَعَلَّمُ سَعْيَكُمْ ۚ یہاں فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔  
يَتَعَلَّمُونَ مِنَ الْغَنِيِّ ۚ (التعقُّف) ۚ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر نبی کے لئے پہنچے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا۔

اور اپنے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)  
تَعْلَمُونَ سَعْيَكُمْ ۚ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا ہے اور اس کا عقد بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۚ اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹ کر نہیں جھگتے لیکن بغیر لپٹ کر مانگنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِئَلَّا تَعْلَمَ سَعْيَكُمْ ۚ (قرطبی)

آٹھویں آیت الَّذِينَ يَتَعَفَّوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْدِي وَالْأَعْيُنِ ۚ ان لوگوں کے اجر عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلایا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہو کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

روح المعانی میں بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شان نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شان نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْطُئُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس

السَّيْطَانِ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا

کھڑے ہوں جن نے لپٹ کر یہ حالت ان کی اس واسطے ہو کہ انھوں نے کہا کہ بیع اگر ہی تو ایسی ہے جیسے سود

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِدًا مِنْ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا سود اگر ہی کو اور حرام کیا سود کو، پھر مگر کون سی نصیحت اپنے رب کی



رَبِّهِ قَاتِلْهُ فَاَلَمْ تَكُنْ لَكَ آيَاتٌ ۚ وَمَنْ عَادَ

طرت سے اور وہ باز آگیا تو اس کو واسطے ہر چہ ہر چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہو اور جو کوئی

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَمْحَقُ اللَّهُ

پھر بزرگ سرد تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، شان ہے اللہ

الرَّيْبُ اَوِ يَرْبِي الصَّدَقَاتِ ۚ وَاللَّهُ لَا يُغَيِّبُ كُلَّ غَفَّارٍ اَشِيمٍ ۝

سود اور بڑھاتا ہر خیرات کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوْا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَّ

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے اور

لَهُمْ يَخْزَوْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوْا مَا

وہ غمگین ہوں گے ، اے ایمان والو! اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاَدْنُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ

يَخْرِبُ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ اِنْ تَبْتَغُوا فَلََكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

لہنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارا واسطے ہر اصل مال تمہارا

لَا تُظْلَمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ اِنْ كَانَ دُوْعُسِيْ ۙ فَتَنْظِرُ ۙ اِلٰى

نہم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو بہت دینی چاہئے کشاکش

مَيْسَرَةٍ ۙ اَوْ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمَ تَأْتِيْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللَّهِ ۙ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جہنم لوٹائے جائیں گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کایا اور

لَا يُظْلَمُونَ ۝

اُن پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) انہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر

جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے جھلی بنا دیا ہو پٹ کر (یعنی حیران مہوش)

پس سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے

لئے) کہا تھا کہ بیچ بھی تو مثل سود کے ہے ، کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے ،

اور بیع بقیہ حلال ہے ، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے (حالانکہ دونوں

میں کھلا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیچ کو حلال فرمایا ہے اور سود

کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے

(اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے) یعنی حلال کہنے

سے باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے

(لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا بار (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی) اور لیا ہوا

مال اس کی ملک ہے (اور باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے)

(یہ خدا کے حوالے رہا) ، اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کا عدم ہوگی ، تم کو

بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی) اسی قول اور اس فعل کی

طرت) پھر خود کرے تو روبرو اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں

جائیں گے (اور روبرو اس کے کہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ

رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے ، لیکن مال کا کار) اللہ تعالیٰ سود

کو مٹاتے ہیں رکھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہو

کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا

معلوم ہوتا ہے ، لیکن مال کا اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں ، (کبھی تو دنیا میں بھی

ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے ، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا ، جیسا اوپر

آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے

والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات مریکب ہو)۔



بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے قوت ہونے سے) مغلوب ہوں گے،

لئے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اسٹہمارسین جو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے نہ کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے (تو اس کو) ہمت دینے کا حکم ہے (سود کی تک) یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو (اور یہ بات) کہ بالکل معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) ۴

## معارف و مسائل

ان آیات میں ربہ یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربا پر شرع و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جو لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں شرع کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ شرع و سنت کی اصطلاح میں ربا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس بھمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔ دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربا ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عوام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا بکھریں صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل رہاؤں کی پیداوار ہے، ورنہ نیز اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصاد امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سبب بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر شرع سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چہ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوردوں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح اٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہو سکتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا



سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہو کہ شرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پھل یا بھجنون ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے پست کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و بھجنون تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بھواس اور ہڈیاں اور دوسری بھونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا بھجنون ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزائیں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو بخلی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا پسند اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی راہی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلات و دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے محض قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہو اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دوجرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربی کی مثل ہے، جس طرح ربی کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربی بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہو تو ربی بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرز بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اتہاز کیا، کہ تم ربی کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربی کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و الملکوت اللہ جل شانہ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کھج چیسز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم و خیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیسز ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہو اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اُسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہو، اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو



چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹانے میں اور صدقات کو بڑھانے میں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کر لے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا نیکو قصد کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجود مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا شرعاً ان کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کے شادی پتے ہیں، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کو نیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آتے ہیں۔ سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربواؤں کے بازاردوں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ عمل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سود کے بازاردوں میں ہی ہوتا ہے۔

اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آکر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر حاق و دین گھانا آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال منافع دہر باد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد نہ اس سے کسی کی بھوک بھٹ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اور نہ بچایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام لے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یکہنا بالکل صحت ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن درم وغیرہ سے بڑھ جائے، درم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہر وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان ہتیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے پہننے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، تو کر چا کر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ دنیا



اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو ٹیکڑیل اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے وہ سونے چاندی کے عوین حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ کسی ٹیکڑی میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہو وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی، ایک عیندگی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، کھانا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرش چھریہ زیب، دل خوش کن ہو، چار پائی اور گھوڑے اور بچے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا عیندگی کا آجانا ان سامانوں کے ہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کسی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضہ سے عیند نہیں آتی، اب امریکہ جیسے مال دار متمدن ملک کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دیدیتی ہیں، عیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر عیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لاسکتے، اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ ان کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت و لذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کروڑ پڑھ کر ڈر اور ڈر پڑھ کر ڈر کو رو کر ڈر ڈرناٹے میں ایسے مست نظر آئیں گے، کہ ان کو اپنے کھانے پینے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا کتنی کئی میل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، ان کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، ان کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے پاکم یا یہ لوگوں کی کم ہاگی سے فائدہ اٹھائیں، ان کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت ردِ قار ہو، اپنے ملک کے بھینوں اور ملک شام کے یہودیوں کی تانیخ پڑھ جائیے، ان کے حالات کو دیکھ لیجئے، ان کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جواہر سے بھری ہوں، لیکن دنیا کے کسی گوشے میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دنیا کی ساری جنگیں اسی بغض و نفرت

کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ ہے دنیا میں اشتراکیت اور اشتعالیت کے نظریے پیدا کئے، کمیونزم کی تحریکیں سرگرمیاں اس بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دنیا قتل و قتل اور جنگ و جدال کا جہنم بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عزت کا ہے، اور تجربہ شاید ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی خواست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں، لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور ان کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اول تو ان کی خوش حالی کا اجمال خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردم خور دوسرے انسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جھٹھ ایک محلہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقلمند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہے صرف اس محلہ کا دیکھنا نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا، جن کا خون چوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فریب ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور جمہوری حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ ان کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامانِ دالوں سے زیادہ اطمینان اور سکونِ قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَمْنَعُ اللَّهُ الْمَرْبُؤَاتِ رَبِّي الْمَقَاتِلَ

خلا یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہو، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:



ان الزیاد ان کثر قان عاقبتہ  
تصیر الی قلی

یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام  
نہجہ اس کا قلت ہے۔

یہ روایت مستند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاللّٰهُ لَا يَجِبُ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِمٍ** یعنی اللہ تعالیٰ پسند  
نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرمادیا ہے کہ  
جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں  
مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مومنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت  
کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلے آیت میں سود و غور و دل کے لئے عذاب جہنم اور ان  
کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، مسترآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی  
ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا  
ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْذِلَاتِ**  
**كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ كَافِرِينَ** کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربوہ کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا  
رہیں کسی کے ذمہ ہائی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا  
رواج پھیلا ہوا تھا، آیات مذکورہ سے پہلی آیتوں میں اس کی مانعت آئی تو حسب عادت تمام  
مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا بقول  
کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں  
سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف  
تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا،  
اور بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر  
مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے  
بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جملہ امک مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اسیدؓ تھے، انھوں نے  
اس جملہ کے کا قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافت حکم لکھ بھیجا،

اس پر مسترآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود  
کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف اس المال وصول  
کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح  
و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود  
جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار  
فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت  
کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب کے پہلے مسلمانوں کی بہت  
بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑنے میں ثواب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم  
چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاہلیۃ موضوع عنکم کلہ لکمہ من اموالکم  
لا تظلمون ولا تظلمون واول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلہ،  
راہن کشید بحوالہ ابن ابی حاتم: "یعنی زائد جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے  
سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رستم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی  
وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے گا، اور  
سب کے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں  
غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے ماندہ ہوتی تھیں" قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف  
اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے **اول اتقوا اللہ** کا حکم  
سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ مسترآن حکیم کا وہ خاص  
طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے متاثر ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا  
ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے  
پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں  
کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے  
ماندہ شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے **اتقوا اللہ**  
فرمایا، اس کے بعد حکم دیا **ذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْذِلَاتِ** یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں  
فرمایا **اِنَّ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ كَافِرِينَ**، یعنی اگر تم ایمان دلے ہو، اس میں اشارہ کرو یا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے



کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طہارح پر مبنی تھا، اس لئے حکم سے پہلے (اقبلوا الذلۃ) اور حکم کے بعد (ان کنتم مومنین) کے ارشاد ملا دینے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ میں لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فَلَکُمْ زُكُوفٌ أَمْوَالِکُمْ لَا تَغْلِبُوهَا وَلَا تَغْلِبُوهَا، یعنی اگر تم توبہ کرو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب توبہ شخص اسلام سے خاچ اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملکیت بھل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتنے بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا، وَإِنْ كُنْتُمْ فَلَکُمْ زُكُوفٌ أَمْوَالِکُمْ، یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مہربانی کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

۴۲

ہوتا ہے، وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرٍ فَمُنْظَرٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ، وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ، یعنی اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا شریض اور اگر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک ہسٹ دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت توبہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود و سود کا سلسلہ چلا تے ہیں، اور سو کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں حکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادا سے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک ہسٹ دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو تشرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر تشرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دود وجہ ہیں، اول تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تنہا مال میں کام بہت بھل جاتیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی نعمت ادا یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تنہا مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سا بقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آتی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی



حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو مسترض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس سترائی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہربانی کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طہرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مفروض کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور سند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رستم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد و قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دُگنی رقم صدقہ کر لے کا ثواب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:

وَأَعِزَّزُوا يَوْمَ مَا تُجْعَلُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تَقُولُ تِلْكَ نَفْسُ تِلْكَ كَسِبَتْ وَهْمُ لَا يُطْلَعُونَ ۚ یعنی ڈرو اس روز جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رہا کہ احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آتی ہے، رہا کہ حرمت و مانعت پر ستر آن کریمؐ میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آل عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح ستر آئی حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و رہا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آتی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر رہا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیسرے رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا  
الرِّبَا مَضَاعِفًا مِّثْقَلَةَ ذُرَّةٍ  
وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۷۵﴾

”یہی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے  
زانہ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے  
کہ تم کامیاب ہو۔“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوردی کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے اُدھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی معتد اور بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی معتد اور بڑھادی یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص باب النفل میں ہر روایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اضْعَافًا مِثْقَلَةَ ذُرَّةٍ (یعنی کتنی جتنے زانہ) فرما کر ان کے مرد و چہ طریقہ کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اعضا و اعضاء مضاعف نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً رہا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اعضا و مضاعف ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جاہل فرمایا گیا کہ لَا تَشْتَرُوا بِإِيمَانِكُمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۚ یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو، اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الہیہ کے بدلہ میں اگر ہفت قہلم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اضْعَافًا مِثْقَلَةَ ذُرَّةٍ کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مرد و چہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوردی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اعضا و مضاعف ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رستم سود سے حاصل ہو کر سود خورد کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زانہ رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اضْعَافًا مِثْقَلَةَ ذُرَّةٍ



ہو جائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف مضاعف بن کر رہے گا۔

اور سورہ نسا میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:

يُظْلِمُونَ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ مِمَّا دَخَلُوا فِيهَا  
عَلَيْهِمْ ظِلْمٌ أَظْلَمُ لِمَ هُمْ  
وَيُضِلُّونَهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ  
كَثِيرًا ۖ وَأَخْذُهُمْ السَّرْبُ ۖ  
وَقَدْ نُفَخُوا عَنْهُ وَأُظْلِمَهُمْ  
أَمْ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ  
أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا لَّا يُلْغَوْنَ عَنْهُ  
عَذَابًا أَبَدًا ۚ (۱۶۱-۱۶۰)

یعنی یہودی کے اپنی بڑے بڑے جرائم کے  
سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے  
لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب  
اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے  
مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود  
لے کر تھے، حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کی  
نعمت اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال  
ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے

ان لوگوں کیلئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان معسر کر رکھا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود  
نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی ان کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے  
حرص دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض حلال چیزیں بھی  
حرام فرمادیں۔

اور سورہ روم کے چوتھے رکوع کی آیت ایسی ہے:

وَمَا أَتَيْنَكُمْ مِنْ رَبٍّ بِآيَةٍ ۚ  
فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزِيدُ  
عِنْدَ اللَّهِ وَمَا أَتَيْنَكُمْ مِنْ  
ذِكْرٍ تُرِيدُونَ رَجُوعَهُ إِلَى  
ذُلِّكُمْ هُمْ أَتَمُّ عِقُونَ ۚ (۳۹، ۴۰)

یعنی جو چیز ہم نے تم کو وہ لوگوں  
کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ  
کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو ذکر وہ لوگ  
جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ  
خدا کے پاس پڑھاتے رہیں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ربا اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاچ  
پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر سرائی ہے کہ سود بیاچ کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی  
زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر درم ہو جائے  
تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش  
نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے  
میں، اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص ماوراء ناسہ کے اخراج کے لئے مہل سہتا ہے، یا نقد کھلو اگر خون بکھولا ہے، تو  
بظاہر ہسودہ کمزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں  
یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سود بیاچ کی مانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا  
یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال احتلاص و نیک بنتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے  
دے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی  
برادریوں میں نوتا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ  
دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں  
فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ  
صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیتے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر  
اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۚ (۱۱) یعنی آپ کسی پر احسان  
اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اور سورہ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اقول تو  
اس لئے کہ سورہ روم بھی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت کی ہر مگر  
غالب گمان بھی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت  
کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمت  
سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی  
دوسری تفسیر ہی کارحمان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

فَاتَّبِعْ أَهْلَ عِيسَىٰ خَلْقَهُ ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ ذَٰلِكُمُ الْفِتْنَةُ يَكْفُرُونَ ۚ  
وَبِخَالِكُمُ الْفِتْنَةُ يَكْفُرُونَ ۚ (۲۸، ۲۹) قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی یہ ان لوگوں کے لئے  
بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے  
کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد  
والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے  
دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا



اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدقہ کی آیتیں آئی ہیں جن میں سے سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں اضاعت مضاعت سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضاعت مضاعت اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سنا یا گیا ہے۔

## مسئلہ سود و ربا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور غائب نہیں ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت ملنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھنے کے وقت اس کی حرمت سے چمکپاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا مخیر یہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، غلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُبھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر جاری ہے؟  
دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟  
تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا ہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر نستر آئی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی اہم نہیں رہا اب سنئے کہ لفظ ربا و رباوی زبانِ کامعرب لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخالطہ کا جواب۔

بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لائنِ دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۃ نسا کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہِ قورات میں بھی معروف تھے اور قورات میں بھی اس کو حرام

نستر دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہِ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف تھا آتا ہے اور اس پر لائنِ دین کا دلچسپ حل رہا ہے، اور نستر آں اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہو کہ جب شہہ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرام سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دنیا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لائنِ دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک سلامی جسٹس شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمِ محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا وہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لائنِ دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تصمین میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، درنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو شک یاہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی اختلاف ہوا۔







فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل و مشرک دے کر حرام فرمایا، باقی اصل ربا جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرام نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظم کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہوئے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظم کو ربا کی جن خاص صورتوں میں ہشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری شیطاں اور دولت مندوں اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظم کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں دلتے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیات ربا کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا:

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْأَيَّاتِ مُتَّحِلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَعْنَاهَا  
الَّذِي يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى  
أَرْسَلَ رَسُولًا إِلَى قَوْمٍ هَرَجَ  
وَمِنْهُمْ بَلَّغَهُمْ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ  
كِتَابَهُ نَبِيًّا رَأَيْنَاهُ بَلَّغَهُ  
وَلَيْسَ بِهِمْ وَالزَّيْبَانِي اللَّعَنُ  
الزَّيْبَانِي وَالْمَرَادُ بِهِ فِي  
الْآيَةِ كُلِّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابَلُهَا عَوَضٌ

میں جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے  
شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ  
تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف  
بھیجا کہ وہ خود اس قوم میں سے تھے انہی کی  
زبان میں سمجھا، ان پر اپنی کتاب انسانی کے  
لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ  
ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں  
اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے  
مقابلہ میں مال نہیں بلکہ عیوادم ہے۔

اور امام رازی نے تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا ربا دوسرے  
نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی،  
اور اب جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی،  
کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کسی زیادتی ربا میں داخل ہے۔  
اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراء کے اور زمانہ جاہلیت کا ربا وہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ  
ہو کہ وہ مشرک جن میں بحساب مینا کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد  
میں لکھا ہے، اور مشرکین ادھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا مسترآن، سنت اور اجماع امت سے  
ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے  
یہ بتلایا ہے کہ مشرکین میں جو ربا مذکور ہے اس سے علی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو مشرکین  
ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اس کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و  
شراء میں کسی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی اعداد بیش  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آتی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ  
ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہار کے اختلافات  
ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ ج ۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تجلۃ اللہ الباقیہ میں منسرایا ہے کہ ربا ایک حقیقی  
ہے اور ایک وہ جو مجسم ربا ہے، حقیقی ربا مشرکین ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور مجسم ربا  
وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو ربا کہا گیا  
ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے (لا با الا فی النسیۃ دروالبخاری) یعنی ربا صرف  
ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے  
وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا حقیقی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب  
کلمہ ربا میں داخل ہیں۔

### اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزول مشرکین سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، فرض ادھار پر مجسم  
عیاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ مشرکین میں حرمت ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرام نے اس ربا کو ترک  
کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ ہشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا  
کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں براہری شرط ہے، کی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں ادھار



کرنا بھی رہا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہیوں، جو، کھجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مردہ اقسام بیع مزابنہ، حی قاتلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو حرام رہا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفرقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہوا اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہارِ انفس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد منسربا پاکر جہاں رہا کا شبہ بھی ہوا اس سے بچنا چاہئے۔

پچھلے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ربا القرآن یا ربا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں مشابہت تھا یعنی قرض ادھار پر بحساب مبادلہ نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلافت و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملات رہا میں ہوا، پہلی قسم کا ربا جو ربا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت متحدہ میں کسی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو ربا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی رہا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رد اجماع عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ مسترآن و سنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی بحث مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اسکی پر کہ ربا کی حرمت و ممانعت کس بحث و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخادقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بھتو، بھیڑیا، شیر اور سنسکھیا جیسے ذہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے جہت ناپ لازم ہے۔

ربا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابل نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیر پا یا دائمی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالتے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانییت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج یا جاتی ہو تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔



رسم درواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم درواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم درواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سودوربا اس زمانہ میں ایک دہائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ گڑبڑ کو میٹھا سمجھنے لگی، اور چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب بنی، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی معسر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر اکثر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں دبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی ضرورت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو گئے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سننے لگا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا ماننے والا اس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟ سودوربا اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم درواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سودوربا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریبے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہتے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پائے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہئے ہیں، اور یہ دکھانا چاہئے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محل میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تانے اور تند رست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محل میں نہیں دوسٹر بخٹوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مرد بے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پیٹولے پھلتے چلے جائیں۔

## سودوربا کی معاشی خرابیاں

سودوربا میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہمارے ہاں سودی اور فاسر سودی طریقہ میں تو ایسا سمجھنا اپن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر مومن عقل دل سے سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاک کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنایا ہے کہ سطحی نظروں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجاے شخصی دکاوڑوں کے مشترک کہنیاں بنائی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک چھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بنا پر نہیں کر سکتے ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی بھی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ



ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ اہل ہندوستان ہے جو شراب کی گندی پھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت منس روشنی کے ادوں کو سنیادوں اور شہبہ نگاہوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھانے کے لئے عمل میں لاتی گئی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلات پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان منسراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ دان کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے اور تھوڑے سرمایہ دان کے لئے کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں، ایک ہزار کی مالیت دانے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھتا ہے وہ لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور قرض کر لیتے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے مزدوری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اور مارکیٹ میں بڑے سرمایہ دانوں کو عام ملنا جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو میسر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ دانوں کو مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آتی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ دانوں کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈالون کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور دراصل اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آ جاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہشیا کے نرخ پران بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلو لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کچھ کران خود غرض لوگوں کی پردریش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بننے، چھوٹے سرمایہ دانوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاٹ ملوہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور ہشیا کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیار نہ طریق کار پر پوری قوم کو ایک ہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیست خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا کچھ بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھتے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا کاروبار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو خود کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوٹے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوٹے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔



۳۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاسے میں آجائے تو پھر وہ بچنے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دوسری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور دوسرے سے بینک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہو گا مگر قرض تو نہ ہو گا۔

۱۹۵۵ء میں پاکستان میں روٹی کے تیر بار پرشرا آئی ارشاد کے مطابق حاکم کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی غوشت تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کا رو باڑی میں شتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

### خوش پروری اور ملت کشی کی ایک اور مثال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیارسی اور چالاک ریختے کہ سود خوروں نے جب اپنے تجربے سے بھی اس چیمبر کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے **يَمْحُجُّ اللَّهُ ذُنُوبَ بَعْضِ الْبَشَرِ** یعنی سود کے مال میں ایمان کی آفتیں آنا لازمی ہیں، جس کے نتیجے میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سسٹم کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسانی آفت کہ ہمارا ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے کہ سامان کا خرچ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سودی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن اگلی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی غریب ہو کر ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی سترسودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں بھرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، تنو میں ایک رو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہو گا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سسٹم کا بازار گرم کیا، اس سسٹم کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہو گا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے نفروفاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بگڑتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی مشرح بڑھادی یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ ان کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجے میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فزنی اور جمل بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفتروں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی معتر ملک کے معاش اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوتی، جس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانایا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہو گئی کہ ۵

درہ بہت و دشمن اندر حسانہ بود



دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے ملنے کا پہلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص انسداد کی بے جانف اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق انکو بند نہ کیا جائے اور اس کاروبار نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

**ایک شبہ اور اس کا جواب** | اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ فائدہ عوام کو بھی ملے، لیکن اگر بینکوں کی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو پہلے زمانہ میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دینیوں اور خزیروں کی شکل میں زمین کے اندر رہ کر تباہ ہوتا تھا جس سے نہ ان کو فائدہ ہو گا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ کیس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجھد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ کیس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہو گا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

**فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت** | اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مغیر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی تجارت کی ترقی کا ضامن ہے، درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے

سرمایہ سے تجارت کرے گا تو چھوٹے سرمایہ داروں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غریب و فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

**سودی روحانی بیماریاں** | یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایشیاء و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آنا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بڑے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی ارباب کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب ہم سری تجارت میں چل سکتے؟ بحث یہ باقی ہو کر باقی معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہو گئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رہاں تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہو؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر رہاں کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں البتہ صبر و استقامت اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ (۷۸:۲۲) | یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سہی نہیں ڈالی ہے



اقتصادی نقصان بھی نہ ہوا اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور با سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ بطلی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں رہا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آ سکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہو کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول اور سر فو تجو یز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر با کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیروما جہند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورت زکوٰۃ و صدقات راجحہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بیکری اور بے پردائی کا نتیجہ جو جس آجکل نظام زکوٰۃ بھی مدخل کر دیا ہو، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکیم الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکا نہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ ہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

۱۵۰ احقر نے چند علماء کے مشورے سے سود و بیکاری کا مسودہ وضع ہوا کیا کر بھی دیا تھا اور بیکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل قیلم بھی کر دیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام نا جروں کی توجہ اس طرح ہوئی کہ سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظور یا حائل نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فانی مدظلہ العالی

اسلامی حکومت عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی ہیئت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہر کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس ہیئت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی و کانیں سر اگر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظام زکوٰۃ ایسی چیز ہو کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و با کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاش و اقتصادی خود کشی کے مراد ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا ہتھ نہ کرے افراد و عادی کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے مخوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں علی گناہ میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی ہوگا سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعتراف جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جائے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشاد است رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آتی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو پیدا ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ ضرورت تو نہ رہے کہ



اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح دیندار مسلمان جو رات کو ہتھکڑیاں ڈال کر اللہ میں گزاریں صبح جب دکان یا کارخانہ میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

## سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ دعا و عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں، کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے چاد کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر ہتھ باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی ہنردیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہوا ہے جب یہ ہنر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر تھپکتا رہتا ہے جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ بھٹکے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ والا آدمی بھی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی ہنر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے منہ کی سزا پا رہا ہے (یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے)

③ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا دلیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آتی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد کا تب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ پہنچے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پیئے کا عادی اور سود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ پچیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہو اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی ملّا کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ محل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور نہ فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضرور ایات کی گرائی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا وعقب غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر عدد برقی کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آ رہے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت بن مالکؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مال غنیمت کی چوری ہے، اور دوسرے سود کھانا اور طہرائی

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

رباہ کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دیوبی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیث نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچئے سمجھئے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَسْتُمْ بِدِينٍ إِلَى آخِلٍ مِمَّنْ فَاتَّبِعُوهُ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو اور کسی وقت مقرر تک تو اس کو کلمہ پیا کرو

وَلْيَكُتَبْ بَيْنَكُمُ الْكِتَابُ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ کلمہ دے ہمارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ کلمہ دیوے جیسا

عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكُتَبْ وَلِيُمْلِكِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلِيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ

لکھا یا اسکا اللہ نے سوا سوا چاہئے کہ کلمہ دے اور بتلا جائے کہ جس پر حق ہے اور دوسرے اللہ سے جو اس کا رب ہے

وَلَا يَخْشَى مِنْهُ شَيْئًا إِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ

اور نہ کرے اس میں سے کچھ بھرا گروہ شخص کہ جس پر حق ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا

لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فليُمْلِكِ وَلِيَهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ

آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف اور گواہ کرد دو شاہد اپنے

مِنْ بَرِّ جَالِكُمُ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ

مردوں میں سے بھرا گروہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند

مِنَ الشُّهَدَاءِ أَوْ أَنْ تَفْضَلَ أَحَدُهُمَا فَتَدْرِكُ أَحَدُهُمَا الْأُخْرَى وَلَا

کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلاوے اس کو دوسری اور انکار

يَأْبَ الشُّهَدَاءُ أَوْ إِذَا مَادُّعُوهُ وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكُتُبُوا صَغِيرًا أَوْ

نہ کرے گواہ جس وقت بتلاوے جادیں اور کالی نہ کر داس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا

كَبِيرًا إِلَى آخِلِهِ ذَلِكَمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِشَهَادَةِ أُولَى

بڑا اس کی بیعت تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہر گواہی کو

الْأَقْرَبُونَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُهَا بَيْنَكُمْ

اور نزدیک ہر گواہی نہ چڑھ کر سودا ہو انھوں ہاتھ لینے دیتے ہو اس کو آپس میں تو ہم پر

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكُتُبُوهَا وَأَشْهَدُوا وَإِذَا اتَّابَعْتُمْ

کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ شَوْقٌ بَيْنَكُمْ

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کر دو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَ اللَّهُ كُلَّ شَيْءٍ عَلَيْهِ ﴿٣٩﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ

اور ڈرتے ہو اللہ سے اور اللہ تم کو سمجھتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم

عَلَى سَهْوٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ آمَنْتُمْ بِبَعْضِ

سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گروہ ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي فِي أَيْمَانِهِ أَمَانَتَهُ وَلْيَسْتَقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا

کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور نہ ڈالے اللہ سے جو رب اسکا اور مست بھرا

الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٤٠﴾

گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بے شک گنہگار ہے دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو اور ہار کا رخاواہ دام اوہار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے دو ادھار ہو جیسے بیع سلم میں ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس کی یادداشت و دستاویز کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو کوئی لکھنے والا ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو دکھانا سکھایا ہے اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلا دے اور) لکھو دے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو کہ وہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور ٹھہرا اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل یعنی معترہ یا مجنون ہو یا ضعیف البدن یعنی نابالغ یا پیر فرقت ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود ریمان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو مثلاً گڑھ لکھا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے مالک کا رہنے والا ہو اور زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن



ٹھیک ٹھیک طور پر کھولنے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کہ دو اور شرعاً اصل دار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو اور خالی دستاویز بدون گواہوں کے ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز بکھانا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے وہ ہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور منکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسٹر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ وہ سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے) اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دین) کے (بار بار) نکھنے سے آگے مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ نکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا دار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے نکھ ہی لے لینا اچھلے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ بچنے میں تم پر کوئی الزام (اور معذرت) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو بیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور جس طرح ہم نے اوپر کا تب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے کسی کتابت کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالاجائے) اور اگر تم ایسا کر دو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ) مصلح اور عامی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزاء دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کتابت نہ پاؤ (و ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) دین رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو مدیون کی طرف سے صاحب حق کے قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ رہے، تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (دیہہ پورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء امت کر دے اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے) :

معارف ومسائل

قرض اور اوجار کے لئے اقرارنامہ | آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آجکل کے قانون  
لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام | میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے  
اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ کھٹے کھالے کا ہے، اور سحریریں انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھتے تو اس وقت دنیا کا سب کا رو بار صرف زبانی ہوتا تھا، کھٹے کھالے اور دستاویز ہیا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور منسرا یا،

إِذَا نَزَلَ بِكَ الْوَيْلُ إِلَى آجِلٍ مِّنْهُ فَأُفٍّ لَّكَ وَلِلْكَافِرِينَ، یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو کلمہ لیا کرو:

اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ ہر عمل چوک پا، انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان نشر فرمایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، طبعاً معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی معشرہ جو ناجائز ہے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، جیسے اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاط سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی دیہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَأَسَلْتُكُمْ كِتَابِي بِالْعَدْلِ، یعنی یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی گھٹے



والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور غلبان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ کچھ لکھ سکے ہے اس کا شکر ادا یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:

وَلْيُشَاطِلِ الْإِنْمَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّنْهُ، یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے، مثلاً سزا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوانے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: وَلَا يَتَّبِعْ أَحَدُهُمْ مِّنْهُ مَشِيتًا، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا ہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق ماند ہو وہ خیف لعل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گولٹا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا دلی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو دلی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معاملات دلی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور اگر کچھ یاد دوسری زبان بولنے والے کا دلی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ دلی دونوں معنی پر حاوی ہے۔

مضابطہ شہادت کے یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان چنانچہ اہم اصول تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صورت تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر رہیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اس کے بعد مضابطہ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلہ مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۱۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ میں ترجمان میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۱۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، اَشْعَنَ قُرْطُوتٍ مِّنَ الشَّحَقِ آج میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بعد ضروری اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ انکار کرنا گناہ ہے بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت

ہی احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکٹائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلمبند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہوا دھار نہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے بیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں صلہ و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شہادت دینے سے

انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا وَلَا يَتَّبِعْ أَحَدُهُمْ مِّنْهُ مَشِيتًا، یعنی کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے ان کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں پھر فرمایا وَإِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ فَاْتُوا بَشَاطَةً، یعنی اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہائے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ



دل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے آج کی دنیا نے اس مسترانی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصل اور سچے گواہ ملنا تقریباً مغفور ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بلا بھیجے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں ٹھیس سے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، ورنہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جاتا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک مذاب سبھے اور مقدمہ اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، مسترآن حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصول صحیح کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے میں اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور مسترآن کریم کی عام عادت یہ کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوب خدا اور خوب روز جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیل حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوب خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جیسز نہیں ہوتی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلافت ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعناد کے لئے کوئی جیسز گردی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ مقبوضۃ سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شے مرہون سے قبیح اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مگر جس کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گہنگار ہے، دل کو اس لئے گہنگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اقل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

**يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَفِي الْاَرْضِ وَانْ تَبَدَّلْ مٰلِيْكُمْ**

اللہ ہی کا ہے جو کہہ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات

**اَوْ تَخْشَوْهُ يَحَاسِبْكُمْ بِاللّٰهِ ۚ فَيُخْفِضُ لِمَنْ يُّشَاءُ وَيُعِزُّ لِمَنْ يُّشَاءُ ۚ**

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر چھپے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو

**يُّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴**

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کہہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مالک و اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ، جو باتیں عقائد فاسدہ یا اخلاقی مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم و ارادہ کی، تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان و جوارح سے ظاہر کرو گے مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا یا اپنے حکمران حسد وغیرہ کا خرد اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کفر ہی ڈالا، یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دوسرے معاصی کے آن کا) حساب لیں گے پھر حساب لینے کے بعد پھر کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو سزا دینا، منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

## معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اہلکار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکرار ہے انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جاننے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ، شعبیؓ اور مجاہدؓ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)

اور علوم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں بھی ہے اور معنی آیت



کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے بچتہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی توبہ نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے رب سے رعب و عجب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مومن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو جمع نام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پرشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پرشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صریح وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں ان چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ حَيٌّ ذَرَّ عَنْ أَهْلِي عَمَّا

حَقَّ شَيْءٌ أَنْفُسُهُمَا مَا لَمْ يَكُنْ مَوْتًا

أَوْ يَحْتَمِلُوا بِهِ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں، اور تمام قرطبی نے دیا کہ یہ حدیث احکام دنیا کے متعلق ہے، طلاق، حلق، تیغ، ہتھکڑیاں، وغیرہ جو دل میں ارادہ کر لیں سے منع نہیں ہو جاتے، جب تک ان کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے احکام آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تناقض نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیار خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ ان کے خلاف ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد و اختیار سے اپنے دل میں جانتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اقبال سے کچھ موافق پیش آجائے کی بناء پر ان پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گذر چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دو قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیار خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپؐ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَشَعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیار خیالات و وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباس نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب ہی سے ہے، اخلاق و صفات، معتبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حسد و نینا، حرم وغیرہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قلبی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہر کا حساب قیامت میں لیا جائے اسی طرح اعمال باطن کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ ستر آن کریم کی ایسی بڑی اور ہم سورہ



ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فروعی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قضا، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، زنا اور قرض لین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام سننام القرآن بھی آیا ہے، یعنی مسترآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توجیل جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ عظیم و خیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب حنیف میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن کیم انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوب خدا اور فکر آخرت کا ایسا محافظان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ راست کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمَّا الرُّسُولُ فَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَمْ يَكُنْ أَمَّا

ان لیا رسول نے جو کچھ آتا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ لَا تُفَرِّقُونَ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اسکے رسولوں کو کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے

رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّكَ رَبَّنَا وَكَانَتْ الصِّدْقُ

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری باتیں چاہیں اے ہمارے رب تیری باتوں کو تو ہم جھگڑا

لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعًا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی تمنا ہے، اسی کو تمنا ہی جو اس نے کیا اور اسی پر پڑا جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ لَيْسَ بِنَا أَوْ آخِطَانَا رَبَّنَا وَلَا تُحِشْ عَلَيْنَا

اے ہمارے رب نہ بیکرد ہم کو اگر ہم بھولیں یا بچرکیں، اے رب ہمارے اور نہ دکھ ہم پر بوجھ

إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحِشْ عَلَيْنَا مَا لَاحِقَ

بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ آٹھواہم سے وہ بوجھ کہ جس

لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفُ لَنَا وَامْسُ خَمَاتِنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی بھگوانت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش بھگو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہر مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸۶﴾

کافروں پر

## حُلاصۃ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کے حق ہونے کا جو ان کے پاس لکھ رہا کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا، سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے حق (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ کہ وہ موجود ہیں اور انہوں نے پاک میں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں، اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کا اصل میں سب کچھ ہیں) اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور کچھ ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں اگر ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں یا کسی کو نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم آپ سے بھگوش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) فتنہ ہے، (یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اس سے مراد امور غیر اختیار کی نہیں بلکہ صرف امور اختیار یہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو احکام شرعیہ میں تکلیف نہیں بناتا، یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہو گا جو ارادہ کرے اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا تکلیف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وسوسہ طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا، اے ہمارے رب ہم پر وار نہ کر نہ فرما یہ اگر ہم بھول جاویں یا بچو، جاویں، اے ہمارے رب ہمارے یہ بھی درختا







ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا افعال اختیار کے ساتھ مخصوص ہیں افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ہے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں بہایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بڑے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور جزاء و جزا صرف اختیاری افعال پر ہی، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری دساروں و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی معنوں کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهِمَا مَا أَكْسَبْتُمْ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بلا واسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہو کر جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیک کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے دے دئے کو بھی ملتا ہوگا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچا جس نے اول یہ طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہو کر کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب ہو کر یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچا، بلکہ درجہ کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے لئے عمل اور اختیار کو بوجہ ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجا دیا ہو اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہو اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب بھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سلطان شریک ہیں لیکن درجہ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالنبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اس ایمان بھل کی تفصیل بتلاتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس اُمت کے مؤمنین پھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرق ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس اُمت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، بِمَعْنَا قَوْلِ الْحَقِّ عَنْ أَقْلِكَ رَبَّنَا قَوْلَ كَيْفَ الْمُتَصَلِّينَ۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا کہ دل میں چبے ہوئے خیالات پر حساب ہو تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يَحْكُمُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا شَرْعًا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے نامکام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات و دوسرے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہر آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا ریشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم



عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطا کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا فِي شَيْءٍ نَّسِيْنَا وَلَا جُنُودًا نَّكَثْنَا أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاكِبُونَ عَلَٰى ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتُنَا لِتُؤْخِذَنَا مَالًا كَآفَةً لِّنَآئِبِهِمْ، یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرمائے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کھڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کھٹنیا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر قہر قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمائے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔

سورہ بقرہ تمام ہوئی و اللہ الحمد للہ و آخرہ و ظاہرہ و باطنہ و ہوا المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ  
۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ

## دیباچہ طبع اول

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ "معارف القرآن" کی جلد اول جس میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر پر عمل شائع ہو چکی ہے، اور بعد اللہ قرق سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے جاتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جا رہی ہے، جس میں سورہ آل عمران اور سورہ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیت یہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزیں زوائد کا التزام کیا گیا جو اللہ اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہو گا۔

ایک نوید کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ "خلاصہ تفسیر" میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر "بیان الفسراق" میں جو شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خلاصہ تفسیر میں حضرت نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمہ فشرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصہ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامتؒ کا بھی آگیا، اور مزوری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین "معارف القرآن" کے لئے دو مستند ترجمے مستقبل سامنے آجائیں گے ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا، دوسرا خلاصہ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامتؒ کی سورہ کا باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلیل

بندہ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۲

شعبان ۱۳۸۵ھ

لہ دوسرے ایڈیشن میں جلد اول کو بھی ان امور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب معارف القرآن کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (صحیح)